BOOK HOME

پاکستان کی سیرگاہیں

شیخ نوید اسلم

پاکستان کی سیرگاہیں
شیخ نوید اسلم

پنجاب یونیورسٹی لاہور سے اُردو ادب میں ایم۔اے کیا۔ 1982ء سے مختلف اخبارات و رسائل کے لیے لکھنا شروع کیا۔ نیشنل پریس ٹرسٹ (NPT)، وزارت اطلاعات ونشریات حکومتِ پاکستان اور محکمہ تعلقاتِ عامہ حکومتِ پنجاب کے لیے سماجی فلاحی اور قومی نوعیت کے بیشمار مضامین اور رپورٹس ترتیب دیئے۔ 1985 سے ریڈیو پاکستان لاہور کے مختلف پروگراموں ''پھول میرا وطن'' اور بچوں کے سلسلے ''روشن دنیا'' اور دیگر نشریاتی رابطوں کے لیے پاکستان کے سیاحتی مقامات، وادیوں اور آثار قدیمہ کے حوالے سے ڈھیروں مضامین، اسکرپٹس اور فیچرز مرتب کیے۔

2008ء میں ''پاکستان کے آثار قدیمہ'' بک ہوم پبلشرز سے شائع ہوکر پذیرائی حاصل کر چکی ہے۔ سیاحت کے حوالے سے قومی سطح پر منعقدہ کانفرنسز، کنونشن، سمپوزیم اور سمینارز میں شرکت کر چکے ہیں۔ پاکستانیت (آثار قدیمہ، ثقافت، سیاحت) پر قومی اخبارات میں مضامین تحریر کرتے رہتے ہیں۔

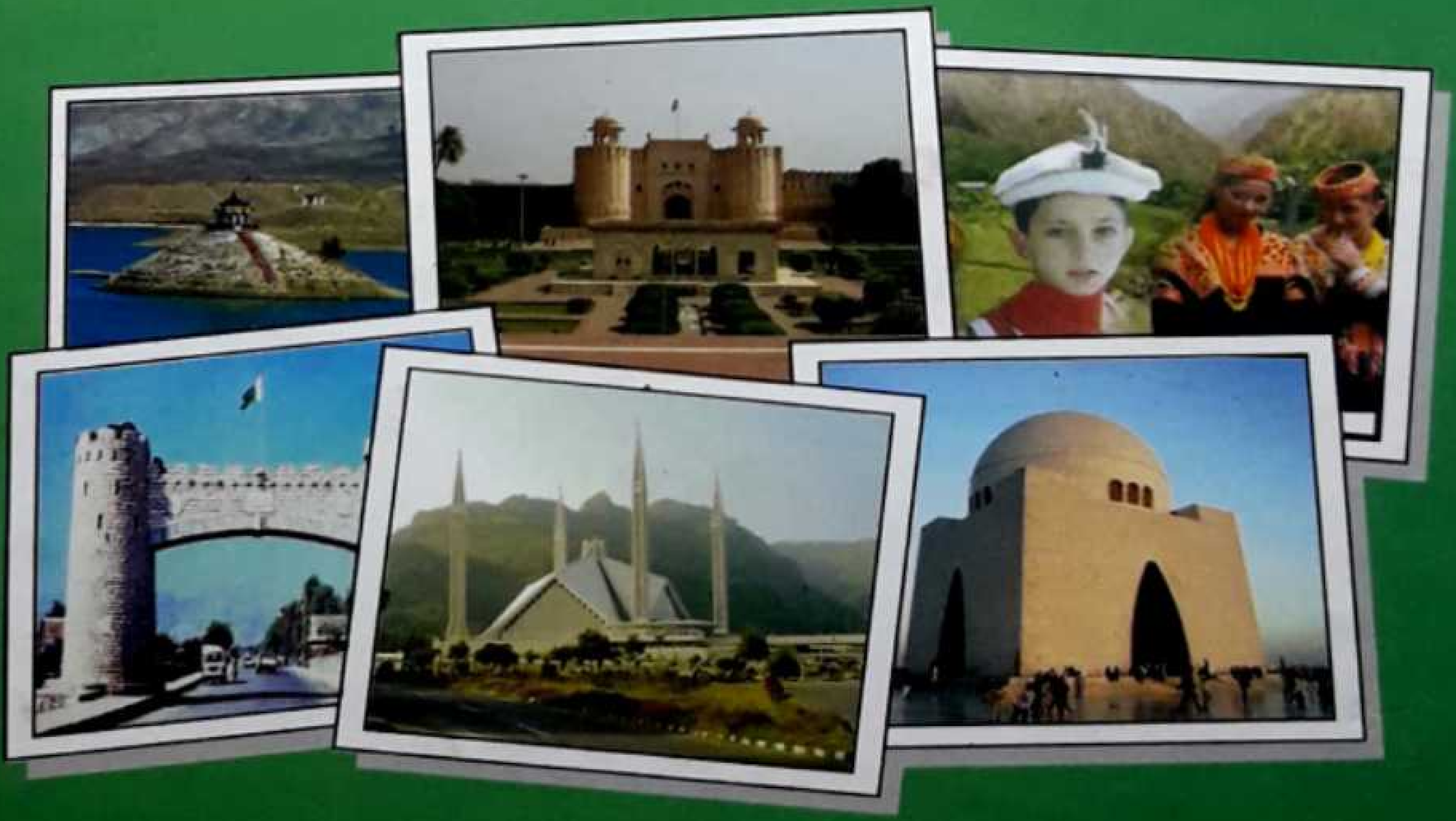

بُک ہوم

B000004

بک سٹریٹ 46 ۔مزنگ روڈ لاہور پاکستان فون: 37245072 - 042-37231518 فیکس: 042-37310854

E-mail: bookhome1@hotmail.com - bookhome_1@yahoo.com

www. bookhomepublishers.com

Design by: MUHAMMAD AHSUN Gull

پاکستان کی سیر گاہیں

شیخ نوید اسلم

BOOK HOME

پاکستان کی سیر گاہیں

مؤلف: شیخ نوید اسلم

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

اہتمام	رانا عبدالرحمٰن
پروڈکشن	ایم سرور
کمپوزنگ	محمد انور
پرنٹرز	حاجی حنیف پرنٹرز، لاہور
اشاعت	2016ء
قیمت	1000 روپے
ناشر	بک ہوم لاہور

بک ہوم

بک سٹریٹ 46- مزنگ روڈ لاہور، پاکستان
فون:042-37231518-37245072 فیکس:042-37310854
bookhome1@hotmail.com - bookhome_1@yahoo.com
www.bookhomepublishers.com

انتساب

میں اپنی یہ کتاب اپنی اہلیہ ثمینہ نوید کے نام
اور اپنی قوم کے ہر اُس محبت وطن پاکستانی کے نام کرنا چاہوں گا جو
اِس ارض وطن کے چپے چپے اور گوشے گوشے سے پیار کرتا اور
سیاحت سے والہانہ اور بھرپور جذبہ وامنگ رکھتا ہو۔

خدا کرے کہ مری ارض پاک پر اُترے
وہ فصلِ گُل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو
یہاں جو پھول کھلے، وہ کھلا رہے صدیوں
یہاں خزاں کو گزرنے کی بھی مجال نہ ہو
یہاں جو سبزہ اُگے وہ ہمیشہ سبز رہے
اور ایسا سبز کہ جس کی کوئی مثال نہ ہو
خدا کرے کہ مرے اک بھی ہم وطن کے لیے
حیات جُرم نہ ہو زندگی وبال نہ ہو
(احمد ندیم قاسمی)

فہرست

پیش لفظ — علی حسن حبیب 13
مجھے کچھ کہنا ہے — شیخ نوید اسلم 14

پیغامات

1- بانی پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ 25
2- میاں مظفر علی 26
3- شیر عالم محسود 28
4- ڈاکٹر شگفتہ شاہ جہاں 29
5- ندیم اسلم چودھری 31
6- ملک محبوب الرحمٰن 32
7- IRSHAD B. ANJUM 34

صوبہ پنجاب

1- بادشاہی مسجد، لاہور 36
2- شاہی قلعہ، لاہور 39
3- شالامار باغ، لاہور 41
4- مقبرہ جہانگیر، لاہور 44
5- چڑیا گھر، لاہور 46
6- باغ جناح، لاہور 51

7- الحمرا آرٹس کونسل، لاہور 57
8- عجائب گھر، لاہور 63
9- افسانوی شہرت کی حامل مال روڈ، لاہور 66
10- مینار پاکستان، لاہور 85
11- اسلامک سمٹ مینار، لاہور 89
12- چلڈرن کمپلیکس، لاہور 93
13- ایوان اقبال، لاہور 97
14- لاہور پلانٹریم 100
15- سائنس میوزیم، لاہور 103
16- قذافی سٹیڈیم، لاہور 106
17- لاہور فلائنگ کلب 109
18- سیکرڈ ہارٹ کیتھڈرل (چرچ)، لاہور 111
19- ریس کورس پارک، لاہور 115
20- گلشن اقبال پارک، لاہور 117
21- منٹو پارک/اقبال پارک، لاہور 118
22- رائل پارک، لاہور 121
23- ناصر باغ، لاہور 122
24- سوز وواٹر پارک، لاہور 123
25- جلو تفریحی پارک، لاہور 125
26- علامہ اقبال انٹرنیشنل ائیر پورٹ، لاہور 128
27- واہگہ بارڈر، لاہور 131
28- چھانگا مانگا 133
29- فاریسٹ پارک، گٹ والا (فیصل آباد) 139

30- گھنٹہ گھر، فیصل آباد 140
31- اسلام آباد: خطۂ پوٹھوہار 141
32- شاہ فیصل مسجد، اسلام آباد 149
33- راول جھیل، اسلام آباد 152
34- فاطمہ جناح پارک، اسلام آباد 154
35- سملی ڈیم، اسلام آباد 156
36- مرگلہ ہلز نیشنل پارک، اسلام آباد 159
37- ایوب نیشنل پارک، راولپنڈی 160
38- چھتر پارک، راولپنڈی 162
39- تربیلا ڈیم 163
40- کلر کہار 167
41- کان نمک کھیوڑہ 171
42- اچھالی جھیل 176
43- چن جی نیشنل پارک 178
44- تونسہ بیراج 179
45- نمل جھیل، میانوالی 181
46- فورٹ منرو، ڈیرہ غازی خان 183
47- لال سوہانرا نیشنل پارک، بہاولپور 186
48- لال سوہانرا جھیل، بہاولپور 188
49- بہاولپور کا چڑیا گھر 190
50- چولستان، بہاولپور 192
51- ڈرنگ سٹیڈیم، بہاولپور 195
52- سنٹرل لائبریری، بہاولپور 198

صوبہ سندھ

1- کراچی 202
2- کراچی بندرگاہ 216
3- مزارقائد، کراچی 222
4- باغ قائد، کراچی 224
5- کراچی کی آرٹ گیلریاں 227
6- وزیر مینشن، کراچی 231
7- موہٹہ پیلس، کراچی 235
8- باغ بن قاسم، کراچی 240
9- امیر خسرو پارک، کراچی 242
10- گلشن جناح پارک، کراچی 244
11- ٹرانس لیاری پارک، کراچی 246
12- سفاری پارک، کراچی 248
13- ہل ویو پارک، کراچی 251
14- ساحل سمندر کی تفریح گاہیں 253
15- ہالیجی جھیل 259
16- منچھر جھیل 264
17- کینجھر جھیل 266
18- ڈرگ جھیل، لاڑکانہ 268
19- دریائے سندھ 270
20- انڈس ڈیلٹا 275
21- تیمر کے جنگلات 277
22- صحرائے تھر، تھرپارکر 280

صوبہ سرحد

1- پشاور 286
2- پاکستان کے شمالی علاقہ جات 289
3- چترال گول نیشنل پارک 295
4- خنجراب نیشنل پارک، گلگت 296
5- خیبر سفاری ریلوے 297

صوبہ بلوچستان

1- کوئٹہ 300
2- زیارت ریذیڈنسی 301
3- صنوبر کے جنگلات، زیارت 304
4- گوادر کا تفریحی پس منظر 307
5- بلوچستان کے ساحلی علاقے 312
6- کھیرتھر نیشنل پارک، ضلع خضدار 315
7- چلتن ہزار گنجی نیشنل پارک، کوئٹہ 322
8- ہنہ جھیل، کوئٹہ 326
9- میرانی ڈیم 329
10- دروں نیشنل پارک، لسبیلہ قلات ڈویژن 332

کچھ اِدھر اُدھر سے

1- ورلڈ پرفارمنگ آرٹس فیسٹول 336
2- جشن بہاراں 338
3- پارکس اینڈ ہارٹی کلچر اتھارٹی 343
4- میلہ اسپاں و مویشیاں (نیشنل ہارس اینڈ کیٹل شو) 345

5- فوڈ سٹریٹ، لاہور 349
6- انارکلی بازار، لاہور 353
7- پاکستان کے دریا 358
8- ہماری نہریں 361
9- پاکستان کے اہم آبی مقامات 365
10- پاکستان کی مشہور بندرگاہیں 369
11- بی میلہ 374

پیش لفظ

پاکستان میں سیاحت کے موضوع پر بہت کم تصانیف ہیں۔ ان میں سے بھی زیادہ تعداد انگریزی زبان میں لکھی گئی کتابوں کی ہے اس کے علاوہ اخبارات و جرائد میں کچھ مواد وقتاً فوقتاً چھپتا رہتا ہے۔ یہ کتاب اس لحاظ سے منفرد ہے کہ مصنف نے ہر سیاحتی مقام کو اس کے تاریخی پس منظر میں بڑی تفصیل اور مؤثر انداز سے بیان کیا ہے مصنف کی یہ کاوش قابل تحسین ہے اور میرے خیال میں اس کتاب کے شائع ہونے سے پاکستان میں سیاحت کی صنعت پر خاصے مثبت اثرات مرتب ہوں گے۔ اس کتاب سے نہ صرف سیاحت کے شوقین افراد کے علم میں اضافہ ہوگا بلکہ دوسرے لوگوں کے لیے بھی سیاحت دلچسپی کا باعث بنے گی۔

اس کتاب کی ایک اور انفرادیت یہ ہے کہ اس میں ان مقامات کا بھی خاصی تفصیل سے ذکر ہے جو اس سے پہلے کہیں نہیں ملے گا۔ مثال کے طور پر سیاحتی کتابچوں میں جھیل سیف الملوک یا کاغان ناران کے بارے میں تو معلومات مل جائیں گی لیکن شاید یہ پڑھنے کو نہ ملے کہ لاہور کی مال روڈ کو کسی زمانے میں ٹھنڈی سڑک کہا جاتا تھا اور اس کی وجہ وہ درخت تھے جو مال روڈ اور اس کے اردگرد کے ماحول کو پُر فضا بناتے تھے۔ ٹریفک کے گرد و غبار اور دھوئیں نے مال روڈ کے ماحول کو بُرے طریقے سے متاثر کیا ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں ہرن مینار سے لے کر کوئٹہ کے ہزار گنجی چلتن پارک، سندھ کے موہاٹا پیلس، منچھر، ہالیجی جھیل اور ایسے بہت سے پُر فضا اور پُر اسرار مقامات کا تذکرہ کیا ہے جو اب تک عام لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہے ہیں اور بلاشبہ یہ کتاب پاکستان میں سیاحت کے حوالے سے ترتیب دی جانے والی نادر کتابوں میں سے ایک ہوگی۔

علی حسن حبیب
ڈائریکٹر جنرل ڈبلیو ڈبلیو ایف پاکستان

مجھے کچھ کہنا ہے

مہذب معاشرے میں تفریح کو انسانی زندگی کا لازمی جزو سمجھا جاتا ہے دنیا بھر میں تفریح منانے کے لیے نت نئے طریقے اور قدرتی وسائل کا استعمال بروئے کار لایا جاتا ہے جب کبھی انسان زندگی کی یکسانیت سے اکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے تو وہ بوریت سے بچنے کے لیے ماحول سے فرار اختیار کرتا ہے۔ یکسانیت سے فرار کے عمل میں چھوٹے بڑے عورت مرد بوڑھے اور جوان سب شامل ہو جاتے ہیں اگر انسان تنہا ہو تو اس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ تنہائی سے نکل کر ہجوم میں گم ہو جائے اور اگر وہ لوگوں کے درمیان رہتا ہے تو گوشۂ تنہائی و عافیت ہی کو تفریح سمجھتا ہے جبکہ انسانوں کی ایک بڑی تعداد ہجوم میں ہی آ کر خوش ہوتی ہے۔ شہروں کے رہنے والے گاؤں کا رخ کرتے ہیں دور دراز جگہ کو پکنک کے لیے تلاش کرتے ہیں جبکہ گاؤں کے لوگ روز مرہ کے معاملات سے ہٹ کر شہر کی رنگینوں میں وقت گزارنا چاہتے ہیں۔ شہری باشندے گاؤں، دیہاتوں یا پہاڑی مقامات میں قدرت کا فطری حسن تلاش کرتے ہیں۔ قدرتی نظارے ان کی آنکھوں کے لیے ذوق کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ جھرنے کی آواز انسانی کانوں کے لیے موسیقی بن جاتی ہے اونچے پہاڑ سرو قد درخت سرسبز و شاداب پگڈنڈیاں اور معطر فضاء انسانی زندگی کے ٹھہراؤ میں خوشگوار تازہ ہوا کا شاداب جھونکا ثابت ہوتی ہیں۔ بہتے دریا کی روانی آبِ کوثر کی یاد دلاتی ہے جبکہ امراء و روساء تاجر، سیاسی رہنما اور بیوروکریٹ اپنا دیس چھوڑ کر بدیسی مقامات کو اپنی تفریح کا مرکز بناتے ہیں۔

تاریخ عالم دراصل سیر و سفر کا ہی دوسرا نام ہے سیاح کسی بھی ملک کے اعزازی سفیر ہوتے ہیں کیونکہ وہ اپنے کلچر کو فروغ دیتے ہیں پاکستان میں سیاحت کے بے شمار مواقع موجود ہیں مگر ان مواقع کو صحیح استعمال میں نہیں لایا جا رہا موجودہ دور میں سیر و سیاحت دنیا بھر کے لوگوں کا محبوب

مشغلہ ہے پورا سال روزمرہ کے کاموں میں مصروف رہنے کے بعد کچھ وقت قدرتی حسن سے مالا مال خوبصورت وادیوں، تاریخی مقامات اور سیاحتی اہمیت کے حامل دوسرے مقامات میں گذارنے سے انسان ذہنی و جسمانی تفریح حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف علاقوں اور وہاں کے رہنے والے لوگوں کے بارے میں آگاہی حاصل کرتا ہے ماحول کی تبدیلی انسان کی صحت پر اچھا اثر ڈالتی ہے۔

سیاحت وہ بیش بہا اور انمول دولت ہے جو چند ایک خوش نصیبوں کو میسر ہوتی ہے اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جتنی خوبصورت اور دلکش، تصوراتی دنیا سے زیادہ حسین کاریگری پیش کی ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان قدرت کی اس کاریگری کو دیکھے اس کو سمجھے اور خدا کی دی ہوئی اس زندگی سے بھرپور لطف حاصل کرے۔ سیاحت انسانی فطرت ہے ہر انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ سیر کرے اور دنیا کی ہر خوبصورت چیز کو دیکھے۔

فطرت نے گوناگوں مناظر کو پاکستان میں نگینے کی طرح سجا دیا ہے کہیں پہاڑوں کی جلوہ سامانیاں ہیں کہیں سمندر کی پنہائیاں کہیں آبشاروں کی جلوہ آرائیاں کہیں K-2 کی بلندیاں اور کہیں تھل و چولستان کے صحراؤں کا حسن، پاکستان میں چھٹیاں گذارنے اور سیر و سیاحت کے بے شمار مقامات ہیں سیاحتی دلچسپی کے مقامات میں آثار قدیمہ، تاریخی مقامات، برف پوش پہاڑ، سرسبز و شاداب وادیاں اور ساحلی تفریح گاہیں شامل ہیں۔

پاکستان ایک ایسی سرزمین ہے جو جغرافیائی طور پر بہت اہم ہے ہمارے پاس شمالی علاقوں یعنی گلگت بلتستان میں ایسی بلند و بالا چوٹیاں ہیں جن کے سبب ساری دنیا ہم سے واقف ہے کہا جاتا ہے کہ دنیا کے ستر فیصد پہاڑ بلتستان میں ملتے ہیں شاہراہ ریشم جیسی عظیم الشان سڑک ہمارے حصے میں ہے دریائے سندھ ایسا طویل وسیع اور گہرا دریا ہماری سرزمین سیراب کرتا ہے راوی، چناب، جہلم ہماری دولت ہیں۔ وادی سوات وادی کاغان، وادی نیلم، اور وادی جہلم کی اپنی ایک شان ہے۔ پنجاب کی زرخیزی اور سرسبزی ہماری زرعی طاقت کی مظہر ہے تھر اور چولستان اپنی شان لیے ہوئے ہیں۔ پاکستان کی سرزمین سیاحوں کے لیے ایک حیرت کدے سے کم نہیں پاکستان دیکھنے کی چیز ہے۔

پاکستان میں ہر سال 40 سے 50 ہزار کے درمیان غیر ملکی سیاح آتے ہیں اور تقریباً 5 لاکھ

پاکستانی باشندے سیاحت کی غرض سے اندرون ملک سفر کرتے ہیں پاکستان اگرچہ رقبے کے اعتبار سے چھوٹا سا ملک ہے لیکن اس کی سرزمین اور موسمیاتی جغرافیہ کچھ اس طرح کا ہے کہ آپ سال کے کسی بھی دن اس کے ایک کونے میں برف دوسرے میں سخت گرمی اور تیسرے کونے میں بہار کے کھٹے میٹھے موسم سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں سیاحت کے اتنے امکانات اس قدر رنگوں کے ساتھ کسی اور ملک کو بہت کم نصیب ہوئے ہیں۔ دنیا کی آٹھ ہزار میٹر سے بلند 14 چوٹیوں میں سے 5 پاکستان میں ہیں۔ حکومت کو سالانہ شمالی علاقہ جات میں کوہ پیمائی کے لیے آنے والے غیر ملکی سیاحوں سے لاکھوں ڈالرز کی آمدنی ہوتی ہے۔

تاحال سیاحوں کو شمالی علاقوں میں ان کی دلچسپی کے اہم مقامات تک پہنچنے کے لیے مناسب سفری سہولتیں تک دستیاب نہیں بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں اچھی سڑکیں موجود نہیں یا ان پر اچھی بسیں کم دستیاب ہیں اس طرح اقامتی سہولتوں کا معیار اتنا دلکش نہیں کہ سیاحوں کی بڑی تعداد شوق سے ان مقامات کا رخ کرے۔ اس کے علاوہ سیاحوں کی دلچسپی کے لیے خصوصی نوعیت کے پروگرام وضع کرنے ٹورز پیکج اور ڈومیسٹک ٹورازم یعنی ملکی سیاحت کو فروغ دینے کی اشد ضرورت ہے بالخصوص گھڑ سواری علاقائی رقص و موسیقی، کھیل کود اور نمائشوں کے دلچسپ مظاہرے سیاحوں کی توجہ کا مرکز بن سکتے ہیں۔

ملک میں سیاحت کو فروغ دینے کے لیے ہمیں اپنا مزاج تبدیل کر کے خود کو سیاح دوست ثابت کرنا ہوگا سیاحوں کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں دینا ہوں گی۔ دنیا بھر میں سیاحت کم ہو رہی ہے اس کی بڑی وجہ بڑھتی ہوئی مہنگائی ہے لیکن اب بھی بہت سارے ممالک ٹورازم سے اپنی معیشت بحال رکھے ہوئے ہیں موجودہ صورتحال میں پاکستان کو سیاحت کے شعبے میں کافی نقصان ہو رہا ہے پاکستان میں بے شمار ایسے جانور موجود ہیں جنہیں دیکھنے کی سیاح خواہش رکھتے ہیں ان میں ماس خور، سمندری کچھوے اور ڈولفن ایسے جانور ہیں جو دنیا میں بہت نایاب ہیں ساحل مکران کو بہتر بنایا جا سکتا ہے نجی شعبے کے ساتھ مل کر چھوٹے جہاز چلائے جا سکتے ہیں اس سلسلے میں بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کو بھی اپنا کردار ادا کرنا چاہیے اور لوگوں کو اپنے ملک کے حسن اور تہذیب سے آگاہ کر کے انہیں متوجہ کیا جانا چاہیے۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کے شہروں میں رہنے والے ہزاروں لوگ اپنے اپنے شہر کے معروف مقامات سے ناواقف ہیں۔ لوگوں کو بہت سے دیدہ زیب اور

آنکھوں کو ٹھنڈک عطا کرنے والے علاقوں کے بارے میں علم نہیں ہے کمیونیکشن کے ذرائع ناقص ہیں سڑکیں ٹوٹی ہوئی ہیں سہولیات کی کمیابی ہے بس اڈوں پر جائیں تو خراب صورتحال کی وجہ سے طبیعت متلانے لگتی ہے جبکہ دنیا بھر میں سیاحوں کو زیادہ سے زیادہ سہولیات دینے کے لیے مقابلہ بازی ہو رہی ہے ترکی سیاحت کے شعبے میں 20 بلین ڈالر سالانہ کماتا ہے۔ جزیرہ مالٹا اور سارک ممالک میں سری لنکا، مالدیپ، سیاحت کی صنعت پر اربوں ڈالر خرچ کر رہے ہیں سوال یہ ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں صرف زبانی جمع خرچ یا پھر خود ساختہ سرکاری پابندیوں اور نرغے میں جکڑے ہوئے ہیں اور سیاحت کو ملک میں فروغ دینا ہی نہیں چاہتے کھٹمنڈو سے زیادہ خوبصورت وادیاں اور گھاٹیاں ہمارے پاس ہیں تاہم ذرائع نقل وحمل کو بہتر بنانے کے بغیر ان تک رسائی آسان نہیں اور نہ ہی سیاحوں کو اس طرف راغب کیا جا سکتا ہے ہمیں اپنی ثقافت کو دنیا بھر میں متعارف کرانا ہوگا اور لوگوں کو اس بارے میں شعور دینا ہوگا کہ یہاں سیاحت کے متعلق حالات سازگار ہیں اس کے لیے ہمیں سیاحوں کو بے شمار سہولیات فراہم کرنا ہوں گی۔

فی الوقت ضرورت اس بات کی ہے کہ ٹورازم کو فروغ دینے کے لیے تاریخی عمارات اور لوک ورثہ کی پوری حفاظت اور نگہداشت کی جائے واقعہ یہ ہے کہ ہم خود اپنی ثقافت برباد کر رہے ہیں شاہی قلعہ اور شالیمار باغ میں تقریبات منعقد کرنے پر فوری طور پر پابندی عائد کی جائے تاکہ اس کا روایتی حسن برقرار رہ سکے۔ شالیمار باغ اور شاہی قلعہ میں جو تقریبات منعقد کی جاتی ہیں ان سے قومی اہمیت کے حامل ان تاریخی مقامات کو بے تحاشا نقصان پہنچتا ہے۔

ہمارے ملک میں 99 فی صد لوگ ایسے ہیں جنہوں نے خود پاکستان کے خوبصورت شمالی علاقہ جات کو دیکھا ہے نہ سندھ کے اندرونی علاقوں بالخصوص تھر کے علاقوں کو دیکھ سکے ہیں نہ انہوں نے سمندر کے ساحلی علاقوں کی سیر ہے ہمیں سب سے پہلے مقامی لوگوں کو ٹورازم کے بارے میں مشورہ دینا چاہیے اور علاقائی سیاحت وثقافت یعنی دومیسٹک ٹورازم کے فروغ کے لیے حتیٰ الامکان کوشش کرنی چاہیں کیونکہ مقامی سیاحت فروغ پائے گی تو غیر ملکیوں تک بھی اس کے اثرات پہنچیں گے۔

مقامی باشندوں کو سیاحوں کی مناسب پذیرائی کی ابھی تک پوری طرح تربیت نہیں دی گئی چنانچہ جو سیاح ان مقامات سے واپس لوٹتے ہیں وہ شکایات کے دفتر لے کر آتے ہیں۔ کوریا اور

جاپان سے سیاحوں کو سکردو، ٹیکسلا، چلاس، اور تخت بھائی جیسے مقامات پر لانے میں کوئی امر مانع نہیں صرف انہیں اچھی اور عمدہ سہولیات فراہم کرنے اور مناسب ذرائع ابلاغ سے راغب کرنے کی ضرورت ہے۔

حکومت کا رہائشی اور سفری سہولتوں پر کوئی چیک اینڈ بیلنس نہیں ہے چند فائیو اسٹار ہوٹلوں کا معیار بہتر ہے مگر ان ہوٹلوں کا کرایہ اور دوسرے سروس چارجز اتنے زیادہ ہیں کہ انہیں افورڈ کرنا عام سیاحوں کے بس کی بات نہیں ہے۔

دنیا کے بیشتر ممالک کا انحصار سیاحت کی صنعت سے وابستہ ہے اور میں یہ بات پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ وہ تمام ممالک اپنے سالانہ بجٹ میں ہر سال کروڑوں اربوں ڈالرز کا فنڈ اس مقصد کے لیے مختص کرتے ہیں۔

کسی قوم کی نفاست طبع کا اندازہ لگانا ہو تو اس کے باغات میں چلے جایئے یا اس کی عمارات کو بغور دیکھیے ایک امریکی دانشور کا قول ہے کہ باغات، تفریح گاہیں اور پارک تمام ملکی کتب خانوں سے زیادہ مفید ہیں۔ ترقی یافتہ مغربی ممالک میں شہری منصوبہ بندی کے وقت کم و بیش ایسے ہی احساسات کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔

پاکستان میں تفریح گاہیں، ہیں ہی کتنی بڑے شہروں میں چند باغات یا پارکوں کے علاوہ مٹتے ہوئے تہذیبی آثار جو ہم سب کے لیے لمحہ فکریہ ہیں تفریح گاہیں یقیناً کسی بھی ملک کی ثقافتی، تہذیبی اعلیٰ اور ارفع معیار کی غماز اور روشن چراغ کی مانند ہوتی ہیں جن سے ہر عمر بچے سے لے کر بوڑھے تک سب یکساں محظوظ ہوتے ہیں اور بلاشبہ تمام تفریحی مقامات دیکھنے والوں پر اپنا انمٹ نقش مرتب کرتے ہیں۔

جو لوگ فطرت سے پیار کرنے والے ہوں ان کو چاہیے کہ وہ وطن عزیز کے گوشے گوشے، چپے چپے پر پھیلے ہوئے اور دعوت نظارہ دینے والے دل خوش کن بیسیوں مناظر کو کھلی آنکھ سے دیکھیں اور باریک بینی سے مشاہدہ کریں۔ جنگلات، باغوں اور پارکوں میں گھومیں جھیلوں، دریاؤں اور پہاڑوں کے نظارے کریں۔

اس کتاب کی وساطت سے اپنے ان تمام دوست واحباب اور بھائیوں کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مشکور ہوں جنہوں نے وقتاً فوقتاً پاکستان کے مختلف اخبارات ورسائل اور میگزین

وغیرہ میں ملک کے چاروں صوبوں میں واقع دلچسپ تفریح گاہوں کے حوالے سے فکر انگیز مضامین تحریر کیے۔ مرتب کی حیثیت سے ان تمام تفریح گاہوں جو بلاشبہ ہمارے ملک کا بیش قیمت اثاثہ ہیں کو یکجا کرنے کی طالب علمانہ کوشش کر رہا ہوں۔ یہ تمام تفریح گاہیں بلاشبہ ہماری دھرتی کا بیش قیمت جھومر اا ور انمول خزائن ہیں ہم سب کو ان کی دل و جان سے حفاظت کرنا ہے انہیں اپنے گھر کی طرح پاکیزہ اور صاف ستھرا رکھنا ہے۔

آلودگی سے بچانا ہے سرکاری اور خصوصاً نجی شعبہ اس طرف زیادہ گامزن ثابت ہوسکتا ہے ہم سب کو انفرادی طور پر اپنے اپنے حصے کا فرض ادا کرنا ہے تا آنکہ ہم سب آئندہ آنے والی نسلوں کو اچھی صاف اور معیاری تفریح کے زیادہ سے زیادہ مواقع بہم پہنچا سکیں اور ملک کا ہر فرد آسانی سے اپنی پاک سرزمین کے چاروں صوبوں میں واقع باغات، تفریح گاہوں اور بے مثال تعمیراتی حسن کو کھلی آنکھ سے دیکھ سکے۔

میری ہمیشہ سے یہ بھرپور خواہش رہی کہ اپنی قومی زبان اردو میں پاکستان کی سیاحت اور قریئے قریئے میں واقع تفریح گاہوں، آثار قدیمہ، دریاؤں، جھیلوں اور وادیوں بہتے جھرنوں، بلند پہاڑوں چوٹیوں اور دلکش و جاذب حسن کی حامل عمارتوں پر کوئی جامع اور تفصیلی کتاب جس میں ان تمام پہلوؤں کا احاطہ شامل ہو۔ مل سکے لیکن ایسا شاید ممکن نہ ہوسکا لہٰذا میں نے ان کو تین مختلف حصوں میں تقسیم کیا جن میں میری پہلی مرتب کردہ کتاب ''شمالی علاقہ جات اور پاکستان'' ملک کی دلکش اور جاذب نظر وادیوں اور خوبصورت نظاروں پر مشتمل ہے، دوسری مرتب کردہ کتاب ''پاکستان کے آثار قدیمہ'' بک ہوم نے نہایت اہتمام کے ساتھ جنوری 2008ء میں شائع کی جو ہر طبقہ ہائے فکر میں بے حد پسند کی گئی۔ پاکستان کی مختلف تفریح گاہوں اور بے مثال تعمیراتی حسن کے حوالے سے پھیلے ہوئے ملک گیر سلسلے پر مشتمل ہے۔

میری یہ تمام کاوش بلاشبہ قومی زبان اردو میں ایک طالبعمانہ اور ملکی سیاحت کو فروغ دینے میں ایک ادنیٰ سی کوشش ہے۔ میں اپنی اس کتاب کی وساطت سے ملک میں سیاحتی سرگرمیوں کے فروغ دینے کے بارے میں چند گذارشات پیش کرنا چاہوں گا۔

پاکستان میں سیاحت کے فروغ کے روشن امکانات:

- پاکستان میں زیادہ سے زیادہ تفریح گاہوں کا قیام عمل میں لایا جائے ملک میں رابطہ سڑکوں

کا جال بچھایا جائے اور تمام چھوٹے بڑے شہروں میں یوتھ ہوسٹلز کا قیام عمل میں لایا جائے۔

- سیاحت کا ایک فنڈ تشکیل دیا جائے۔سیاحت کو نصاب کا حصہ قرار دیا جائے۔
- حکومت کو چاہیے کہ مزید تاخیر کی بجائے سیاحت کا ماسٹر پلان مرتب کرے اور باقاعدہ ٹاسک فورس تشکیل دی جائے جس میں سیاحت سے وابستہ اور متحرک نمائندہ افراد کو ہی شامل کیا جائے یہ ٹاسک فورس سیاحت کے فروغ اور رجحان پر ایک وسیع تر آئینی ڈھانچہ مرتب کرے اور ہر سال سیاحت پالیسی کا از سر نو اعلان کیا جائے۔
- اخبارات ورسائل ہفتہ میں ایک دن سیاحت کا باقاعدہ ایڈیشن شائع کریں۔
- ریڈیو پاکستان، اپنے دستاویزی پروگراموں میں شمالی علاقہ جات کی حسین وادیوں، ملک میں واقع تاریخی یادگاروں اور تفریح گاہوں کے حوالوں سے اسکرپٹس اور فیچرز نشر کریں جبکہ پاکستان ٹیلی ویژن کے تمام نجی چینلز پر بلاناغہ زیادہ سے زیادہ دستاویزی پروگرام دکھائے جائیں۔
- سکولوں اور کالجوں کے طلبہ و طالبات کے لیے سیاحت کے فروغ کے لیے ٹیبلوز، واک، تقریری مقابلے اور باقاعدہ ٹور پروگرام ترتیب دیئے جائیں۔
- ملک کے تمام شہروں میں ٹورازم اکیڈیموں کا قیام عمل میں لایا جائے جس کے زیر اہتمام سیاحت کی بہبود کے لیے سیمینارز، کانفرنسز، سمپوزیم، ورکشاپ اور نمائشیں منعقد ہوں۔ طلباء اور نوجوانوں کو ان اکیڈیموں کی ممبر شپ دی جائے اور ان اکیڈیمز کی باقاعدہ سالانہ رپورٹ ہر دو زبانوں انگلش اور اردو میں شائع کرائی جائے۔طلبہ کے گروپ ٹورز تشکیل دیئے جائیں تاکہ ان میں سیاحت کا جذبہ اور شوق اجاگر ہوسکے۔

ہم اپنے ملک کے چاروں صوبوں کے عظیم تاریخی ورثوں کو بیرونی دنیا میں روشناش کرائیں اور سب سے بڑی بات کہ سیاحت کے لیے سازگار اور پرامن ماحول فراہم کریں ریلوے کا انتظام ہو یا ہوٹلنگ یا بذریعہ سڑک سفر ہو تمام حوالوں سے وہ پرکشش بھی ہو اور پوری طرح محفوظ بھی کرائے سستے ہوں اور رہائشی سہولتیں آسان نرخوں پر میسر ہوں۔ٹرینوں، بسوں اور فضائی کرایوں میں کمی کریں سڑکوں کو بہتر بنائیں ہوسٹلوں کا جال بچھائیں۔سیاحت کو فروغ دینے کے لیے ٹی وی

چینلز استعمال کے لیے جائیں سیاحت کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ ہم حالات کو بہتر بنائیں۔ داخلی سیاحت کو زیادہ فروغ ملنا چاہیے اگر ہم اندرونی طور پر سیاحت کو فروغ نہیں دیں گے تو غیر ملکی سیاح بھی یہاں نہیں آ سکیں گے اگر وہ یہاں نہیں آ ئیں گ۔ تو ملکی خزانے میں زرمبادلہ کے طور پر آنے والا سرمایہ بھی حاصل نہیں ہو سکے گا۔

سرکاری یا نجی ادارے کی طرف سے سیاحت ٹورازم کے فروغ کے لیے پندرہ روزہ یا ماہانہ معیاری میگزین شائع کیا جائے تبھی سیاحت کو فروغ حاصل ہو سکے گا اس ملک میں بے بہا خزانے اور نہایت قیمتی معدنیات کے ذخائر موجود ہیں انشاء اللہ ایک دن ایسا آئے گا کہ ہم ان خزانوں سے بہتر طور پر مستفید ہو سکیں گے۔

یہ کام نہ تو ایک ادارے کا ہے نہ ایک فرد کا اور نہ ہی حکومت کا، ہمارے ملک سے کثیر القومی ادارے کروڑوں روپے کما کر اپنے ملک منتقل کرتے ہیں کیا ان پر یہ اخلاقی فرض عائد نہیں ہوتا کہ وہ اس ملک کی زمینی اور فضائی آلودگی کی روک تھام کے لیے حکومت کی کوششوں میں بھر پور حصہ لیں۔

ایک سروے کے مطابق 87-1986ء میں سیاحت سے ہمیں 180 ملین امریکی ڈالر کا زرمبادلہ حاصل ہوا جو یونان اور مصر کی سیاحتی صنعت کی آمدنی کے مقابلے میں میں کچھ بھی نہیں ہے یونان اور مصر ہر سال سیاحت سے بالترتیب 2.5 ملین اور 2 بلین امریکی ڈالر کماتے ہیں تھائی لینڈ اور انڈونیشیا نے بھی اپنی سیاحتی صنعت کو فروغ دیا اور 1982ء سے اب تک ان کا ریونیو تین گنا سے زیادہ ہو چکا ہے عالمی سطح پر سیاحت ایک بڑی معاشی سرگرمی کے طور پر ابھر رہی ہے مجموعی قومی پیداوار کا ایک بڑا حصہ اور ملازمتوں کی کثیر تعداد خصوصاً ترقی پذیر ممالک میں سیاحت سے ہی وابستہ ہے دنیا بھر میں 2001ء میں سیاحوں کی آمد ستر کروڑ کے قریب ریکارڈ کی گئی تھی۔ ملک کے اندر ہی سیاحت نہیں اس ملک کے باشندوں کی اپنے ملک کی سیر بھی ان ممالک میں آمدنی کے خرچ میں ایک اہم مد میں شمار ہو رہی ہے اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ مستقبل میں سیاحت کو مزید فروغ حاصل ہو گا۔

اقوام متحدہ کے عالمی ادارہ سیاحت کی پیشن گوئی کے مطابق 2020ء تک سیاحت میں 4.1 فی صد سالانہ کے حساب سے اضافہ ہو گا اس میں شمالی امریکہ، یورپ اور مشرقی ایشیاء کے ممالک

سرفہرست ہیں۔ سیاحت میں اس امر کی ضرورت بھی بڑھتی جارہی ہے کہ فطرت سے قریب تر اور ماحول دوست سیاحت کے لیے متعلقہ مقامات اور اشیاء کو فروغ دیا جائے۔

مقامی حالات اور مقامی برادریوں کا خیال رکھتے ہوئے سیاحت کو کس طرح مستحکم طریقے سے فروغ دیا جاسکتا ہے اس سلسلے میں رہنما اصولوں کی وضاحت کے لیے بقائے ماحول کا عالمی ادارہ آئی یو سی این اقوام متحدہ کے ماحولیاتی پروگرام UNEP اور عالمی ادارہ سیاحت WTO نے ایک کتابچہ شائع کیا ہے جس میں سیاحت کے منتظمین، منصوبہ سازوں، حکومت اداروں اور خود سیاحوں کے لیے رہنما اصول بیان کیے گئے کہ حفاظتی علاقوں (پروٹیکڈ ڈ ایریا) میں وہ کس طرح سیاحت کو فروغ دے سکتے ہیں۔

عالمی سطح پر سیاحت ایک بڑی معاشی سرگرمی کے طور پر ابھری رہی ہے مجموعی قومی پیداوار کا ایک بڑا حصہ اور ملازمتوں کی کثیر تعداد خصوصاً ترقی پذیر ممالک میں سیاحت سے ہی وابستہ ہے بلاشبہ سیاحت ایک صنعت کا درجہ رکھتی ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ پاکستان میں سیاحتی سرگرمیاں اتنی نہیں ہیں یا دوسرے لفظوں میں ان سے زرمبادلہ اتنا کمایا نہیں جارہا کہ ہماری ملکی معیشت ہی کافی مددگار ثابت ہو جبکہ دنیا میں کئی ممالک جیسے سویٹزرلینڈ، سپین، اٹلی، یونان، مصر، نیپال، اور مالدیپ وغیرہ سیاحت کی صنعت کو اپنی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی قرار دیتے ہیں۔ سیاحت دنیا کی نمبرون صنعت ہے لہٰذا پاکستان کو دوسرے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑا کرنے کے لیے حکومت پاکستان شبانہ روز کوشاں ہے مستحکم سیاحت ایک مستحکم معیشت کی کنجی ہے۔

قدرتی خزانوں اور پیور نیچر Pure Nature کا تحفظ وقت کی اہم ضرورت ہے اب یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ سیاحت کا موثر و مفید فروغ ایکوٹورازم سے ہی ممکن ہے ایکوٹورازم کیا ہے لفظ ایکو ECO کا لغوی معنی دوستانہ Frinedly ہے یعنی ایسی سیاحتی سرگرمیاں انجام دی جائیں جو ماحول کو آلودگی سے پاک رکھیں اور مقامی باشندوں کے لیے مفید ہوں اور ان سے سیاحتی مقامات کی اصلیت اور قدرتی حسن بھی متاثر نہ ہو۔

بڑھتی ہوئی سیاحت سے پیدا ہونے والے مستقبل کے خطرات سے نمٹنے کے لیے ممکنہ طریقہ کار طے کر لینا ضروری ہے۔ قدرت نے پاکستان کو جس تاریخی وتہذیبی حسن سے نوازا ہے اس کے مناظر آپ کو پاکستان میں جگہ جگہ ملیں گے تمام شہر قصبات گاؤں اور تفریحی مقامات اپنی

منفرد خصوصیات کی وجہ سے سیاح لوگوں کے لیے دلکش اور پرکیف ہیں۔

قومی سربلندی اور ترقی کے منصوبے محض سرکاری سطح پر عمل درآمد سے کامیاب نہیں ہوتے۔ ان کی کامیابی اس وقت یقینی ہوتی ہے جب عوام ان منصوبوں کی تکمیل میں بھرپور شرکت کریں۔امید ہے یہ کتاب ہمارے سیاحتی شعور کو اجاگر کرنے میں یقیناً مفید ثابت ہوگی اس ضمن میں زیادہ سے زیادہ معلومات کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے ہماری کاوش آپ کو کیسی لگی اس بارے میں آپ کے تبصروں، آراء اور تجاویز کے ہم منتظر رہیں گے تاکہ اس کتاب کو اور زیادہ سے زیادہ جاذب نظر بنایا جاسکے۔

آج تک کسی حکومت نے سیاحت پالیسی کا باضابطہ اعلان نہیں کیا۔صوبائی حکومتیں اپنے اپنے اضلاع میں زیادہ سے زیادہ باغات، تفریح گاہوں اور پبلک پارکس کا قیام عمل میں لائے اور ہر سال سالانہ بجٹ میں اس مقصد کے لیے فنڈز مختص کیے جائیں اس سلسلے میں محکمہ جنگلات، وائلڈ لائف اور شہروں میں قائم بلدیاتی اداروں کو فعال بنایا جائے کہ وہ اپنی جگہ پر متحرک کردار ادا کریں۔مختصراً مستحکم سیاحت ایک مستحکم معیشت کی کنجی ہے۔

شاعر نے کس خوبصورتی سے اپنے پاک وطن سے اپنی محبت وانسیت کا اظہار کیا ہے آخر میں آپ سے اجازت چاہتے ہوئے اس شعر پر اپنی بات ختم کروں گا۔

پاکستان کے شہرو، زندہ رہو پائندہ رہو
روشنیوں رنگوں کے شہرو زندہ رہو پائندہ رہو

شیخ نوید اسلم
سیل:0300-8841258

پیغامات

بانئ پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ

آیئے!

اپنے ماحول کے ساتھ انصاف کریں۔

صاف ستھری بہترین حکمت عملی۔

مملکت ایک باغیچے کی طرح ہے آپ جس حد تک اپنے باغیچے کی نگہبانی کریں گے۔اس کی بہتری کے لیے کوشش اور تدبیر کریں گے اتنا ہی یہ باغیچہ سرسبز و شاداب ہوتا چلا جائے گا۔

قائداعظم محمد علی جناحؒ کا اسلامیہ کالج پشاور میں خطاب

2اپریل1948ء

بابائے قوم کو خراج عقیدت پیش کرنے کا احسن طریقہ خوبصورت پاکستان کے لیے عملی کاوش قدم بڑھائیں حسین ماحول، سدابہار مستقبل کی جانب۔

○

میاں مظفر علی

صدر لاہور چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری

سیاحت ایک بڑی صنعت اور بہت سے ممالک کی معیشت کے لیے یہ بنیادی ستون کا درجہ رکھتی ہے جس کی وجہ سے یہ دنیا کی انتہائی تیزی سے ترقی کرنے والی صنعتوں کی صف میں شامل ہو چکی ہے لیکن ہمارے ملک میں بے تحاشا پوٹینشل ہونے کے باوجود یہ صنعت ہمیشہ دگرگوں حالات کا شکار رہی ہے حالانکہ ذرا سی توجہ سے یہ صنعت ملک کی معاشی نشوونما کی رفتار کو دوگنا کر سکتی ہے۔ دورِ حاضر میں مارکیٹنگ کی حکمتِ عملی ہر ایک صنعت کے لیے انتہائی اہمیت اختیار کر چکی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مصنوعات تیار کرنے کی نسبت مارکیٹنگ کی بہترین حکمتِ عملی مرتب کرنا زیادہ مشکل کام ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ سیاحت کی صنعت پر بھی یہی اصول لاگو ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے ہم آج تک مارکیٹنگ کی ایسی حکمتِ عملی ترتیب دینے میں ناکام رہے ہیں جو ہماری سیاحت کی صنعت میں موجود پوٹینشل کو بھرپور طریقے سے اجاگر کر سکے اور دنیا کو یہ معلوم ہو سکے کہ سیاحت کے حوالے سے پاکستان کے پاس کیا کچھ موجود ہے۔ نیپال پاکستان سے کہیں چھوٹا ملک ہے جہاں سیاحوں کے لیے واحد کشش وہاں کے پہاڑی سلسلے اور ٹریکنگ کا ایڈونچر ہیں۔ اس کے باوجود مارکیٹنگ کی بہترین حکمتِ عملی کی بدولت وہاں سیاحت کی صنعت تقریباً سات فیصد سالانہ کی شرح سے ترقی کر رہی ہے جبکہ ہمارے ہاں بلند و بالا پہاڑ، وسیع و عریض صحرا، گھنے جنگلات، ٹھاٹھیں مارتے دریا، خوبصورت وادیاں، ہزاروں کلومیٹر طویل ساحل اور بے شمار تاریخی مقامات ہونے کے باوجود سیاحت کی صنعت کی شرح نمو مایوس کن ہے۔ ہمارے شمالی علاقہ جات 72,496 کلومیٹر رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں جن میں دنیا کی خوبصورت ترین وادیاں، جھیلیں اور

ہندوکش، پامیر، قراقرم اور ہمالیہ سمیت دیگر کئی مشہور پہاڑی سلسلے، گندھارا، انڈس ویلی، موہنجوداڑو، اور مغلوں سمیت نصف درجن تہذیبوں کے آثار یہاں موجود ہیں۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اس وقت روئے زمین پر آٹھ ہزار میٹر سے زائد بلند چودہ پہاڑ موجود ہیں جن میں سے دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو سمیت چار پہاڑ پاکستان میں واقع ہیں۔ ان سب کی مدد سے سیاحت کی صنعت عروج پر پہنچ سکتی تھی لیکن مارکیٹنگ کی بہتر حکمتِ عملی نہ ہونے کی وجہ سے ایسا نہیں ہو سکا۔ میں توقع کرتا ہوں کہ یہ کتاب پاکستان کی سیاحت کی صنعت کے لیے ایک اہم سنگِ میل ثابت ہوگی اور اسکی مدد سے نہ صرف عالمی سطح پر بھی پاکستان کا تاریخی، ثقافتی اور قدرتی حسن اجاگر ہوگا جس سے پاکستان کی سیاحت کی صنعت کو فروغ حاصل ہوگا۔

○

شیر عالم محسود

ڈائریکٹر جنرل
وائلڈ لائف اینڈ پارکس پنجاب

زیر نظر کتاب جو وطنِ عزیز سے منسلک قدرتی ماحول، عوامی تفریح، جنگلات اور آبی مقامات پر مشتمل ہے یقیناً عوام الناس کو اہم اور مفید معلومات فراہم کرنے میں مدومعاون ثابت ہوگی۔

پاکستان قدرتی وسائل سے مالا مال ہمالہ کے دامن سے منسلک ایک قدرتی طبعی خطے میں انتہائی اہم جگہ پر واقع ہے۔ انہی خصوصیات کی بدولت یہاں کے قدرتی جنگلات، بلند و بالا پہاڑ، آبی گزرگاہیں، جھیلیں اور دریا یقیناً سیاحت کے فروغ کا باعث ہیں جن کی حفاظت کو یقینی بنانا آج کی اہم ضرورت ہے۔

گزشتہ دو دہائیوں سے ہمارے خطے میں ماحول کا قدرتی توازن بگڑ چکا ہے جس کی وجہ قدرتی علاقوں میں آبادی کی منتقلی، بڑے بڑے ترقیاتی منصوبہ جات، جنگلات کی کٹائی، موسمی تبدیلی، درجہ حرارت میں اضافہ اور دریائی پانی میں کمی وہ وجوہات ہیں جس سے پائیدار ترقی کے اہداف حاصل کرنے دشوار ہو چکے ہیں لہٰذا ایسے موڑ پر اس طرح کی کتاب یقیناً اہمیت کی حامل ہے جس سے عوام الناس کو معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ شعور بیدار کرنے میں بھی مدد ملے گی۔

○

ڈاکٹر شگفتہ شاہ جہاں

ڈائریکٹر جنرل
محکمۂ ماحولیات، حکومت پنجاب

سورۃ الحجرہ کی آیت نمبر 19 تا 21 میں اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

''اور زمین کو ہم نے بچایا اور ہم نے اس میں پہاڑوں کے لنگر ڈال دیئے اس میں ہر قسم کی چیزیں تناسب کے ساتھ اُگائیں اور ہم نے اس میں تمہاری معیشت کے سامان بھی رکھے اور ان معیشت کے بھی جن کو تم روانی نہیں دیتے اور کوئی شے ایسی نہیں ہے جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں لیکن ہم اس کو ایک معین اندازے کے مطابق اُتارتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے کرۂ ارض پر انسان کے علاوہ ان گنت اقسام کے جاندار پیدا کیے ہیں جو اپنے مخصوص ماحول کی مناسبت سے زمین کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ''حیاتیاتی تنوع'' کو Biodiversity کی اصطلاح سے یاد کیا جاتا ہے حیاتیاتی تنوع کی اصطلاح نباتات، حیوانات، حشرات، اشجار اور ان دیگر تمام زندہ اجسام کا احاطہ کرتی ہے جو خداوند کریم کی تخلیق کے مظہر ہیں۔

سیاحت اور ماحول کا چولی دامن کا ساتھ ہے انسانی علم میں اضافے کے ساتھ ساتھ نت نئے راز کھل رہے ہیں اور پرانے اندازوں میں ردوبدل کیا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ہمیشہ زندگی کے تمام پہلوؤں میں اعتدال اور توازن قائم رکھنے کا حکم دیا ہے۔

پاکستان کے تفریحی مقامات وعمارتوں کی سیاحت کے حوالے سے ترتیب دی جانے والی یہ کتاب اس حوالے سے بڑی منفرد اور اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں شیخ نوید اسلم نے بڑی عرق ریزی سے پاکستان بھر کے تاریخی وقابل ذکر مقامات کی نہ صرف تاریخ اور حدود اربعہ بیان کیا ہے

بلکہ بعض عمارتوں کی مخدوش حالت کے پیش نظر ان کی بہتری کے لیے بڑی کارآمد تجاویز بھی دی ہیں۔ مصنف نے یہ سب کچھ اتنے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے کہ دوران مطالعہ قاری کہیں بھی بوریت محسوس نہیں کرتا اتنی شگفتہ تحریر بہت کم کم پڑھنے کو ملتی ہے مصنف نے بڑی مہارت سے قابل ذکر تفریحی مقامات کی منظر کشی کی ہے۔ سیر و سیاحت کے ملکی و غیر ملکی شائقین کے لیے یہ کتاب بہترین گائیڈ کا کام دے گی۔

حکومت ماحولیاتی مسائل پر قابو پانے میں پُرعزم ہے اور اس عزم کی تجدید کے لیے 2009ء کو ماحول کا قومی سال قرار دیا گیا ہے یہ کتاب اس سلسلے کی اولین پیشرفت ہے۔

○

ندیم اسلم چودھری

ڈائریکٹر جنرل
پارکس اینڈ ہارٹی اتھارٹی
لاہور

سمندر، کھیت کھلیان، کوہسار چار خوبصورت صوبے تمام تر ثقافتی دلکشی کے ساتھ ہمارا اثاثہ ہیں۔ اپنا ملک، اپنا خطہ ہر باسی کو بھلا لگتا ہے اسی لیے ہر کوئی اپنی دھرتی کے رنت نو یلے رنگ مہمانوں کو متعارف کروا کے فخر محسوس کرتا ہے۔

شیخ نوید اسلم نے قریہ قریہ گھوم کر جس لگن سے تمام معلومات کو اکٹھا کیا ہے بلاشبہ ان کی حب الوطنی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ پُرکھوں کی محنت اور ورثہ سے نئی نسل کو روشناس کروانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

○

ملک محبوب الرحمٰن

چیف کنزرویٹو، محکمہ جنگلات
حکومت پنجاب

کرۂ ارض پر زندگی کی ابتداء درختوں سے ہوئی۔ درخت نہ صرف ماحول کو دلکش بناتے ہیں بلکہ ماحول کو صاف ستھرا بھی رکھتے ہیں۔ قرآن مجید میں بھی درختوں کی خوبیوں کا بار بار تذکرہ ملتا ہے۔ انسانی تاریخ پر نگاہ دوڑائی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ جوں جوں نسل انسانی میں اضافہ ہوا انسان کا درختوں سے تعلق بڑھتا چلا گیا۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی انسان کو ایسی کئی ضروریات پوری کرنے کے لیے درختوں کی ضرورت لاحق رہتی ہے۔ موجودہ مشینی دور میں فضائی آلودگی دن بدن بڑھ رہی ہے۔ جنگلات فضاء کو اس آلودگی سے پاک کرنے کا قدرتی کارخانہ ہیں۔ اپنی ان خوبیوں کی بناء پر درختوں کا رول بہت سی جان لیوا بیماریوں مثلاً کینسر اور لرزہ کی بیماری کے علاج کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ درخت اللہ تعالیٰ کی خاص نعمتوں میں سے ہیں یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ جنگلات انسان کے لیے انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ دور جدید میں جبکہ انسانی ضروریات مشینی انداز میں پوری کی جا رہی ہیں درختوں کی اہمیت میں قطعی طور پر کمی نہیں ہوئی۔

درخت نہ صرف ہمیں آکسیجن فراہم کرنے کا موثر وسیلہ ہیں بلکہ سیلاب اور دریاؤں کے پانی کے کٹاؤ کی روک تھام کا بھی بھرپور علاج ہیں۔

جنگلات انسان کے لیے انتہائی اہمیت کے حامل ہیں تاریخ شاہد ہے کہ درختوں نے انسانی تہذیب و تمدن پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ جدید دور میں جبکہ انسان اپنی بیشتر ضرورتیں متبادل ذرائع سے پوری کر رہا ہے درختوں کی اہمیت میں کسی قسم کی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی یہ بات

طے ہے کہ درخت پیدائش سے لحد تک انسان کا ساتھ دیتے ہیں آج کے دور میں بھی صحیح تسلیم کی جاتی ہے حقیقت یہ ہے کہ انسان علم کی روشنی میں جتنی ترقی کی منازل طے کر رہا ہے اور اس کی ذہنی و دماغی صلاحیتیں جلا پا رہی ہیں درختوں کی افادیت اس پر زیادہ سے زیادہ سامنے آ رہی ہے۔ جنگلات اور سیاحت دونوں لازم وملزوم ہیں یہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر تقریباً نامکمل ہیں۔ کسی بھی ملک کی ترقی وخوشحالی میں اس کے قدرتی وسائل ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں شیخ نوید اسلم کی زیرِ نظر کتاب انتہائی موزوں اور ملک میں سیاحت کو فروغ دینے کی اولین پیشرفت ہے جو شائقین سیاحت اور ہماری نئی نسل میں سیر وتفریح کا شعور اجاگر کرے گی۔ یقیناً اس طرز کی زیادہ سے زیادہ کتابوں کی اشد ضرورت ہے اور شیخ نوید مبارکباد کے مستحق ہیں۔ فقط عوام الناس کو ایجوکیٹ کرنے کی ضرورت ہے اور یہ سب کا مشترکہ فریضہ ہے حکومتی اور غیر حکومتی ادارے باہم مل کر اس قومی فرض کو ادا کر سکتے ہیں۔ آیئے ہم سب مل کر اپنے حصے کا قومی فرض ادا کریں۔ زیادہ سے زیادہ درخت لگائیں اور سیاحت کو ملک میں فروغ دیں۔

○

IRSHAD B. ANJUM

General Manager
Pearl-Continental Lahore

I congratulae Sheikh Naveed Aslam for bringing out this book with comprehensive information on areas of tourist attraction in Pakistan. In the times where we want to put all our efforts together to generate incoming tourist traffic, a guide like this could be a good source of information. I find the information in this guide to be beneficial for foreigners as well as local travelers who wants to experience the culture of other provinces.

I wish best of luck to Mr. Aslam and hope that this guide is a success.

O

صوبہ پنجاب

بادشاہی مسجد، لاہور

اسلامی ضابطہ حیات اس اعتبار سے نوع انسانی میں ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے کہ اس نے روزمرہ کی زندگی گزارنے کے اعلیٰ وارفع اصولوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو ایک خاص طرز فکر بھی دیا جس کی چھاپ زندگی کے تمام شعبوں پر نمایاں نظر آتی ہے طب سائنس تعلیم فلسفہ صنعت وحرفت تجارت غرض ہر شعبہ ہائے حیات میں اسلامی اصول وضوابط کارفرما نظر آتے ہیں اسلامی فن تعمیر کا شمار بھی ایسے شعبوں میں ہوتا ہے جس نے تعمیرات کو ایک نئی جہت اور نیا تشخص عطاء کیا۔

مسلمانوں کی مساجد دنیا کے کسی بھی کونے میں ہوں یہ دوسری عمارتوں سے ممتاز اور الگ تھلگ دکھائی دیتی ہیں ان کا اندازِ تعمیر سب سے نمایاں اور جدا نظر آتا ہے اسلام کی اولین درسگاہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لے کر اب تک ان عبادت گاہوں کا ایک اپنا رنگ ڈھنگ ہے ان میں داخل ہوتے ہی انسان کو جو قلبی سکون اور طمانیت ملتی ہے وہ صرف اسلامی فن تعمیر کا حصہ ہے۔ مساجد لاہور کی ہوں یا برصغیر کے کسی دور دراز مقام کی، خوبصورت گنبد اور محراب ان کا بنیادی وصف ہیں لیکن ان کی کشادگی وسیع عریض صحن اونچی چھتیں آسمان کی بلندی کو چھوتے ہوئے مینار خوبصورت ہوادار جالیاں گنبد کی اندرونی آرائش وزیبائش اور دیدہ زیب فرشی ٹائلیں بھی ان مساجد کو ہر شخص کی توجہ کا مرکز بناتی ہیں۔ دیگر عبادت گاہیں ممکن ہے نقش نگاری اور مینا کاری کے اعتبار سے خوبصورت ہوں لیکن ان کے تنگ کمرے اور پیچیدہ راہداریاں گھٹن کا احساس دلاتی ہیں جبکہ مساجد میں کشادگی کا احساس ایک عجیب روحانی کیف اور قلبی سکون سے ہمکنار کرتا ہے۔

مغلوں نے پنجاب میں جتنی مساجد تعمیر کیں ان میں اسلامی فنِ تعمیر کو پیش نظر رکھا۔

بادشاہی مسجد لاہور، مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے 1673ء میں بنوائی تھی۔ اورنگ زیب عالمگیر ایک دین دار اور علم پرور بادشاہ تھا اس نے اسلام کی بڑی خدمت کی برصغیر پاک وہند

کا یہ عظیم بادشاہ اپنی گذر اوقات کے لیے قرآن پاک کی کتابت کرتا اور ٹوپیاں سیا کرتا تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر کی تعمیر کردہ اس مسجد کا شمار دنیا کی سب سے بڑی تاریخی مساجد میں کیا جاتا ہے اور یہ ''الولید مسجد'' کے نمونے پر تیار کی گئی جو شہر مکہ میں واقع ہے پوری مسجد سرخ و سفید پتھروں سے تیار کی گئی ہے اور اسے دیکھ کر منہ سے بے اختیار اس کے بنانے والوں کی تعریف نکلتی ہے۔

یہ مسجد ایک بہت بڑے چبوترے پر بنائی گئی ہے جو تمام کا تمام سرخ پتھر کا بنا ہوا ہے اور زمین سے کافی بلندی پر واقع ہے اس چبوترے کے چاروں کونوں پر چار اونچے اونچے مینار ہیں اور ہر مینار کی چار منزلیں ہیں اوپر کی آخری منزل تک پہنچنے کے لیے مینار کے اندر چکر والی سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں جن کے ذریعے اوپر چڑھ کر لوگ آس پاس کے مناظر دیکھ کر لطف اٹھاتے ہیں چاروں میناروں سے شہر لاہور کے چاروں حصوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ مسجد کے ایک طرف دریائے راوی بہتا ہے جو مینار کی اونچائی سے ایک چمکدار اور سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی لکیر کی مانند نظر آتا ہے دوسری طرف شہر کی چھوٹی بڑی عمارتیں یوں دکھائی دیتی ہیں جیسے دور تک مٹی کے گھروندے بکھرے ہوئے ہیں دروازے کی طرف لاہور کا شاہی قلعہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے سیاحوں کا منتظر رہتا ہے۔

ان میناروں کے متعلق ایک خاص بات یہ مشہور ہے کہ ان میں سے چاہے کسی مینار پر کھڑے ہو کر جہانگیر کے مقبرے کے میناروں کو دیکھا جائے ہر صورت میں صرف تین نظر آتے ہیں اور چوتھا آنکھوں سے اوجھل رہتا ہے لیکن اگر جہانگیر کے مقبرے سے شاہی مسجد کے مینار دیکھے جائیں تو چاروں نظر آتے ہیں صرف اسی ایک بات سے اس زمانے کے ماہر انجینئروں کی فنی مہارت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ مسجد کے باہر کے حصے میں گیارہ محرابیں اور سنگ مرمر کے بنے ہوئے آٹھ منارے ہیں ان کے علاوہ تین بڑے گنبد بھی ہیں جو سنگ سرخ اور سنگ مرمر سے تیار کیے گئے ہیں۔

مسجد کا اندرونی فرش سفید سنگ مرمر کا ہے جس میں سیاہ دھاریاں ہیں ان سیاہ دھاریوں سے نماز پڑھتے وقت سیدھی صفیں بنانے میں مدد ملتی ہے اندرونی دیواروں اور محرابوں پر بھی خوبصورت نقش و نگار بنائے گئے ہیں جس سے اس زمانے کے کاریگروں کی اپنے فن میں مہارت کا

اندازہ ہوتا ہے مسجد کے دروازے کے ٹھیک سامنے ''حضوری باغ'' ہے جس کے اندر سکھوں نے بارہ دری کے نام سے ایک عمارت بنوائی یہ بھی سفید سنگ مرمر سے بنی ہوئی ہے مسجد کے دروازے کے ساتھ ہی پاکستان کے تصور کے خالق علامہ اقبال کا مزار ہے جو اگر چہ بہت چھوٹا سا ہے لیکن اپنی عظمت اور خوبصورتی میں کسی سے کم نہیں۔

اس عظیم الشان مسجد کو دیکھنے کے لیے روزانہ سینکڑوں کی تعداد میں سیاح دور ونزدیک کا سفر طے کر کے یہاں آتے ہیں خصوصاً اسلامی ممالک کے وزرائے اعظم صدر صاحبان اور دیگر معزز وفود کے دروۂ لاہور کے موقعہ پر شاہی مسجد کی زیارت دورے کا اہم اور لازمی حصہ شمار کی جاتی ہے اب تک بیشتر اسلامی ممالک کے رہنما اور لیڈر جن میں سعودی عرب، لیبیا، اردن، ایران، مصر، شام، کویت، متحدہ عرب امارات، سوڈان، انڈونیشیا، ترکی، ملائیشیا، اور بنگلہ دیش وغیرہ کے رہنماء اور وفود شامل ہیں۔اس عالمی مسجد کی زیارت کا شرف حاصل کر چکے ہیں۔

○

شاہی قلعہ، لاہور

لاہور میں موجود شاہی قلعہ سے پہلے یہاں ایک کچا قلعہ تھا۔شہنشاہ اکبر نے اسے گرا کر اس جگہ نئے سرے سے ایک عالیشان پختہ قلعہ بنوایا۔اکبر کے بعد جہانگیر نے اس میں کئی ایک عمارتیں تعمیر کروائیں کہتے ہیں کہ انصاف کی زنجیر اس قلعہ میں تھی جیسے بجا کر فریادی بادشاہ سے انصاف طلب کرتے تھے۔ جہانگیر اور نور جہاں نے اپنی زندگی کے آخری ایام اسی قلعے میں گزارے پھر ان کے بعد شاہ جہاں نے اسے کافی ترقی دی۔

پہلے دریائے راوی قلعے کی دیوار کے ساتھ بہتا تھا اور بادشاہ روشن جھروکے میں بیٹھ کر صبح کے وقت دریا کا نظارہ کرتا تھا مگر جب مغل دور حکومت ختم ہو گیا اور دریائے راوی کا نظارہ کرنے والے بھی مر کھپ گئے تو شاید اس غم میں راوی نے بھی اپنا رخ بدل لیا۔اب وہ قلعہ سے دو میل دور بہتا ہے قلعے کا بیرونی حصہ پچی کاری کے نہایت ہی خوبصورت نمونوں سے مزین ہے اس پر جا بجا انسانوں،گھوڑوں اور ہاتھیوں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔

قلعے کے اردگرد ایک اونچی سی فصیل ہے جس کے تین بڑے دروازے ہیں ایک مشرق کی سمت، دوسرا جنوب کی سمت، اور تیسرا شمال مغرب کی جانب،شمال مغربی دروازے ہی سے بادشاہ اور بیگمات ہاتھی پر سوار ہو کر گزرتے تھے اس دروازے پر شاہ جہاں کا نام کندہ ہے یہ دروازہ انگریزوں کے حکم سے بند کر دیا گیا تھا۔مگر 20 نومبر 1949ء کو سابق گورنر پنجاب نے پورے تین سو سال بعد اسے دوبارہ کھلوا دیا۔

قلعے کے اندر ایک دیوان ہے جس کی چھت ستونوں کے سہارے کھڑی ہے اسے دیوان عام کہتے ہیں اس میں ایک جھروکا بنا ہوا ہے جہاں بیٹھ کر شاہ جہان اپنی رعایا کو اپنا دیدار کراتا تھا۔

دیوان خاص بادشاہ کا شاہی دربار تھا جہاں وہ اپنے وزیروں مشیروں،شہزادوں اور دوسرے راجاؤں مہاراجوں سے ملاقات کیا کرتا تھا اور سلطنت کے بارے میں صلاح مشورہ لیتا تھا۔جب

بادشاہ کی سواری دیوان خاص میں پہنچتی تھی تو چوبدار نقارے پر چوٹ لگا کر یہ اطلاع دیتا تھا کہ شاہی سواری آ رہی ہے تمام محافظ دستے ہوشیار ہو جاتے پھر بادشاہ ''باادب باملاحظہ ہوشیار'' کے نعروں کے درمیان دیوان خاص میں داخل ہوتا اس وقت تمام لوگ ادب سے کھڑے ہو کر کورنش بجالاتے پھر بادشاہ تخت شاہی پر بیٹھ جاتا اور ہاتھ کے اشارے سے درباریوں کو اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھنے کی اجازت دے دیتا۔

قلعے کے اندر ایک شیش محل ہے جو فن تعمیر اور فن نقاشی کا بہترین نمونہ ہے اس کی دیواریں اور چھتیں رنگ برنگ کے شیشوں اور پچکاری کے کام سے مزین ہیں ان کی چمک دمک آنکھوں کو چندھیا دیتی ہے اب بھی شیش محل کے کسی کمرے میں دیا سلائی روشن کی جائے تو تمام کمرہ جھلمل جھلمل کرنے لگتا ہے کہتے ہیں کہ اسے شاہ جہاں نے تعمیر کروایا تھا۔

شیش محل کے قریب ہی موتی مسجد ہے یہ بھی فن تعمیر کا ایک دلکش نمونہ ہے اسے جہانگیر نے شاہی بیگمات کے لیے تعمیر کروایا تھا تا کہ وہ اس مسجد میں باپردہ نماز ادا کرسکیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنی حکومت کے زمانے میں اس قلعہ پر قبضہ کیا تو اس نے موتی مسجد کا نام بدل کر ''موتی مندر'' رکھ دیا تھا اگرچہ سکھوں نے مسجد سے قیمتی ہیرے جواہرات نکال کر اس کی خوبصورتی کو سخت نقصان پہنچایا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی عظمت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے۔

قلعے کے اندر ایک چھوٹا سا میوزیم بھی ہے جس میں بہت سی نادر اشیاء محفوظ ہیں بہت سی الماریوں میں پرانے زمانے کے اوزار، اسلحہ، تصویریں اور لباس وغیرہ بڑے قرینے سے سجائے گئے ہیں اتنی مدت گزر جانے کے باوجود بھی ان چیزوں کی سج دھج میں کوئی فرق نہیں آیا۔

شاہی قلعہ، مغل بادشاہوں کی وہ قیمتی یادگار ہے جو ہمیشہ آنے والی نسلوں کو ان کے شاہانہ دبدبے اور شان وشوکت کی یاد دلاتی رہے گی۔

ملکی وغیر ملکی سیاحوں کی کثیر تعداد اس قلعہ کو دور دور سے دیکھنے کے لیے آتے ہیں خصوصاً سکول وکالجوں اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس میں کئی سامان موجود ہیں۔

○

شالامار باغ، لاہور

مغل بادشاہ شاہ جہاں نے جب لاہور میں دربار لگایا تو علی مردان خان نے اسے بتایا کہ اس کے پاس ایک ایسا شخص موجود ہے جو نہر بنانے میں بڑی مہارت رکھتا ہے۔ شاہ جہاں نے خوش ہو کر حکم دیا کہ دریائے راوی سے ایک نہر نکال کر لاہور کے پاس سے گذاری جائے۔ شاہ جہاں پھر لاہور آیا تو نہر مکمل ہو چکی تھی بادشاہ نے حکم دیا کہ اس نہر کے کنارے ایک وسیع و عریض اور بہت خوبصورت باغ بنایا جائے اور اس باغ میں بارہ دری شاہی غسل خانے فوارے اور پھل دار درخت لگائے جائیں بادشاہ نے اس کام کے لیے خلیل اللہ خان کو معاون خصوصی مقرر کیا۔ لہٰذا خلیل اللہ خان نے ملک کے کئی اور افسروں کو ساتھ لگا کر اس باغ کی تعمیر شروع کرا دی۔ باغ کے لیے درختوں کے پودے قندھار اور کابل سے منگوائے گئے یہ باغ شالامار تھا جو اسی (80) ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا ہے اس کا سنگ بنیاد 1637ء میں رکھا گیا اس پر کل لاگت اس وقت چھ لاکھ روپے آئی تھی اور ڈیڑھ سال کے عرصہ میں یہ مکمل ہوا تھا۔

شالامار باغ کے نام کے متعلق کئی باتیں مشہور ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ شاہ جہاں نے اس باغ کا کوئی اور نام رکھا تھا لیکن عام لوگوں نے اسے شالامار باغ کے نام سے یاد کرنا شروع کر دیا۔ دراصل شروع میں اس کا نام شعلہ ماہ تھا جس کے معنی ہیں چاند کی روشنی۔ اس باغ کی خوبصورتی کی وجہ سے اسے چاند کا شعلہ کہا جاتا تھا بعد میں شعلہ ماہ سے بگڑ کر شالامار باغ ہو گیا۔ بعض لوگوں کے خیال میں یہ نام خود شاہ جہاں نے تجویز کیا تھا۔

مشہور ہے کہ ایک بادشاہ کشمیر گیا تو اس نے وہاں ایک خوبصورت جگہ پر ایک باغ بنوانے کا حکم دیا تھا بعد میں اس بادشاہ نے دیکھا کہ اس جگہ پر شکاری کتے نے ایک گیدڑ کو منہ میں دبوچ رکھا ہے کشمیری زبان میں گیدڑ کو شالا اور شکاری کتے کو مار کہتے ہیں لہٰذا وہاں جو باغ بنوایا گیا اس کا نام شالامار باغ رکھا گیا۔

شاہ جہاں نے لاہور کے قریب جو باغ لگوایا اس کا نقشہ کشمیر والے باغ کے نقشے کے مطابق تھا لہٰذا اس کا نام بھی شالا مار باغ رکھ دیا گیا۔ باغ میں تین خطے رکھے گئے تھے۔ تینوں خطے تین الگ الگ باغ ہیں جس کے نام فیض بخش، حیات بخش اور تیسرا فرح بخش ہیں یہ خطے یا باغ ایک دوسرے سے بارہ یا تیرہ فٹ کی بلندی پر واقع ہیں ہر اونچے خطے سے نیچے اترنے کے لیے خوبصورت سیڑھیاں بنی ہوئیں ہیں۔ باغ میں ایک دلکش تالاب بنا ہوا ہے۔ جس میں بہت سے فوارے لگے ہوئے ہیں فواروں کا پانی سنگ مرمر کے حوضوں میں گرتا ہے یہ فوارے گرمیوں کے موسم میں جگہ ٹھنڈی رکھنے کے لیے لگوائے گئے تھے یہاں پر خوبصورت سنگ مرمر کی بارہ دریاں بنائی گئی ہیں بادشاہ ان بارہ دریوں میں بیٹھ کر برسات کا نظارہ کیا کرتا تھا۔

باغ کے اس حصے میں جسے حیات بخش کہتے ہیں سنگ مرمر کا ایک بہت ہی خوشنما تخت بنوایا گیا شاہ جہاں اس تخت پر بیٹھ کر اپنا دربار لگایا کرتا تھا کچھ فاصلے پر سنگ مرمر کا ایک آبشار بنا ہوا ہے کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کی بیٹی زیب النساء کو اس آبشار کے پاس بیٹھنے کا بڑا شوق تھا زیب النساء چونکہ بڑی اچھی شاعرہ تھی اس لیے اکثر اس حسین جگہ پر بیٹھ کر شعر کہا کرتی تھی۔

شالا مار باغ میں شاہ جہاں نے اپنے لیے حمام بھی بنوایا تھا حمام کے تین حصے تھے ایک حصے میں دو فوارے اور دوسرے حصے میں حوض تھا اس حوض میں گرم اور ٹھنڈا دونوں طرح کا پانی لایا جاتا تھا سنگ مرمر کے کئی طاقچے چراغ رکھنے کے لیے بنوائے گئے تھے جب یہاں چراغ چلائے جاتے تو حوض میں گرنے والا پانی بارش کا سماں پیدا کرتا اور چراغ کی روشنی بجلی کی چمک کی طرح معلوم ہوتی بادشا اس نظارے سے بہت لطف اٹھاتا تھا باغ فرخ بخش جسے پائیں باغ بھی کہا جاتا تھا حیات سے نیچے بنا ہوا ہے شالا مار باغ میں بہت سے پھلدار درخت لگے ہوئے ہیں موسم گرما میں یہ پھل لاہور کے بازاروں میں خوب ملتے ہیں۔

باغ کی سیر کرنے کے لیے لوگ دور دراز سے آتے ہیں بہار کے شروع میں یہاں میلہ چراغاں لگتا ہے جو پنجاب کا سب سے بڑا میلہ ہے شہر اور ارد گرد کے دیہات سے لاکھوں آدمی اس میلے میں شامل ہونے کے لیے گاتے بجاتے اور ناچتے ہوئے آتے ہیں یہاں سینکڑوں چھوٹے بڑے شامیانے لگتے ہیں جن کے اندر اور باہر لوگ اپنی اپنی توفیق کے مطابق خوشیاں مناتے ہیں۔

لاہور کا شالیمار باغ، دنیا کے عظیم الشان باغوں میں شمار ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب کسی

دوست ملک کا سربراہ یا کوئی نامور شخصیت پاکستان کے دورے پر آتی ہے تو لاہور میں شالا مار باغ کی سیاحت اس کا لازمی حصہ شمار ہوتی ہے اس باغ میں معزز مہمان کو شہریوں کی طرف سے استقبالیہ دیا جاتا ہے ہزاروں شہری معزز مہمان سے ملتے اور اس سے بات چیت کرتے ہیں۔

معزز مہمان کو شالا مار باغ میں دعوت دینے کی رسم انگریز حکومت کے زمانے میں بھی رائج رہی چنانچہ 1876ء میں شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم جو اس وقت پرنس آف ویلز ولی عہد سلطنت تھے برصغیر کی سیاحت کے سلسلے میں لاہور آئے تو ان کے اعزاز میں پنجاب کے گورنر نے شالا مار باغ میں رات کے وقت ایک عظیم الشان دعوت دی اس موقعہ پر باغ میں اس قدر روشنی کی گئی کہ رات پر دن کا گمان ہوتا تھا۔ 1907ء میں شاہ افغانستان امیر حبیب اللہ خان مرحوم کو قیام لاہور کے دوران یہاں کے گورنر نے شالا مار باغ میں شاندار دعوت دی تھی شہنشاہ جارج پنجم شہزادگی کے زمانے میں لاہور آئے تھے تو انہوں نے بھی شالا مار باغ کی سیر کی تھی۔

1950ء میں شہنشاہ ایران پاکستان آئے تو شالا مار باغ کو خوب سنوارا گیا اس موقعہ پر شالا مار باغ کا حسن اور جوبن اپنے عروج پر تھا اس طرح برطانیہ کی تاجدار ملکہ الزبتھ، ترکی کے سابق صدر جلال بابا، چین کے وزیر اعظم چواین لائی، انڈونیشیا کے مرحوم صدر ڈاکٹر احمد سوئیکارنو امریکہ کے سابق صدر کینڈی سعودی عرب کے سابق فرمانروا شاہ سعود بن عبدالعزیز اور چین کے سابق صدر لیوستاؤچی تشریف لائے تو ان سب کا شالا مار باغ میں شاندار استقبال کیا گیا ان میں سے ہر ایک نے شالا مار باغ کی خوبصورتی اور لاہور کے شہریوں کی مہمان نوازی کی بہت تعریف کی۔

یہ باغ مغل بادشاہوں کی عظمت کی منہ بولتی یادگار ہے اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو نے ثقافتی ورثے کی بقاء تحفظ کے لیے پاکستان کے اس عظیم الشان باغ کے لیے سالانہ گرانٹ مختص کی ہوئی ہے۔

○

مقبرہ جہانگیر، لاہور

مشہور مغل بادشاہ ظہیرالدین بابر نے مرتے وقت یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اس کی قبر کھلی جگہ پر بنائی جائے اس کی قبر پر بارش اور شبنم کے قطرے گرتے رہیں۔ جہانگیر نے بھی اپنی موت کے وقت کچھ اس طرح کی وصیت کی تھی جہانگیر نے یہ بھی کہا کہ اس کی قبر ملکہ نور جہاں کی قبر کے پاس بنائی جائے چنانچہ جہانگیر کی خواہش کے مطابق اس کی لاش راوی کے کنارے نور جہاں کے باغ دلکشاء میں دفن کی گئی بعد میں شاہ جہاں نے اپنے باپ کا شاندار مقبرہ بنوایا۔ یہ مقبرہ اپنی خوبصورتی کے لحاظ سے لاہور کی عمارتوں میں خاص امتیاز رکھتا ہے یہ عمارت سنگ سرخ سے بنی ہے اور ایک سو گز ہے اس کی تعمیر میں دس سال کا عرصہ لگا اور دس لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔

مقبرے میں داخل ہونے کے لیے شمال اور جنوب میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے دو دروازے بنے ہوئے ہیں یہ دروازے ایک وسیع احاطے میں کھلتے ہیں اس احاطے کو ''کاروان سرائے'' کہا جاتا ہے یہاں سیاحوں اور ان لوگوں کے ٹھہرنے کے لیے کمرے بنے ہوئے ہیں جو مقبرہ دیکھنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ اس احاطے کے بعد دوسرا خوبصورت احاطہ شروع ہوتا ہے یہاں نہایت خوشنما باغ لگا ہوا ہے یہ احاطہ چھ سو مربع گز میں پھیلا ہوا ہے اس کے درمیان میں ایک نہر چلتی ہے جہاں کئی فوارے لگے ہوئے تھے افسوس کہ اب یہ فوارے ویران ہو چکے ہیں۔ باغ میں سے ہوتا ہوا ایک راستہ مقبرے کی طرف جاتا ہے مقبرہ سنگ مرمر کے چبوترے پر ہے۔

دیواریں دل لبھانے والی تصویروں، نقش و نگار اور قرآن مجید کی آیات سے سجی ہوئی ہیں جگہ چبوترے کے چاروں طرف غلام گردش بنی ہوئی ہیں۔

عمارت کے عین درمیان میں بادشاہ کی قبر ہے چبوترے کے نیچے مقبرے کے تمام اندرونی حصے پر سنگ مرمر اور سنگ مریم سے گل بوٹے بنائے گئے ہیں چبوترے کے دونوں طرف بلند سیڑھیاں بڑی خوبصورت بنی ہوئی ہیں ان سیڑھیوں پر چھتیں بھی ہیں۔

عمارت کے چاروں کونوں میں اونچے اونچے مینار ہیں ہر مینار کی چار منزلیں ہیں میناروں پر چڑھنے کے لیے خوبصورت زینے بنے ہوئے ہیں میناروں پر سے اردگرد کا منظر بہت خوبصورت نظر آتا ہے ایک طرف دریائے راوی ہے دوسری طرف بادشاہی مسجد اور مسجد وزیر خان کی بلند عمارتیں ہیں۔شاہ جہاں جب بھی لاہور آتا اس مقبرے پر ضرور جاتا۔

مقبرے کے اردگرد بہت بڑا باغ ہے جس میں جا بجا نہریں اور گھاس کے خوبصورت لان ہیں جس پر بیٹھ کر دوستوں کی ٹولیاں پکنک کا لطف اٹھاتی ہیں اس مقبرے میں سرو کے درخت عام ہیں آم اور کھجوروں کے پیڑ بھی کثرت سے ہیں لاہور کے اکثر لوگ سیر و تفریح کے لیے یہاں آتے ہیں خاص کر عیدین یا خاص تہواروں کے موقع پر یہاں بہت چہل پہل ہوتی ہے۔

جہانگیر کا مقبرہ قابل دید تاریخی عمارت ہے اس کے صدر دروازے کے قریب ہی اور مسجد کے پیچھے جہانگیر کی ملکۂ نور جہاں کے بھائی آصف جاہ کا مقبرہ ہے۔

○

چڑیا گھر، لاہور

پاکستان کے سب سے بڑے صوبہ پنجاب کے دارالحکومت لاہور میں واقع تاریخی وتفریحی مقامات میں لاہور چڑیا گھر خاص اہمیت کا حامل ہے۔لاہور کے چڑیا گھر کی 125 سالہ تاریخ پر نگاہ ڈورائی جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ اس چڑیا گھر کو دیکھنے کے لیے نہ صرف پاکستان بھر کے سیاح ہر سال دور دراز کا سفر طے کرتے ہیں بلکہ غیر ملکی سیاحوں کی ایک بہت بڑی تعداد یہاں کھینچی چلی آتی ہے جس کا اندازہ اس ادارے کی وزٹیرز بک اور ٹکٹ کی فروخت سے باخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

قیام پاکستان سے قبل لاہور کا چڑیا گھر ہندوستان کے مشہور چڑیا گھروں میں سے ایک تھا لاہور چڑیا گھر اس وقت کے گورنر پنجاب سر رابرٹ ڈیوس کے دور میں 1872ء میں سے پہلے قائم کیا گیا یہ مختصر سا چڑیا گھر دراصل لارنس گارڈن (باغ جناح) کے ایک گوشے میں 124 ایکڑ کے رقبہ پر قائم کیا گیا تھا پہلے پہل یہاں چھوٹے جانور اور پرندے رکھے گئے۔124 ایکڑ رقبے پر محیط اس چڑیا گھر کو ''میاں میر نہر'' سے پانی مہیا کیا جاتا تھا اس کا انتظام لاہور میونسپل کمیٹی کے سپرد تھا اور ڈپٹی کمشنر بھی اس کا چیئر مین ہوتا تھا اس زمانے کے راجے مہاراجے روساء اور انگریز حکام چڑیا گھر سے دلچسپی رکھتے تھے چنانچہ وہ جانوروں اور پرندوں کے عطیات دینے کے ساتھ ساتھ ان کے لیے عمارتیں اور پنجرے بھی بنوا کر دیتے اس طرح ایک ہشت پہلو پنجرہ جو چڑیا گھر میں 1872ء میں لالہ میلا رام نام کے ایک شخص نے بنوا کر میونسپل کمیٹی کے سپرد کیا تھا اب تک اس کا کتبہ موجود ہے یہ قیمتی اثاثہ موجودہ چڑیا گھر کی انتظامیہ نے مین گیٹ پر سنگ مرمر کے دو خوبصورت ستونوں پر آویزاں کر دیا ہے تاکہ چڑیا گھر کی تاریخی حیثیت ہمیشہ قائم رہے۔

کچھ عرصہ لاہور چڑیا گھر میں میونسپل کمیٹی لاہور کے ماتحت رہا بعدازاں اس کے انتظامی امور کے زیرِ انتظام چل رہا ہے۔ لائیو سٹاک پنجاب کے 1982ء لاہور چڑیا گھر محکمہ وائلڈ لائف 3 کروڑ کے فنڈز سے 1985ء سے 1988ء تک لاہور چڑیا گھر کے جزوی حصوں کی نئے سرے سے تعمیر و مرمت کی گئی۔ لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی نے لاہور چڑیا گھر کی اراضی کی موجودہ سرکاری قیمت 3راب 37 کروڑ روپے لگائی ہے جبکہ پرائیویٹ طور پر اس کی قیمت اس سے کئی گناہ زیادہ ہے۔ لاہور چڑیا گھر کے پہلے باقاعدہ کیورٹیر لیفٹیننٹ کرنل (ر) اے پی کریک لوی A.P.Krickliway تھے جو 15 مارچ 1941ء سے 23 فروری 1950ء تک اس عہدے پر فرائض سرانجام دیتے رہے وہ دوبارہ یکم جنوری 1952ء سے 16 اگست 1962ء تک اس عہدے پر براجمان رہے اس طرح اے پی کریک لوی نے لاہور چڑیا گھر میں سب سے زیادہ عرصہ بطور سربراہ کام کیا۔ ان کے علاوہ 9 مزید کیورٹرز نے 18 دسمبر 1974ء تک چڑیا گھر میں خدمت انجام دیں یکم ستمبر 1976 کو پہلے بطور ڈائریکٹر لاہور چڑیا گھر سعید اصغر نے اپنے عہدے کا چارج لیا تو کیورٹر کا عہدہ ختم کر دیا ان کے بعد 8 مزید ڈائریکٹر آئے۔

ایک بلاک جون 1923ء میں کرنل سر عمر حیات ٹوانہ نے بنوا کر دیا اس کے علاوہ سر ہربرٹ ایمرسن جو کہ پنجاب کا گورنر تھا اس کے بیٹے نے نوشہرہ سے ایک ریچھ تحفے میں بھیجا۔ دو ریچھ والئی سوات نے عطیہ دیئے۔ نواب بہاولپور نے بھی 1952ء میں ایک نادر طوطا تحفتاً دیا اس کے علاوہ یوگنڈا کے سابق صدر عدی امین نے شیر بطور تحفہ دیئے۔ 1999ء میں عریبین اوریکس متحدہ عرب امارت سے تحفہ میں آئے علاوہ ازیں مختلف پرندے اور چھوٹے جانور کو اکثر شکاری حضرات اور جانوروں کے شائقین بھی چڑیا گھر کو پیش کرتے رہتے ہیں۔

چڑیا گھر کی تعمیر کا دوسرا مرحلہ بیرم گلارنسی کی گورنری کے دور میں 1942 کو مکمل ہوا اور چڑیا گھر کی توسیع کے علاوہ عمارات کی بھی تعمیر ہوئی اور اس کے گرد خاردار تار لگا کر حدود متعین کر دی گئی دوسری عالمی جنگ کے بعد لاہور چڑیا گھر کے لیے سرکاری گرانٹ بند کر دی گئی اور یہاں داخلے پر ٹکٹ لگا دیا گیا پاکستان کے قیام کے بعد اس پر مزید توجہ دی گئی۔

لکھی رانی نامی ہتھنی سابق مشرقی پاکستان سے لائی گئی تھی جنوری 1987ء میں ''لکھی رانی''
کی موت کے بعد چڑیا گھر بالکل سونا ہوگیا چنانچہ اس کی رونقوں کو دوبالا کرنے کے لیے 20 مئی
1988 کو ایک نئی ہتھنی ''سوزی'' منگوائی گئی۔ افریقن نسل کی اس 5 سالہ ہتھنی کا وزن 1000 کلوگرام
قد 5 فٹ تھا یہ صرف انگریزی اور فرانسیسی زبانیں سمجھی تھی۔ سوزی بلجیئم سے تقریباً 23 ہزار پانچ سو
ڈالر (4-لاکھ سولہ ہزار روپے) میں حاصل کی گئی اسے پیار سے ریلے ریلے کہتے تھے۔

سوزی کو پی آئی اے کے چارٹرڈ طیارے پی کے 804 کے ذریعے لاہور لایا گیا اس کی خوب دیکھ بھال کی جاتی ہے کیونکہ بلجیئم کے میونروز والوجیکل پارک نے اس کے صحت کے سرٹیفکیٹ میں اسے دھوپ سے بچانے کے لیے خاص طور پر ہدایت کی ہے چڑیا گھر کے ہاتھی گھر میں اسے پرانے مہاوت تربیت کرتے ہیں۔ بیسیوں کے حساب سے دیگر جانور اور پرندے جن میں دریائی گھوڑا، گینڈا، زیبرا، شترمرغ، اور لاتعداد جانور مقامی ہیں بندر کی ایک نایاب نسل اسپائیڈر منکی اور ہرن ڈیوڈ ئیر، ماؤس ڈیئر اور خوبصورت پرندہ ان بل بھی یہاں موجود ہیں یہاں چڑیا گھر کی تعمیر نو کا تیسرا دور مکمل ہو چکا ہے اس سلسلے میں یہاں نئے جنگلے لگائے گئے ہیں اس کے بیرونی دروازے اور دیواریں بنائی گئی ہیں۔ شاہراہ قائداعظم کی طرف مین گیسٹ کے ساتھ مصنوعی جانور بنا کر نصب کیے گئے ہیں چڑیا گھر کے اندر فوارے بنائے گئے ہیں جانوروں کے رہنے کے لیے ان کے ماحول کے مطابق نئی اور بہتر عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں اس کے علاوہ پورے چڑیا گھر میں سپیکر لگا دیئے گئے ہیں جن سے صبح کا آغاز تلاوت قرآن پاک سے شروع ہوتا ہے بعد میں علاقائی لوک گیتوں کی دھن کے علاوہ مختلف اعلانات بھی نشر کیے جاتے ہیں معذور افراد کی سہولت کے لیے وھیل چیئرز بھی چڑیا گھر کی سیر کے لیے مفت فراہم کی جاتی ہیں۔

لاہور چڑیا گھر میں اس وقت 733 پرندے اور جانور موجود ہیں ان میں 303 چلنے والے 44 رینگنے والے جانوروں کے علاوہ 303 نایاب پرندے بھی شامل ہیں 34 کے قریب گوشت خور جانور ہیں ان پرندوں اور جانوروں کی دیکھ بھال کے لیے دو ڈاکٹرز اور 111 کے قریب ملازمین کام کر رہے ہیں۔ چڑیا گھر میں ہر سال لاکھوں ملکی و غیر ملکی سیاح تفریح کی غرض سے آتے ہیں جن

میں بڑی تعداد بچوں کی ہوتی ہے سکول و کالج کی طرف سے گروپ کی صورت میں آنے والے طالب علموں کے لیے چڑیا گھر کی انتظامیہ کی طرف سے 50فی صد تک داخلہ ٹکٹ پر خصوصی رعایت رکھی گئی ہے۔ 1985 سے 96-1995 گیارہ سالوں کے اعداد و شمار کے مطابق لاہور چڑیا گھر میں ایک کروڑ 96لاکھ 60ہزار 914سیاح تفریح کے لیے آئے ان میں 1 کروڑ 44لاکھ 93ہزار 208بڑی عمر کے افراد اور بچوں کی تعداد 51لاکھ 67ہزار 706 تھی۔

ان گیارہ سالوں میں لاہور چڑیا گھر کی آمدن 11 کروڑ 53لاکھ 35ہزار 650رہی ان میں سے 9 کروڑ 22لاکھ 1ہزار 70روپے مختلف مد میں خرچ کیے گئے یہ بات توجہ طلب ہے کہ چڑیا گھر کا شمار ان اداروں میں ہوتا ہے جو اپنا نظم و نسق خود چلاتے ہیں اور حاصل شدہ آمدن سے ملازمین کی تنخواہیں، پنشن، پرندوں و جانوروں کی خوراک، صحت، اور چڑیا گھر کی تعمیر و مرمت وغیرہ کے معاملات چلائے جاتے ہیں لاہور چڑیا گھر کی آمدن کا زیادہ تر دارومدار انٹری ٹکٹوں اور مختلف ٹھیکہ جات پر ہے جن میں کینٹین، پارکنگ، اور بچوں کی کی تفریحی کے لیے لگائے جانے والے کڈی رائیڈ کے ٹھیکے شامل ہیں۔

لاہور کے اس تاریخی چڑیا گھر میں کئی نامور سیاسی، سماجی اور عالمی شہرت کی حامل شخصیات نے سیر کی اور اس کے عمدہ نظم و نسق کی تعریف کی ہے۔ انتظامیہ کا کہنا ہے کہ چڑیا گھر کے اندر جدید لیبارٹری، ایجوکیشن سنٹر، آڈیٹوریم کا قیام، پرانے شیر گھر، ریچھ گھر، سانپ، چیتاء اور بند گھروں کی از سر نو مرمت کی جائے گی۔ یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ لاہور چڑیا گھر نے اپنی 125 سالہ تاریخ میں کروڑوں لوگوں کو تفریح کے مواقع فراہم کیے اور ہر سال لاکھوں لوگوں کے دل بہلا رہا ہے۔

ہر سال دنیا بھر میں جب ڈبلیو ڈبلیو ایف کا عالمی دن منایا جاتا ہے تب لاہور چڑیا گھر میں بھی ایک شاندار تقریب منعقد کی جاتی ہے جس میں سکولوں کے بچوں کو چڑیا گھر کی مفت سیر کروائی جاتی ہے اور اس دن کی اہمیت کے پیش نظر جانوروں اور پرندوں کی بقاء اور حفاظت پر ماہرین کی زیر نگرانی سیمینار منعقد کیا جاتا ہے اس موقع پر حاضرین میں ڈبلیو ڈبلیو ایف کے پوسٹرز، کیلینڈر اور معلوماتی کتابچے تقسیم کیے جاتے ہیں۔

لاہور کا چڑیا گھر، برصغیر کے بہترین چڑیا گھروں میں شمار کیا جاتا رہا ہے اسے عوامی تفریح گاہ کی حیثیت حاصل ہے۔ 1872 میں لیفٹیننٹ گورنر سر رابرٹ ڈیوس کے دور میں یہ چڑیا گھر قائم ہوا اس وقت چڑیا گھر کی صورت آج کے چڑیا گھر سے بہت مختلف تھی یہ تھوڑے رقبے میں قائم ہوا تھا بعد میں ترقی و توسیع ہوتے ہوئے 1942ء میں یہ اس صورت کو پہنچا جس میں ہم اس کو آج دیکھتے ہیں موجودہ چڑیا گھر کا رقبہ 24 ایکڑ پر مشتمل ہے اس احاطے میں عجیب وغریب جانوروں کا وہ انبوہ کثیر ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے چڑیا گھر کے ڈائریکٹر کے مطابق یہاں پر 1381 کے قریب 137 مختلف اقسام کے جانور موجود ہیں جانوروں اور عمارت کی دیکھ بھال کے لیے تقریباً 2 کروڑ روپے سالانہ خرچ کے لیے جاتے ہیں ابتداء میں یہ میونسپلٹی کے تحت کام کرتا تھا اب وائلڈ لائف کے تحت کام کرتا ہے۔ چڑیا گھر سے تقریباً 6 کروڑ سالانہ منافع آمدنی ہوتی ہے۔

○

باغ جناح، لاہور

کسی قوم کی نفاست طبع کا اندازہ لگانا ہوتو اس کے باغات میں چلے جایئے اور ویسے بھی اب تو کوئی بات مکمل نہیں ہوتی تحفظ ماحول کے بغیر۔اور ماحول کی حفاظت لازم وملزوم ہے سبزہ گل سے۔

وطن عزیز اور خصوصاً لاہور اس معاملے میں بڑا خوش قسمت واقع ہے باغات کا شہر، پاکستان کا دل اور شہروں کا یہ شہرہ سبزہ وگل کی دولت سے مالا مال ہے یوں تو شہر لاہور بہت سے خوبصورت اور وسیع باغات سے بھرا پڑا ہے لیکن اپنی گل رنگ خوبصورتی اور تاریخی حیثیت کے اعتبار سے جو امتیاز باغ جناح کو حاصل ہے وہ کسی اور باغ کے حصے کی بات نہیں۔آج بھی اس دلفریب شہر میں پارکوں کے علاوہ جابجا خوبصورت فواروں کا اضافہ جاری ہے اس شہر بے مثال میں جو بھی آیا اس کی ''زلف کا اسیر'' ہوگیا انگریز دور میں جہاں لاہور کے لاتعداد باغ اُجاڑ دیئے گئے وہیں چند ایک کا اضافہ بھی ہوا انہیں میں سے ایک ''لارنس گارڈن'' تھا جسے آج ''باغ جناح'' کہا جاتا ہے باغ کے ایک جانب کی معروف شاہراہ اب بھی ''لارنس روڈ'' کہلاتی ہے۔گورنر ہاؤس سے مقابل واقع اس باغ کا شمار بڑے بڑے باغات میں ہوتا ہے۔

باغ جناح کا رقبہ تقریباً 141 ایکڑ ہے باغ کی تعمیر سے قبل یہ جگہ بالکل اُجاڑ تھی۔ ایگری ہارٹی کلچرل سوسائٹی نے 1862ء میں یہاں پر چھوٹا سا باغ بنوایا۔1868ء تک مزید بہت سی جگہ کو ہموار کر کے باغ کو خوبصورت اور وسیع بنا دیا گیا۔ باغ کا ایک حصہ محکمہ زراعت و باغبانی اور گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کے شعبہ باٹنی کو نباتات پہ تحقیق کے لیے دے دیا گیا۔ جبکہ ایک حصہ میں 1872ء میں زوالوجیکل گارڈن چڑیا گھر قائم کیا گیا باغ کا باقی حصہ عوام کی تفریح کے لیے مختص کر دیا

گیا۔ جس کا انتظام کارپوریشن کے ہاتھ میں تھا باغ کو سیراب کرنے کے لیے اپر باری دوآب سے ایک شاخ نکالی گئی باغ کے فالتو ملبے سے تین پہاڑیاں بنائی گئیں ان میں سے ایک پہاڑی سر سکندر حیات خاں اور دوسری سر فضل حسین کے نام سے منسوب ہے جبکہ تیسری پہاڑی پر اوپن ائیر تھیٹر قائم ہے اس کے جنوب میں ''گلستان فاطمہ'' ہے جو اپنی سجاوٹ، نفاست، اور دلکشی کے باعث باغ کا دل کہلاتا ہے یہاں گلاب کی اقسام موجود ہیں اس حصے کو شالا مار باغ کی طرح تخت دار بنایا گیا ہے اس کا پہلا قطعہ ساڑھے چار فٹ نیچے ہے یہاں گلاب کے قطعے، مور پنکھ کے تراشیدہ پودے، بیلوں سے ڈھکے ستون، محرابی دروازے، پتوں سے بنا پاکستانی پرچم اور مور کے سروں والی نشستیں مل کر بہت حسین منظر پیش کرتے ہیں اس کے قریب ہی ایک لائبریری اور مسجد دارالسلام ہے باغ کا ایک گوشہ ایک بزرگ ''پیر ترت مراد'' کے مزار سے آباد اور بارونق ہے۔

شاہراہ قائداعظم کی جانب سے باغ میں دو نہایت پُرشکوہ سفید عمارتیں ہیں جن میں سے ایک لارنس ہال ہے جو 62-1861ء ہی انگریزوں کے چندے سے بنایا گیا۔ /34000 روپے کی لاگت سے بنی یہ عمارت پنجاب کے پہلے لیفٹیننٹ گورنر سر جان لارنس کی یادگار ہے اس کا ڈیزائن مسٹر جی سٹون سول انجینئر نے بنایا اس کے ساتھ والی بڑی عمارت جو کہ عین سڑک کے سامنے ہے ''منٹگمری ہال'' کہلاتی تھی یہ عمارت بھی انگریز اور ہندوستانی امراء کے عطیات سے بنائی گئی۔ یہ ہال آج کل لائبریری کے طور پر قائداعظم لائبریری کے نام سے زیر استعمال ہیں۔

باغ میں جو اونچی اونچی پہاڑیاں نظر آتی ہیں یہ دراصل اینٹیں پکانے کے بھٹے تھے جب یہ باغ وجود میں آیا تو ان بھٹوں کے ملبے کو یکجا کر کے پہاڑیوں کی شکل دے دی گئی اور ان پر پھول بوٹے اگا دیئے گئے۔ انہی پہاڑیوں میں سے ایک اوپن ائیر تھیٹر بھی ہے جسے گورنمنٹ کالج لاہور کے ایک سابق پرنسپل ''مسٹر سوندھی'' نے تعمیر کروایا تھا۔

باغ میں ایک خوبصورت فوارے والا باغیچہ بھی ہے جسے ''گلستان فاطمہ'' کہتے ہیں پہلے یہاں گندے پانی کا ایک جوہڑ ہوا کرتا تھا لیکن 1945ء میں اس زمانے کے سپرنٹنڈنٹ باغات سید عبدالعزیز شاہ نے اس گندی جگہ کو پھولوں پودوں سے سجایا۔ پھر 1947ء میں اس کا نام محترمہ

فاطمہ جناح کے نام پر ''گلستان فاطمہ'' رکھ دیا گیا۔

باغ جناح کی حیثیت سے محض ایک باغ ''یا سیر گاہ کی نہیں بلکہ اپنی متنوع نباتاتی شادابی (Botanic of Diversity and Richness) کے اعتبار سے تو یہ باغ اب ایک قومی ورثہ بن گیا ہے نیشنل جیوگرافک سوسائٹی امریکہ نے آج سے نصف صدی قبل اس باغ کو پاکستان ہی نہیں بلکہ پورے ایشیاء کے لیے اثاثہ قرار دیا تھا اور ایک سروے میں اسے پاکستان کے باغات کا تاج Crown قرار دیا تھا۔

اس وقت باغ جناح کی کل اراضی 141 ایکڑ ہے جس میں 18.25 ایکڑ پر عمارات، سڑکیں، لائبریری، مسجد اور ریستوران ہیں۔ 14 ایکڑ اراضی کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کو بغرض بوٹینکل گارڈن دی گئی یہی زمین بعد میں گورنمنٹ کالج کو منتقل ہوگئی اور آج بھی یہاں گورنمنٹ کالج کے بوٹینکل گارڈن قائم ہے۔

باغ جناح دراصل ثمر ہے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے ڈاکٹر ای براؤن کی نیکی کا۔ جنہوں نے 1861ء میں ایگری ہارٹی کلچرل سوسائٹی کے سیکرٹری کا عہدہ سنبھالنے کے بعد باغ جناح قائم کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ شاہراہ قائداعظم پر زمین کی موجود قیمتوں کے حوالے سے دلچسپ بات یہ ہے کہ لارنس گارڈن کی 176 ایکڑ اراضی پروفیسر ڈاکٹر ٹی ای براؤن نے مزنگ لاہور کے زمینداروں سے صرف اور صرف 235 روپے میں ہی خریدی تھی۔ اول اول اس باغ کا نام ایگری ہارٹی کلچرل گارڈن رکھا گیا۔

باغ کو لارنس گارڈن کا باقاعدہ نام دینے کی تقریب 6 نومبر 1915ء میں ہوئی اس سال باغ میں پانی کی وافر فراہمی کے لیے پہلا ٹیوب ویل نصب کیا گیا۔ 1921ء میں پہلی بار باغ کے اندر کولتاری سڑکیں تیار ہوئیں جبکہ 1925ء میں باغ کا نظم ونسق محکمۂ زراعت کے حوالے کیا گیا اور آج تک یہ باغ محکمہ زراعت کے پاس ہی ہے۔ 1935ء میں پنجاب کے مسٹر ہیوز نے باغ میں گندے پانی کے جوہڑ کو ایرانی طرز کے گلستان کی شکل دی جسے آج گلستان فاطمہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

باغ کی خوبصورتی کے لیے پورا سال کام جاری رہتا ہے یہاں ایک نئے حصے کا اضافہ ہوا ہے اسے ''مغل گارڈن'' کہتے ہیں یہاں بارہ دریاں فوارے روشیں اور راھد اریاں مغل فن تعمیر کی عکاسی ہیں یوں یہ باغ بیک وقت مشرقی اور مغربی تعمیرات کے نمونوں کا مرقع بن چکا ہے۔

باغ جناح میں برطانیہ، چین جاپان شام اسپین مشرق وسطی اور جنوبی یورپ سمیت دنیا کے مختلف براعظموں کے نادرونایاب پورے موجود ہیں۔

باغ جناح ہی تقریباً 21 ہزار درخت ہیں جو 450 قسموں پر مشتمل ہیں اپنی خوبصورتی اور سدا بہار ہونے کی وجہ سے باغ جناح صرف پاکستان ہی ہی نہیں بلکہ پورے ایشیاء میں مشہور ہے۔

اس میں ایک وسیع میدان ہے جس میں کرکٹ کے ٹیسٹ میچ کھیلے جاتے ہیں اس کے علاوہ کئی کلب بھی قائم ہیں اس میں ایک جھولا باغ لیڈیز اینڈ چلڈرن پارک بھی ہے جس میں بارہ برس سے کم عمر بچے جھولا جھولتے ہیں اور بہت خوش ہوتے ہیں۔

باغ کا گرین ہاؤس بہت اہم ہے جہاں پر مختلف ممالک سے منگوائے ہوئے پودوں پر تحقیق کی جاتی ہے باغ میں تقریباً آٹھ ہزار سے زائد درخت لاتعداد اقسام کی پھولدار جھاڑیاں، بیلیں اور سینکڑوں اقسام کے پودے موجود ہیں جن میں ہر سال متعدد نئی قسموں کا اضافہ ہو جاتا ہے ان کی حفاظت کے لیے بیسیوں بیلدار مالی اور دوسرا عملہ زراعت افسران کے ماتحت کام کرتے ہیں۔

باغ جناح اس وقت پاکستان کا سب سے قدیم باغ ہے اور یہاں ہزاروں اقسام کے لاکھوں قیمتی اور نایاب پودے ہیں جن میں کئی پودے تو ایسے ہیں جو پاکستان میں کسی اور جگہ نہیں مثلاً:

1- دیسی فائیکس

اس کو مقامی زبان میں بڑھ کہتے ہیں باغ کا قدیم ترین درخت ہے حتیٰ کہ کچھ ایسے بھی موجود ہیں جو سکندر اعظم کے زمانہ کے ہیں۔

2- آسٹریلین بڑھ

یہ بھی سدا بہار درخت ہے اُونچائی 15 سے 20 میٹر تک جا سکتی ہے یہ بھی سایہ دار درخت ہے

اس کا شمار بھی باغ کے قدیمی درختوں میں کیا جا سکتا ہے۔

3- کریزیا انسگنی (بدھا)

یہ نہایت خوبصورت اور تاریخی درخت ہے اس کو بدھا کا درخت کہتے ہیں کیونکہ روایت ہے کہ بدھا اس کے نیچے بیٹھ کر عبادت کیا کرتے تھے۔

4- سمبل

باغ جناح کے سب سے پرانے درختوں میں سے ہے اور اس کا ڈھانچہ بہت بڑا ہے یہ 40 میٹر سے بھی اونچا چلا جاتا ہے یہ درخت بھی پت جھڑ ہے اس پر شہد کے چھتے اگتے ہیں۔آج کل یہ درخت اپنی عمر پوری کر کے ختم ہو چکا ہے مگر اس کا دیوقامت ڈھانچہ اب بھی باغ میں موجود ہے۔

5- سڑکولیا الاٹا

یہ درخت بہت ہی کمیاب ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پورے پاکستان میں ایک ہی درخت ہے جو باغ جناح کا اثاثہ ہے اس کا تنا نیچے سے صراحی نما ہوتا ہے اونچائی 12 سے 15 میٹر ہے اور یہ پت جھڑ پودا ہے۔

6- سائنا مومم کیفورا (کافور)

یہ بہت پرانا درخت ہے اور اس سے کافور نکلتی ہے جس کو مختلف مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اس کی اونچائی 25 سے 30 میٹر تک ہوتی ہے۔اور یہ سدا بہار درخت ہے۔

7- کنگھی پام

اس کو کنگھی پام اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے پتے بہت باریک اور کنگھی نما ہوتے ہیں بہت قیمتی پودا ہے اور سدا بہار ہے لیکن اس کی بڑھوتری نہایت سست ہے۔

8۔سائیکس رمفی پام

یہ آسٹریلین پودا ہے اور یہ بھی پورے پاکستان میں ایک ہی پودا ہے یہ خوبصورت پودا باغ میں حضرت ترت کے مزار کے پاس ہے۔

قیام پاکستان سے قبل باغ جناح لارنس گارڈن کے تربیت یافتہ مالی پورے ہندوستان میں مستند تصور ہوتے تھے ان کا پھولوں اور پھلوں کے بارے میں علم اور تجربہ باٹنی سائنس کے گریجویٹس سے زیادہ ہوتا تھا حالانکہ تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی۔آج کل بھی یہاں پر پورے ملک سے لوگ پودوں کے بارے میں تربیت حاصل کرتے ہیں اور چار ماہ کے دو سے تین تربیتی کورس ایک سال میں منعقد ہوتے ہیں۔

پھولوں کے حسن کو دنیا بھر میں خاصی پذیرائی حاصل ہے اور نباتات کے مطابق پاکستان کی زراعت میں پھولوں کے ذریعے ہی انقلاب لایا جا سکتا ہے اور غیر معمولی پیداوار حاصل کی جا سکتی ہے پھولوں کی افزائش میں اضافے سے ماحولیاتی آلودگی کو بھی کم کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

○

الحمرا آرٹس کونسل، لاہور

ثقافت کی وسعتیں اور مقصدیت لامحدود ہیں۔ مختصراً ثقافت کا مقصد جہاں ماضی کو حال سے جوڑ کر اپنی شناخت کا ادراک حاصل کرنا ہے۔ وہاں اس کا مقصد بہترین معاشرے کی تشکیل بھی ہے کیونکہ تہذیبی قدروں کے وجود اور ان میں ترقی و ترویج سے زندگی میں حرارت بھی پیدا ہوتی ہے اور توازن بھی۔

الحمرا ہماری تہذیب و ثقافت کا گہوارہ ہے۔ 10 دسمبر 1949ء کو وجود پذیر ہونے کے بعد اس نے مختلف ادوار دیکھے۔ 1970ء کی دہائی میں حکومت کی جامع ثقافتی پالیسی کے تحت حکومتِ پنجاب کی تحویل میں آیا اور 1983ء میں پنجاب آرٹس کونسل کی ڈویژنل شاخ بنا۔ حکومت نے اسے تعمیر و تشکیل اور کارکردگی کے لحاظ سے ملک کا سب سے بڑا ثقافتی ادارہ بنایا اور اسے بین الاقوامی شناخت دی۔ اور گزشتہ 50 برسوں میں ملک گیر شہرت اور اہمیت کا کوئی ایسا فنکار، مصور، موسیقار، گلوکار یا تخلیق کار ایسا نہیں جس نے براہ راست یا بالواسطہ الحمرا سے فیض حاصل نہ کیا ہو۔

پاکستان کے ثقافتی دارالخلافے لاہور کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ پاکستان میں اپنی نوعیت کا پہلا کلچرل کمپلیکس تکمیلی مراحل کو پہنچا جس کا ڈیزائن معروف ماہر تعمیرات نیرّ علی دادا نے تیار کیا۔

فروری 1974ء کے آخری ہفتے کے دوران اسلامی سربراہی کانفرنس کے موقع پر لاہور قلعہ میں اسلامی مملکت کے سربراہوں کے لیے ڈنر کے بعد ثقافتی شو پیش کرنا تھا۔ کراچی میں پی آئی اے کا ڈانس ٹروپے ضیاء محی الدین کی سربراہی میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر نمایاں کامیابیاں حاصل کر رہا تھا۔ الحمراء سے وابستہ اس وقت کے ممتاز اور مایہ ناز فنکاروں نے اپنی تمام تر مہارت کے ساتھ اسلامی سربراہی کانفرنس کے زعما اور معزز شخصیات کے سامنے اپنی بھرپور فنکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ الحمرا آرٹس کونسل میں کیا اور بے پناہ داد سمیٹی۔

موسیقی

فیروز نظامی کی سربراہی میں موسیقی کی کلاسز کو سٹریم لائن کیا گیا اور کونسل کے اوپن ایئر تھیٹر کے پروگراموں میں جہاں کلاسیکل اساتذہ ہوتے وہاں موجودہ وقت کے ساتھ ساتھ ابھرتے ہوئے گلوکار اور گلوکارائیں الحمرا کی سٹیج سے اپنی سریلی اور مدھر آوازوں کا جادو جگاتے۔

رقص

مہاراج غلام حسین کتھک کی راہنمائی اور سربراہی میں جہاں کلاسیکی رقص، خاص طور پر کتھک اور لوک رقصوں کی تربیت دی گئی وہاں ایک ٹروپ بھی تشکیل دیا گیا جس کے موضوعات میں انسانی شعور کی بیداری پر خصوصی توجہ دی گئی اس ٹروپ نے سفری تھیٹر کی طرح مختلف جگہوں پر پرفارم کیا۔

مصوری اور مجسمہ سازی

ان شعبوں کی کلاسیں معمول کے مطابق جاری رہتی ہیں اب تک سینکڑوں مصوروں کے بنائے ہوئے شاہکاروں کے فن پارے الحمرا آرٹس کونسل کے ہال کی زینت بن چکے ہیں اور وقتاً فوقتاً یہ سلسلہ جاری رہتا ہے فن کے قدردان اور ناقدین بڑے ہی انہماک سے ان نمائشوں کا انتظار کرتے اور بھرپور طریقے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ نئے مصوروں کی بھی باقاعدگی سے نمائشیں منعقد کر کے حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

مذہبی تہذیبی پروگرام

مذہب کو ثقافت کا اہم جزو سمجھنے کے باعث مذہبی ثقافتی لگاؤ کا بھی دل کھول کر اظہار ہوتا ہے مختلف اہم مواقعوں تہواروں پر حسن قرأت، نعت اور قوالیوں کے پروگرام منظم اور احسن طریقے سے یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

بچوں کے لیے

بچوں کی مصوری کی کلاسوں پر یہاں خصوصی توجہ دی جاتی ہے ہر تین چار ماہ بعد ان کی چنیدہ تصاویر کی نمائشیں منعقد ہوتی ہیں۔قومی موضوعات (قومی دنوں کے حوالے سے) مقابلے منعقد کرائے جاتے ہیں عزیز اثری اور جمیل بسمل کی کاوشوں سے ''چلڈرن تھیٹر'' کا قیام بھی محدود عرصے کے لیے یہاں جاری رہا۔پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس (اسلام آباد) سے خالد سعید بٹ کی سربراہی میں جدید پتلی تھیٹر کا یہاں سے باقاعدہ آغاز ہوا جبکہ اس سے قبل بچوں کے لیے آس پاس کے دیہات سے لوک پتلی تماشہ والوں کو خاص طور پر مدعو کیا جاتا رہا۔

بچوں کے تھیٹر کے بینر تلے ''تیرے ہی بچے تیرے ہی بالے''، ''جاگ اٹھا وطن'' اور ''آزادی'' جیسے مقصدی اور تفریحی کھیل پیش ہوتے رہے ان کھیلوں میں ماسوائے ایک دو بڑے فنکاروں کے باقی سب کردار بچے ہی ادا کرتے تھے اور بچے ہی پروڈکشن کی ذمہ داریاں بھی سنبھالتے تھے۔

پاکستان ٹیلی ویژن کے پہلے اسٹیشن کے قیام کی ابتدائی تیاریاں 63-1962 بھی اسی ''الحمراء میں ہوئی تھیں۔الحمرا کینٹین کے چھوٹے سے ہال میں اسلم اظہر، فضل کمال، ظفر صمدانی اور آغا ناصر جیسے با کمال لوگ جمع ہو کر نہ صرف ٹیلیویژن کے پروگراموں کے بارے میں پلاننگ کرتے بلکہ میوزک، ڈرامہ اور فائن آرٹس کے فنکاروں کے ساتھ انٹرویوز بھی یہیں کرتے۔پھر یہیں سے یہ لوگ ٹیلیویژن اسٹیشن کی بلڈنگ میں منتقل ہو گئے۔

پنجاب کا ایک باقاعدہ ثقافتی طائفہ کا قیام بھی الحمراء ہی میں معرض وجود میں آیا۔33 ممبران پر مشتمل اس طائفے نے برسوں تک نہ صرف پاکستان کا دورہ کرنے والے سربراہان مملکت پارلیمانی اور دیگر وفود کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا بلکہ 11 ممالک کا دورہ بھی کیا۔

فائن آرٹس اکیڈمی

لاہور میں نیشنل کالج آف آرٹس اور پنجاب یونیورسٹی میں ڈرائنگ، سٹل لائف ماڈلنگ، پورٹریٹ، لینڈ سکیپ ڈیزائن اور مجسمہ سازی وغیرہ سکھانے کے لیے ایسے لوگوں کے لیے تو انتظام تھا جو ان فنون کو بطور پیشہ اکیڈمی کے تربیت یافتہ طالب علموں کے بنائے ہوئے مجسمے اور آرٹ

کے دیگر نمونے اکیڈمی کے اندر بھی زیر نمائش رہنے اور الحمرا کے لان میں دیکھنے کو ملتے تھے نمائشیں منعقد کرانا بھی فائن آرٹس ہی کی ذمہ داری ہوا کرتی تھی۔

میوزک اکیڈمی

موسیقی کی ترقی و ترویج کے لیے یوں تو الحمرا میں مختلف پروگرام ہوتے رہتے تھے کچھ عرصہ بعد اکیڈمی میں موسیقی کا باقاعدہ سلیبس متعارف کرایا گیا۔ دو اور تین سال کے کورسز مرتب کیے گئے اور کامیاب ہونے والے طلباء کو اسناد دی جاتی تھیں۔ موسیقی کی تعلیم کے علاوہ اکیڈمی، پاکستان کے مشہور و معروف گلوکاروں اور سازندوں کے پروگرام بھی منعقد ہوتے رہتے ہیں جو شائقین موسیقی کی تسکین کا باعث بنتے ہیں۔

الحمرا آرٹس کونسل میں اب تک سینکڑوں مختلف نوعیت کے سرکاری اور غیر سرکاری سیمینارز، کانفرنسیں، ثقافتی شو، رقص و موسیقی کے پروگرام، ادبی اور سرکاری اجلاس، طارق عزیز شو (نیلام گھر)، اشتہارات کی بین الاقوامی کانفرنس Expo-89، ٹیبلوز، نعتیہ مشاعرے اور دیگر تقریبات اور سرگرمیاں منعقد ہو چکے ہیں۔

قیام پاکستان کے ساتھ ہی ایک ایسی انجمن کی تشکیل کی گئی جو اس نوزائیدہ ملک میں فنون لطیفہ کے استحکام کے لیے کام کر سکے اس کام کے لیے کسی مناسب جگہ کی ضرورت تھی۔ ممتاز دولتانہ، امتیاز علی تاج، جسٹس ایس اے رحمٰن اور عبدالرحمٰن چغتائی چاہتے تھے کہ مال روڈ پر واقع ماسٹر تارا سنگھ ڈانس سکول کو اس مقصد کے لیے حاصل کیا جائے جو اس کام کے لیے سب سے موزوں مقام ہو سکتا تھا۔ ایس اے رحمٰن متروکہ املاک بورڈ کے سربراہ تھے چنانچہ ان کی توجہ سے 68 مال روڈ پر متروکہ املاک کی یہ کوٹھی حکومتی امداد سے خرید لی گئی اور اس جگہ پاکستان آرٹس کونسل کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ گورنر جنرل پاکستان خواجہ ناظم الدین نے 10 دسمبر 1949ء کو اس جگہ پاکستان آرٹس کونسل کا باقاعدہ افتتاح کیا اس موقع پر عبدالرحمٰن چغتائی کی تصاویر کی نمائش بھی کی گئی اس نمائش کا افتتاح بھی گورنر جنرل نے کیا تھا آرٹس کونسل کو ''الحمرا'' کا نام دیا گیا اور یہی نام اس کی پہچان رہا ہے۔ پاکستان آرٹس کونسل کے مقامی فنکاروں، چند افسران اور حکومت کی واجبی سی امداد سے کام کا آغاز کر دیا وقت کے ساتھ ساتھ اس کی خدمات کا دائرہ اور اہمیت میں وسعت آتی رہی یہاں مصوری، موسیقی تھیٹر، رقص، پتلی تماشے اور مجسمہ سازی وغیرہ کی تربیت کا آغاز کیا

گیا یوں تو باقاعدہ طلبہ کے لیے نیشنل کالج آف آرٹس اور پنجاب یونیورسٹی فائن آرٹس خدمات سرانجام دے رہے تھے مگر آرٹس کونسل نے عام لوگوں کے ذوق کی تسکین کا سامان مہیا کیا اور ان کی تربیت کا اہتمام کر کے ان فنون کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

ساٹھ کی دہائی میں پاکستان آرٹس کونسل کی خدمات کا سلسلہ عروج پر تھا فنکار برادری نے اس میں زبردست دلچسپی لی کیونکہ ٹیلی ویژن کی آمد سے قبل صرف فلم اور اسٹیج ہی فنکاروں کی صلاحیتوں کے اظہار کے ذرائع تھے 1957ء میں یہاں موسیقی کی اکیڈیمی تشکیل دی گئی اس کے انچارج ممتاز موسیقار فیروز نظامی تھے اس زمانے میں الحمرا شہر بھر کے فنکاروں کا مسکن تھا جہاں مصور، گلوکار اداکار اور فنون لطیفہ سے وابستہ افراد ہمہ وقت ڈیرہ ڈالے رکھتے گورنر مغربی پاکستان اختر حسین نے 2 نومبر 1958ء کو الحمراء میں نیشنل آرٹ گیلری کا افتتاح کیا۔ حکومت نے اس ادارے کی سرپرستی کی اور یہاں سے ثقافتی طائفے بیرون ممالک بھجوائے علاوہ ازیں بیرون ممالک سے آنے والے وفود کی میزبانی بھی یہی ادارہ کیا کرتا تھا۔ حکومت نے آرٹس کونسل کی عمارت کی تعمیر میں دلچسپی لی اور ایک ایسی عمارت کی تعمیر کا منصوبہ بنایا گیا جس میں آڈیٹوریم، آرٹ گیلری سمیت دیگر عمارات اور سہولیات موجود ہوں۔

عمارت کے لیے ملکی اور غیر ملکی ماہرین تعمیرات کے ڈیزائنوں پر غور ہوا اور آخر کار نیر علی دادا کا تیار کردہ ڈیزائن منظور کر لیا گیا تعمیراتی کام میسرز بلڈرز کو سونپا گیا جبکہ میسرز آر ای ایس اس تعمیراتی کام کے کنسلٹنٹ مقرر ہوئے۔

سابق وزیراعلیٰ محمد حنیف رامے نے یکم جولائی 1975ء کو الحمرا آرٹ کونسل کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا فنڈز کی عدم دستیابی اور سیاسی حالات میں کشیدگی کی وجہ سے کام بار بار بند ہوتا رہا لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ غلام جیلانی خان، جب پنجاب کے گورنر بنے تو انہوں نے آرٹس کونسل کمپلیکس کے منصوبے میں ذاتی دلچسپی لے کر پہلے مرحلے کو مکمل کرایا اس میں آڈیٹوریم، ورکشاپ اور گرین روم تعمیر کیے گئے ان عمارات کا افتتاح 14 اگست 1981ء کو ہوا تھا۔

ابھی بہت سا کام ہونا باقی تھا سہولیات کی فراہمی کا سلسلہ جاری تھا مگر آرٹس کونسل نے کسی قسم کی تاخیر کے لئے بغیر الحمرا میں اپنی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا۔ شروع میں یہاں آرٹس کونسل کے اپنے ڈرامے اور موسیقی کے پروگرام پیش کئے جاتے تھے بعدازاں پرائیویٹ پروڈکشن کے پروگرام بھی پیش کئے جانے لگے پاکستان آرٹس کونسل بعد میں لاہور آرٹس کونسل کے قالب میں

ڈھل گئی تاہم اس کے مقاصد میں کوئی فرق نہ آیا۔

گورنر غلام جیلانی نے ہی یہاں 1983ء میں آرٹ گیلری اور انتظامی بلاک تعمیر کرایا اسی سال آرٹس کونسل کا انتظام حکومت پنجاب کو سونپ دیا گیا اور اسے پنجاب کونسل آف دی آرٹس کا ڈویژنل آفس بنا دیا گیا۔ الحمرا ہال کے طرز تعمیر کو بہت پسند کیا گیا یہ مال روڈ کی جاذب نظر عمارات میں سے ایک ہے اس عمارت کو آغا خان ایوارڈ بھی دیا گیا ان خدمات کے طور پر نیئر علی دادا کو پرائیڈ آف پرفارمنس بھی دیا گیا۔

الحمراء آرٹس کونسل کی عمارات اس وقت چار حصوں میں تقسیم ہیں ہال نمبر 1 ہال نمبر 2 ہال نمبر 3 اور آرٹ گیلری معہ ایڈمن بلاک 1983ء میں ہی یہاں الحمرا ہال کی تیاری کا کام شروع ہو گیا جس کے لیے پنجاب حکومت نے خصوصی فنڈ ز دیئے تھے۔ ہال نمبر ٹو کا ڈیزائن بھی نیئر علی دادا نے تیار کیا تھا اور ان ہی کی نگرانی میں میسرز بلڈرز ایسوسی ایٹس نے تعمیراتی کام مکمل کیا الحمرا ٹو کی تیاری 1985ء میں تکمیل کو پہنچی اس کی تیاری سے پروگراموں کی پیش کش کے لیے وسیع جگہ دستیاب ہو گئی گورنر غلام جیلانی نے ہی یہاں ایک اور چھوٹے آڈیٹوریم الحمرا ہال تھری کی تعمیر کا منصوبہ بنایا جس میں 225 افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ فیروز پور روڈ پر قذافی سٹیڈیم کے پہلو میں اوپن ایئر تھیٹر اور دو چھوٹے آڈیٹوریم کی تعمیر کے لیے بھی ایک قطعہ اراض مختص کر دی۔ اس کا مقصد شہر کی بڑھتی ہوئی آبادی کو تفریح کی سہولیات فراہم کرنے کے علاوہ الحمراء پر دباؤ کم کرنا تھا۔

الحمرا کو صدر ایوب، امریکی خاتون اول جیکولین کنیڈی، گورنر گورمانی، نواز شریف، ضیاء الحق، بے نظیر بھٹو سمیت متعدد اہم ملکی اور بین الاقوامی شخصیات کی میزبانی کا شرف حاصل ہو چکا ہے الحمراء آرٹ گیلری میں ہر سال کتاب میلہ بھی منعقد ہوتا ہے۔ الحمرا کے ہال کو نور جہاں کی وفات کے بعد ''نور جہاں ہال'' کے نام سے موسوم کر دیا گیا۔ 2002ء میں الحمرا پرفارمنگ آرٹ اکیڈیمی قائم کی گئی جہاں گانا، مصوری، رقص، فوٹو گرافی اور ساز بجانے وغیرہ کی تربیت دی جاتی ہے۔

''نیا لاہور'' تحریر: محمد نعیم مرتضیٰ

○

عجائب گھر، لاہور

لاہور کا عجائب گھر، پاکستان کا سب سے پرانا اور منفرد اہمیت کا حامل عجائب گھر ہے یہ اس زمانے کی بات ہے جب انگریز برصغیر پر قابض تھے پنجاب میں پہلی بار آرٹ وصنعت کی نمائش 20 جنوری 1864ء کو ٹولنٹن مارکیٹ میں منعقد ہوئی جو اپریل 1864ء میں ختم ہوگئی اس نمائش پر حکومت نے کافی روپیہ خرچ کیا لاہور، ملتان، خوشاب، بھیرہ اور ملک کے دوسرے علاقوں کے سرداروں اور امیروں نے نہایت قیمتی ملبوسات، قالین، صندوقچیاں، حقہ وظروف نادر اور قیمتی پتھر، نیزے، تیر کمانیں، اور مرصع قبضوں والی تلواریں حنوط شدہ جانور اور پرندے، نوادرات اور مصوروں کے شاہکار نمونے وغیرہ نمائش میں بھیجے اس کے ساتھ ساتھ اس دور کے اور اس سے پہلے زمانے کے خوش نویسوں کے ہاتھ سے لکھی گئی کتب اور قطعات بھی نمائش میں شامل کیے گئے اس وقت حکومت نے ان نادر اشیاء کو محفوظ کرنے سے متعلق سوچا چنانچہ اسی سال یعنی 1864 کو ''انڈسٹریل آرٹ میوزیم آف دی پنجاب'' کے نام سے اس عمارت میں عجائب گھر قائم کیا جو آج کل ٹولنٹن مارکیٹ کے قریب واقع ہے عجائب گھر کی موجودہ عمارت بالکل اس کے پاس ہی واقع ہے نمائش میں رکھے جانے والے صنعت وحرفت کے شہ پارے تقریباً تیس سال تک اس عمارت میں رکھے رہے۔

عجائب گھر کی موجودہ عمارت ملکہ وکٹوریہ کی گولڈن جوبلی کی تقریبات کے سلسلے میں عوام کے تعاون سے تعمیر کی گئی اس عمارت کا سنگ بنیاد ملکہ وکٹوریہ کے پوتے اور ایڈورڈ ہفتم کے بیٹے شہزادہ البرٹ ڈیوک آف کلارنس نے 3 فروری 1890ء کو رکھا۔ عمارت 1893 کو مکمل ہوئی اور 1894ء کو نوادرات کا ذخیرہ ٹولنٹن مارکیٹ نئی عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ ابتداء میں عجائب گھر قدیمی اشیاء اور اعلیٰ دستکاری کے نمونوں کا ذخیرہ تھا پھر یہ نمونے رفتہ رفتہ دیگر اداروں میں منتقل کر دیئے گئے اور لاہور کے اس عجاب گھر کو بھرپور شہرت اور پسندیدگی کی سند ملی مگر برصغیر کی تقسیم سے

نوادارت بھی دونوں ملکوں میں تقسیم کرنا پڑے جس سے اس بہترین عجائب گھر میں مسائل کے ساتھ ساتھ خلاء بھی پیدا ہوگیا کیونکہ فقید المثال نوادارت کا ایک بڑا حصہ بھارت کو منتقل کر دیا گیا یہی وجہ تھی کہ اس کی شہرت میں بھی بہت فرق آیا فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مرحوم نے 1966ء میں اس کی تنظیم نو اور بہتری کے احکامات صادر کیے چنانچہ ان کی ذاتی دلچسپی ماہرین آثار قدیمہ اور دیگر ماہرین نے بھر پور تعاون اور محنت سے بڑی حد تک اس میں نکھار لایا گیا 28 نومبر 1967ء کو نئی ترتیب اور تجدید شدہ عجائب گھر کا افتتاح بھی ایوب خان نے کیا اور اسے دوبارہ عوام کے لیے کھولا گیا۔

اس وقت عجائب گھر میں 19 سے زائد گیلریاں ہیں۔ عجائب گھر میں داخل ہوں تو خوش نویس محمد امین خان کا لکھا ہوا فریم شدہ بورڈ رکھا ہے جس میں عجائب گھر کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے یہیں بائیں جانب جودھپور بھارت کی سنگ مرمر کی بنی دوسری اشیاء رکھی گئی ہیں اس کے بعد لاہور کی مختلف عمارتوں کے 17 ویں صدی کے دروازے رکھے گئے۔ ہیں جن میں سے اکثر کا تعلق اکبری دور سے ہے ان میں ایک سکھ عہد کا شالامار باغ کا ایک چوکٹھ بھی شامل ہے اگلے حصے میں پندرھویں صدی کے بعد کی برصغیر کی فن مصوری کی ارتقائی تاریخ نظر آتی ہے دوسری گیلری میں ''گندھارا آرٹ'' کے نمونے ہیں یہیں مہاتما بدھ کے وہ مجسمے بھی ہیں جو ان کی زندگی کے مختلف گوشوں اور ادوار کو اجاگر کرتے ہیں اس طرح باقی گیلریاں بھی کسی خاصی دور یا خاصی نام سے منسوب ہیں جس میں ان سے متعلق اشیاء رکھی گئی ہیں۔

ایک گیلری میں جین مت، ہندمت، اور بدھ مت کے علاوہ نیپال، تبت، برما اور بھارت کی بہت سی اشیاء، ہی ان میں مندروں کے جھنڈے، ان مذاہب کی مورتیاں اور مجسمے اور دیگر ایسی بہت سی چیزیں رکھی ہیں جو ان کے مذاہب، نفسیات تہذیب عقائد اور اخلاق پر روشنی ڈالتی ہیں اسلامی گیلری ہی برصغیر اسلام کے فروغ کے دور کے نوادرات آرٹ کے نمونے، خوبصورت ترین قالین ہاتھی دانت پر بنی ہوئی دلکش تصاویر، روایتی چغے ٹوپیاں شیشے سے مرصع ٹائلیں اور کاغذ کے گودے پر لاکھ کی نقاش کے کام ایک گیلری میں رکھی گئی ہیں۔

عجائب گھر، کے نوادرات ہی مغلوں کی یادگاروں، نایاب مخطوطات، قرآن پاک کے نادر نسخہ جات، مختلف ممالک کے سربراہان کی طرف سے دیئے جانے والے تحائف، افریقی قبائلی کی بنی اشیاء کے علاوہ ایک گیلری میں پاکستان کے چاروں صوبوں کے ملبوسات اور ان کے گھر کے

ماحول، رہن سہن اور استعمال کی عام اشیاء رکھی گئی ہیں جس سے غیر ملکی سیاحوں کو پاکستان کی ثقافت سے آ گاہی حاصل ہوتی ہے یہاں کی ایک گیلری میں قدیم جنگی ساز و سامان اور ہتھیار نہایت سلیقے سے لگے ہوئے ہیں اس گیلری میں ملکہ وکٹوریہ کا بہت بڑا بت رکھا ہے اس مجسمے کے دونوں جانب جارج پنجم اور جارج ہفتم کے مجسمے بھی رکھے گئے ہیں۔

یہاں سے سیڑھیاں چڑھیں تو وہ گیلری ہے جہاں تاریخ، تحریک پاکستان کی دلخراش داستان تصویروں اور اخباری تراشوں کی مدد سے رقم کی گئی ہے 1756ء سے 1949ء تک مسلمانوں کی یادگار اشیاء کے علاوہ حضرت لال شہباز قلندر کے مزار کی نیلی روغنی ٹائلیں اور خانہ کعبہ کے غلاف کا ایک خوبصورت ٹکڑا بھی رکھا ہے متفرق نوادارت کی گیلری میں دھات کی بنی ہوئی اشیاء، قدیم لباس، سکے، مہریں چینی کی مصنوعات، ہاتھی دانت پر نقاشی اور جالی دار کام، شاہی فرامین اور پرانی کتابیں وغیرہ رکھی گئی ہیں اس طرح قبل از تاریخ ہڑپہ اور موہنجوداڑو سے کھدائی میں برآمد ہونے والی اشیاء کے نمونے بھی یہاں پر موجود ہیں جس میں تحریک کے قائدین کی تصاویر، اور خطوط بھی رکھے گئے ہیں ایک قدیم پاکستانی پرچم بھی ہے جو قائداعظم محمد علی جناح کی باغ جناح لاہور آمد پر لہرایا گیا تھا۔ قومی ترانے کے خالق جناب حفیظ جالندھری مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا قومی ترانہ بھی لگا ہوا ہے یہیں تحریک پاکستان کے درمیان نکلنے والے اخبارات بھی رکھے گئے ہیں اس کے علاوہ قائد اور علامہ اقبال کی زندگیوں پر بھی تصاویر اور چارٹوں کی مدد سے روشنی ڈالی گئی ہے یہ تمام جدو جہد اور پیہم کوششوں کو دیکھ کر دل میں آزادی کی نعمت اور قدر و قیمت کا صحیح احساس اور ادراک ہوتا ہے۔

ایک کمرے میں 1947ء سے اب تک کے تمام فرسٹ ڈے کورز اور ڈاک کی تاریخ کی حفاظت کے ساتھ شائقین کے لیے اہمیت رکھتا ہے غرض وہ سب کچھ یہاں موجود ہے جو تاریخ اور آثار قدیمہ کا شعور ادراک رکھنے والوں کے لیے حیران کر دینے کے لیے کافی ہے۔

O

افسانوی شہرت کی حامل مال روڈ، لاہور

مال روڈ جسے لاہور میں رہنے والے لوگ کسی زمانے میں ''ٹھنڈی سڑک'' کے نام سے یاد کرتے تھے ایک سنگل ٹریک سڑک ہوا کرتی تھی جس کے دونوں جانب بڑے بڑے درخت تھے جو اوپر جا کر آپس میں ملے ہوئے تھے ان درختوں کے ملاپ نے پوری سڑک پر ''شیڈ'' کا کام کیا ہوا تھا اور سڑک سے گزرنے والے کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کسی سرنگ سے گزر رہا ہو میونسپلٹی والے دن میں دو مرتبہ اس سڑک کے دونوں اطراف پانی کا چھڑکاؤ کرتے تھے تاکہ گرد وغبار نہ اڑ سکے۔ قیام پاکستان سے قبل اس سڑک پر زیادہ تعداد پیدل چلنے والوں کو ہوا کرتی تھی کیونکہ اس وقت لاہور میں گاڑی صرف چند افراد کے پاس تھی ان افراد میں لعل دین قیصر، عبدالعزیز مالوراڑہ، میاں وحید، چوہدری غلام رسول وغیرہ کے پاس اپنی گاڑیاں موجود تھیں تین چار گھنٹوں کے بعد ایک کار کا مال روڈ سے گذر ہوتا تھا پیدل چلنے والے لوگ اس گاڑی اور اس میں بیٹھے ہوئے شخص کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اس کے علاوہ سات آٹھ نوجوان لڑکوں کے گروپ ''ہرکولیس'' سائیکلوں پر بیٹھ کر شام کے وقت مال روڈ کی سیر کرنے آیا کرتے تھے اس وقت سائیکل کو موجودہ ہنڈا اکار کا درجہ دیا جاتا تھا مال روڈ حقیقت میں ایک سیرگاہ تھی جہاں پر لاہور کے رہائشی تفریح کے لیے آیا کرتے تھے کیونکہ اس وقت لارنس گارڈن صرف انگریزوں کے لیے مخصوص تھا اور گیٹ پر لکھا ہوا تھا کہ Dogs and Indians are not Allowed کتوں اور ہندوستانیوں کا داخلہ ممنوع ہے مال روڈ پر دکانیں عموماً صبح 9 بجے کھلتی اور شام 5 بجے بند ہو جایا کرتی تھیں اور پھر دور دور تک کوئی شخص نظر نہیں آتا تھا پاکستان معرض وجود میں آنے کے بعد مال روڈ میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں اس سڑک پر زیادہ تر بلڈنگیں ہندوؤں، سکھوں اور انگریزوں کی ملکیت ہوا کرتی تھیں صرف ایک دو عمارتیں ایسی تھیں جن کے مالک مسلمان تھے ہندو، سکھ اور انگریز جب لاہور سے چلے گئے تو یہ تاریخی عمارتیں ان لوگوں کے نام کر دی گئیں جو ہندوستان میں اپنی زمین جائیداد چھوڑ آئے تھے

یا لاہور کے مقامی لوگوں نے ان سے خرید لیں آج بھی مال روڈ پر ایسی تاریخی عمارات موجود ہیں جو اپنی نفاست، پختگی اور اعلیٰ فن تعمیر کا نمونہ ہیں لیکن بہت سی عمارتیں اور یادگار وقت کے ساتھ ساتھ ناپید ہوتی چلی گئیں۔ تحقیق کے بعد یہ بات سامنے آئی ہے کہ واپڈا ہاؤس، الفلاح بلڈنگ، پینوراما سینٹر، نقی مارکیٹ، اسٹیٹ بینک، وغیرہ کی جگہ پرانی اور تاریخی عمارتیں ہوا کرتی تھیں۔ نقی مارکیٹ میں آج جہاں رانا موٹرز موجود ہے یہاں پر سٹفلیز ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ شاہ دین بلڈنگ میں ''لورینگ'' قائم تھا ریگل سینما کے ساتھ سٹینڈرڈ ہوٹل تعمیر تھا اور واپڈا ہاؤس کی جگہ پر میٹرو ہوٹل ہوا کرتا تھا ان ہوٹلوں میں ڈانس اور شراب کی محفلیں جمتی تھیں نواب امیر محمد خان آف کالا باغ نے ان ہوٹلوں میں ہونے والی محفلوں کو ختم کروایا اس طرح باغ جناح میں جو پہاڑیاں موجود ہیں حقیقت میں ان چار پہاڑیوں کو ''آوے'' کہتے تھے ہندو ان پہاڑیوں پر مٹی کے برتن بنایا کرتے تھے ان پہاڑیوں کے اردگرد کھجور کے درخت ہوا کرتے تھے اسلامک سمٹ مینار کے ساتھ ساتھ آج جہاں قرآن مجید رکھا گیا ہے وہاں پر ملکہ وکٹوریہ کا بت نصب تھا۔ فضل دین اینڈ سنز کے ساتھ جارج پنجم کا بت نسب تھا عجائب گھر کے سامنے اورنٹیل کالج کے پرنسپل کا مجسمہ آج بھی موجود ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ریٹائرڈ ہونے کے بعد اس نے اپنی تمام جائیداد کالج کے نام وقف کر دی تھی واپس اور برطانیہ چلا گیا تھا الفلاح بلڈنگ کی جگہ کوآپرٹیو کا دفتر موجود تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی مسجد ہوا کرتی اس طرح مال روڈ پر دو سینما گھر یعنی ریگل اور پلازہ پہلے تھیٹر ہوا کرتے تھے پلازہ تھیٹر میں ڈانسنگ ہال اور بلیئرڈ کلب موجود تھا بنایا جاتا ہے کہ باغ جناح جسے لارنس گارڈن کہتے تھے کو سیراب کرنے کے لیے مغلپورہ نہر سے ایک چھوٹی سی نہر نکالی گئی تھی جو مال روڈ کے ساتھ ساتھ چلتی تھی اس کے آثار آج بھی موجود ہیں پینوراما سنٹر کی جگہ پر سول اینڈ ملٹری گزٹ آفس ہوا کرتا تھا آج جس جگہ صادق پلازہ موجود ہے وہاں ایک بلڈنگ موجود تھی یہ بلڈنگ خان بہادر نقی کے بیٹے ایم ڈی کمہار کی ملکیت تھی اسے فلموں میں کام کرنے کا شوق تھا لہٰذا اس شوق میں یہ بلڈنگ نیلام ہوئی اور لوگوں نے اسے خستہ حال میں دیکھا غلام رسول بلڈنگ میں آج جہاں ماورا بک ہاؤس ہے اس کی اوپر والی منزل پر ڈانسنگ ہال ہوا کرتا تھا اس کے ساتھ انڈس ہوٹل میں پہلے ریسٹورنٹ تھا یہ ریسٹورنٹ ایک جرمن جوڑے کے ملکیت تھا فیروز سنز کے سامنے ارجنٹینا ہوٹل تھا اس عمارت کی خصوصیت تھی کہ نیچے والا حصہ یورپی طرز کا تھا واپڈا ہاؤس کی جگہ میٹرو ہوٹل موجود تھا اور آگے چند دکانیں تھیں ان دکانوں میں ایک دکان پولیس اور آرمی کے

یونیفارم کے حوالے سے بڑی شہرت رکھتی تھی۔ استنبول چوک میں موجود ''زمزمہ توپ'' جسے ''بھنگوں کی توپ'' کہتے ہیں یہ رنجیت سنگھ کے دور میں دہلی دروازہ کے سامنے رکھی ہوئی تھی انگریزوں نے اس توپ کو موجودہ جگہ پر لاکر رکھا اس طرح مسجد شہداء کی جگہ ایک پٹرول پمپ ہوا کرتا تھا اور اس کے ساتھ چار پانچ آدمی نماز پڑھا کرتے تھے مال روڈ کو 1964ء میں دور و یہ سڑک کا درجہ دیا گیا ان تمام چیزوں کے باوجود آج بھی مال روڈ پر تقریباً 70 عمارات ایسی ہیں جو ایک تاریخی ورثہ ہیں عدالت کے حکم کے مطابق ان عمارتوں کی پرانی شکل کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا چنانچہ ان عمارتوں کی حفاظت کرنا ایک قومی فریضہ ہے ان عمارتوں میں سٹیٹ گیسٹ ہاؤس، ایچی سن کالج، پنجاب یونیورسٹی، ٹاؤن ہال، عجائب گھر، جی پی او، ہائی کورٹ اور دیال سنگھ منیشن، وغیرہ شامل ہیں۔ مال روڈ جو کبھی ٹھنڈی سڑک کے نام سے مشہور تھی آج اسے گاڑیوں کے دھوئیں اور گردوغبار نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے شہر بھر کے تجارتی مراکز اور سرکاری دفاتر کے باعث بے پناہ رش نے اس سڑک کا افسانوی حسن چھین لیا ہے۔

سٹیٹ گیسٹ ہاؤس

سٹیٹ گیسٹ ہاؤس کو مال روڈ پر منفرد حیثیت حاصل ہے یہ عمارت 1874ء میں تعمیر ہوئی وائسرائے ہند جب لاہور آتا تو اس عمارت میں قیام کرتا تھا تقسیم ہند کے بعد یہ عمارت Re-Habilitation محکمۂ بحالیاتی اراضی والوں کے قبضہ میں آ گئی 1954ء میں اسے سول سروسز اکیڈیمی میں تبدیل کر دیا گیا 1972ء کے وسط تک یہ اکیڈیمی ہی رہی لیکن اس وقت کے وزیراعلیٰ پنجاب غلام مصطفیٰ کھر نے اس عمارت کو وزیراعلیٰ ہاؤس کا درجہ دے دیا۔ 1974ء میں اسلامی سربراہی کانفرنس کے دوران وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اس عمارت کے ایک حصے کو سٹیٹ گیسٹ ہاؤس بنا دیا جبکہ باقی حصہ سول سروسز اکیڈیمی کو دے دیا گیا اسلامی سربراہی کانفرنس کے دوران سعودی عرب کے شاہ فیصل اور کویت کے امیر صالح الصباح نے سٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں قیام کیا۔ 1974ء سے لے کر آج تک اس عمارت کو سٹیٹ گیسٹ ہاؤس کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے اس عمارت میں شاہ ایران، شاہ حسین (اردن) چین کے سابق وزیراعظم ماؤزے تنگ، فلسطین کے سربراہ یاسر عرفات خاتون اول امریکہ ہیلری کلنٹن، پرنس کریم آغا خان جیسی شخصیات قیام کر چکی ہیں سٹیٹ گیسٹ ہاؤس وزارت خارجہ کے تحت ہے اور پاک پی ڈبلیو ڈی کا محکمہ عمارت

اس کی دیکھ بھال اور مرمت کے فرائض سرانجام دے رہا ہے عمارت کی موجودہ حالت اس طرح ہے جیسے 1874ء میں ہوا کرتی تھی۔ یہ عمارت اور اس کے اردگرد باغات 14 ایکڑ اراضی پر پھیلے ہوئے ہیں۔

سٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں دوسر براہان مملکت اپنے سٹاف سمیت بیک وقت رہ سکتے ہیں 1981ء میں سٹیٹ گیسٹ ہاؤس مین ائیر کنڈیشنز لگوائے گئے سٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں موجود فرنیچر، قالین اور دیگر دوسری اشیاء کروڑوں کی مالیت کی ہیں لاہور کا سٹیٹ گیسٹ ہاؤس ساؤتھ ایشیاء کا بہترین گیسٹ ہاؤس ہے تاریخی اور آسائش کے اعتبار سے دوسری کوئی عمارت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وزیر اعظم نواز شریف نے ایک قد آور تصویر تمغے کے طور پر دی تھی جو کہ ہال کے ساتھ آویزاں ہے سٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں 25 کمرے میں جن میں 5 کمرے وی آئی پی روم ہیں ایک ڈرائنگ روم ہے جہاں تقریباً 40 افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہے دربار ہال میں 100 افراد بیٹھ سکتے ہیں ڈائنگ ہال میں بوفے کھانا کھا سکتے ہیں اس عمارت کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں کوئی اینٹ یا پتھر استعمال نہیں ہوا یہ عمارت خالص مصالحہ سے تیار ہوئی ہے جس میں چونا، کوئلہ اور دوسری چیزیں شامل ہیں اس عمارت کی دیواریں اتنی چوڑی ہیں کہ اگر گرم ہوں تو جلدی ٹھنڈی نہیں ہو سکتیں اور اگر ٹھنڈی ہوں تو جلدی گرم نہیں ہو سکتیں۔

ایچی سن کالج

انیسویں صدی کے آخر میں برطانوی ہند نے تعلیمی میدان میں سرعت سے ترقی شروع کی پرانی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم کا آغاز ہوا عوام کے لیے سکول، کالج اور یونیورسٹیاں قائم کی گئی لیکن نوجوان اور راجاؤں کے بیٹوں کی تعلیم کا ابھی کوئی خاص انتظام نہ ہو سکا تھا اس مقصد کے پیش نظر 1886ء میں ایچی سن کالج تعمیر کیا گیا۔ مہاراجاؤں اور روساء کے لڑکے انگریزوں کے کہنے پر اس کالج میں داخل ہونے لگے زمانہ بدلتا گیا اس کالج نے بھی زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو تبدیل کر دیا اور اس کے دروازے عوام کے لیے بھی کھلتے گئے پاکستان بننے کے بعد یہ کالج ایک قومی ادارہ بن گیا اس ادارے نے پاکستان کو صدر، وزیر اعظم، وزیر اور بڑے بڑے سرکاری افسر پیدا کر کے دیئے۔

ایڈمنسٹریٹیوسٹاف کالج

گورنر ہاؤس کے بائیں جانب بڑے بڑے ستونوں پر کھڑی ایک وسیع عمارت ہے جسے اب پاکستان ایڈمنسٹریٹو کالج کہا جاتا ہے یہ عمارت 1901ء میں تعمیر کی گئی اس کا کل رقبہ 169 کنال 09 مرلہ اور 179 مربع میٹر ہے۔اس عمارت کے ستون عہد قدیم کے یونانی طرز کے ہیں عمارت تعمیر ہونے کے بعد انگریزوں نے اسے کلب کی شکل دے دی یہاں پر صرف انگریز افسران آیا کرتے تھے اس کے علاوہ عام انگریز بھی اس کلب کا ممبر نہیں بن سکتا تھا پاکستان بننے کے بعد بھی یہ عمارت انگریزوں کے قبضے میں رہی 1960ء میں کلب کے سیکرٹری مسٹر جی آر لورڈگس سے یہ عمارت خرید کرا سے کالج بنادیا گیا اب یہ کالج وفاقی حکومت کی اسٹیبلیشمنٹ ڈویژن کے ماتحت کام کرتا ہے اس کالج اور عمارت کی دیکھ بھال کے لیے سالانہ 16 لاکھ 93 ہزار کا بجٹ مختص کیا گیا ہے آج بھی اس کی پرانی شکل برقرار رکھی گئی ہے ذرائع کے مطابق جب اس عمارت کو کالج میں تبدیل کیا گیا تو یہاں پر کروڑوں روپے کی نوادرات بھی موجود تھیں جن میں اعلیٰ قسم کا فرنیچر اور دوسرا سامان بھی تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بعض چیزیں یہاں سے غائب ہو چکی ہیں ان میں کمرشل کراکری بھی موجود تھی جو اب ناپید ہو چکی ہے اب صرف ایک بلیئرڈ ٹیبل اور بار روم کی آدھی ٹیبل موجود ہے بلیئرڈ کی ٹیبل 100 سال سے زائد پرانی ہے اور یہ کلکتہ کی بنی ہوئی ہے جبکہ بار روم کی آدھی ٹیبل انگریز یہاں سے جاتے ہوئے لندن لے گئے تھے اس کے علاوہ آج بھی ڈائننگ ہال اور ڈرائنگ روم میں نایاب لکڑی کا بنا ہوا فرنیچر موجود ہے۔

گورنر ہاؤس

گورنر ہاؤس لاہور کی عمارت دراصل چار صدیوں کی تاریخی کہانی ہے مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر نے یہاں ایک خوبصورت مقبرہ تعمیر کرایا تھا سکھ عہد کے آخری اور برطانوی دور کے ابتدائی برسوں میں یہ مقبرہ ''گنبد کشتی والا'' یا ''گنبد پہلوانوں والا'' کہلاتا تھا مورخین نے اسے اکبر بادشاہ کے انتہائی وفادار سردار اور ماموں زاد بھائی قاسم خان سے منسوب کیا یہ مقبرہ باہر سے دو منزلہ نظر آتا ہے اصل قبر تہہ خانے میں ہے اور قبر تک پہنچنے کے لیے ایک زمین دوز راستے سے گزرنا پڑتا ہے اس مقبرے کو اب گورنر ہاؤس کے مرکز کی حیثیت حاصل ہے دوسری منزل ہشت پہلو اور

سب سے زیادہ بلند ہے سکھوں کے عہد 1764-1839 میں کئی مساجد اور مقبروں کو بارود خانہ اور اسلحہ خانہ بنا دیا گیا ان میں رد و بدل کر کے رہائش اختیار کر لی گئی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ (1799-1839ء) کے محافظ دستہ کے جمدار خوشحال سنگھ نے قاسم کے مقبرے کے گرد حویلی تعمیر کر دی جس میں وہ خود اور اس کے ماتحت افسر رہتے تھے حویلی کے اردگرد ایک وسیع باغ تھا جس کے ایک گوشے میں محافظ دستے کی رہائش کے لیے بارکیں بنا دی گئیں الحاق پنجاب 29 مارچ 1849 کے بعد یہ حویلی یکے بعد دیگرے دو ڈپٹی کمشنروں مسٹر بودنگ اور میجر ملیگر یگر کے ذاتی استعمال میں رہیں پھر انتظامی بورڈ کے صدر سر لارنس نے اسے اپنی ذاتی رہائش گاہ بنالیا اس حویلی کی وسیع پیانے پر مرمت کی گئی اور بیشتر حصے گرا کر دوبارہ تعمیر کیے گئے تعمیر و مرمت کا یہ کام 1853ء میں ہوا اور اس پر ساڑے سولہ ہزار روپے سے زائد رقم صرف ہوئی اس سال انتظامی بورڈ کو ختم کر کے سر جان لارنس کو پہلا چیف کمشنر مقرر کیا گیا 1859 میں جب پنجاب کو لیفٹیننٹ گورنر کا صوبہ بنا دیا گیا تو عمارت ہی مزید توسیع کر کے اسے گورنمنٹ ہاؤس کے نام سے موسوم کر دیا گیا موجودہ گورنر ہاؤس کا کل رقبہ 168 ایکڑ ہے اس میں سے 125 ایکڑ رقبے میں وسیع سبزہ زار اور پھولوں کی کیاریاں ہیں تقریباً 20 ایکڑ رقبے میں باغات وکاشت ہے یہاں ایک خوبصورت مصنوعی جھیل اور اس پر واقع بارہ دری بھی ہے جھیل قریباً تین ایکڑ رقبے پر محیط ہے گورنر ہاؤس کے احاطے میں ایک پہاڑی بھی ہے کسی زمانے میں یہاں اینٹوں کا بھٹہ ہوا کرتا تھا چار ایکڑ پر پھیلی ہوئی یہ پہاڑی خوبصورت سیر گاہ ہے گورنر ہاؤس کا کل تعمیر شدہ رقبہ 37409 مربع فٹ ہے اس کے مشرقی حصے میں واقع شتر خانے فیل خانے اور بارکوں کو عملے کے رہائشی مکانات میں تبدیل کر دیا گیا ہے گورنر ہاؤس کے گرد چار دیواری میں تین صدر دروازے ہیں چار دیواری کے ساتھ درختوں اور بانسوں کی قطاریں بہت خوبصورت منظر پیش کرتی ہیں گورنر ہاؤس 1903ء میں پہلی بار بجلی کے قمقموں سے روشن ہوا تھا اور ایک سال بعد اس میں بجلی کے پنکھے لگائے گئے۔

گورنر ہاؤس میں قیام کرنے والے پہلے گورنر سر ایڈورڈ میکلیگن 1919-1921ء تھے قیام پاکستان کے بعد پہلے گورنر سر فرانس موڈی 49-1947ء تھے صوبہ پنجاب کے پہلے پاکستانی گورنر سردار عبدالرب نشتر بھی اس عمارت میں 1949ء سے 1951ء تک قیام پذیر رہے اب تک اس عمارت میں پنجاب کے ایک صدر انتظامی بورڈ ایک چیف کمشنر بیس لیفٹیننٹ گورنر اور 37 گورنر اپنی رہائش اور دفاتر رکھ چکے ہیں۔ گورنر ہاؤس کو سٹیٹ گیسٹ ہاؤس کا درجہ بھی حاصل ہے یہاں پر غیر

ملکی سربراہان مملکت وزراء اعظم و اعلیٰ شخصیات کو بھی ٹھہرایا جاتا ہے اس عمارت کے بارے میں باز گشت بھی سنائی دی کہ اسے خواتین یونیورسٹی بنایا جا رہا ہے لیکن اس بارے میں ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا گیا۔

قائداعظم لائبریری

باغ جناح میں موجود قائداعظم لائبریری جس عظیم الشان عمارت میں قائم کی گئی ہے حقیقت میں جمخانہ کلب کے نام سے موسوم تھی یہ عمارت بنیادی طور پر دو بڑے ہالوں پر مشتمل ہے جنہیں ایک خوبصورت گیلری کے ساتھ ملایا گیا ہے لیفٹیننٹ گورنر سر جان لارنس اور لیفٹیننٹ گورنر سر رابرٹ منٹگمری کی نسبت سے ایک ہال کو لارنس ہال اور دوسرے کو منٹگمری ہال کہا جاتا تھا یہ دو وسیع ہال انگریز حکام اور مخیر حضرات کے چندے سے تعمیر ہوئے لارنس ہال 1861ء میں تعمیر ہوا اس عمارت کا خاکہ مسٹر سٹون سول انجینئر نے تیار کیا یہ ہال ساڑھے بتیس میٹر لمبا، ساڑھے تیس فٹ چوڑا اور تینتیس فٹ اونچا ہے اس کا فرش لکڑی کا ہے پوری عمارت کی لمبائی 65 فٹ ہے اس عمارت میں سٹیج ڈرامے ہوتے تھے اور عوامی اجتماعات بھی منعقد کیے جاتے تھے اس عمارت کی تعمیر پر 34 ہزار روپے صرف ہوئے تھے منٹگمری ہال 1866ء میں تعمیر ہوا عمارت کا خاکہ سول انجینئر مسٹر گرون نے تیار کیا اس عمارت پر ایک لاکھ چوہتر ہزار روپے خرچ ہوئے جس میں 66 ہزار روپے مرمت کی مد میں شامل تھے عمارت کی چھت ناقص ہونے کے باعث 1875ء میں ایگزیکٹو انجینئر رائے بہادر کنہیا لال کی زیر نگرانی مرمت کی گئی۔

ہال کا بڑا کمرہ 106 فٹ لمبا 46 فٹ چوڑا اور 38 فٹ اونچا ہے اس کا فرش بھی لکڑی کا ہے یہ ہال ڈانس کے لیے استعمال ہوتا تھا لارنس گارڈن اور ان ہالوں میں انگریزوں کے علاوہ کسی اور کا داخلہ ممنوع تھا کیونکہ پاکستان بننے کے بعد اس عمارت کو سول سروسز اکیڈمی کا درجہ دے دیا گیا تھا کچھ عرصہ یہ عمارت مارشل لاء ہیڈ کوارٹر کے طور پر بھی استعمال ہوتی رہی بعد ازاں اس عمارت کو پنجاب جمخانہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ 1980ء میں پنجاب جمخانہ موجودہ جگہ یعنی اپر مال شفٹ ہو گیا۔ 1981ء میں اس عمارت کو لائبریری بنانے کا منصوبہ بنایا گیا لہٰذا 25 دسمبر 1984ء کو سابق صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے اس کا افتتاح کیا۔ جناح لائبریری کے چیف لائبریرین کے مطابق پنجاب پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ نے اس عمارت کی دیکھ بھال کرتے ہوئے لائبریری بناتے وقت اس کی اندرونی اور

بیرونی شکل تبدیل نہیں کی گئی لائبریری میں ایک لاکھ پانچ ہزار کتابیں موجود ہیں اور روزانہ سینکڑوں افراد اپنی علم کی پیاس بجھانے یہاں آتے ہیں۔اب لارنس ہال کو علامہ اقبال اور منٹگمری ہال کو قائداعظم ہال کے نام سے منسوب کردیا گیا ہے لائبریری میں جو خوبصورت فانوس نصب ہے وہ عظیم دوست ملک چین نے تحفتاً دیئے ہیں۔ماضی کا ''ناچ گھر'' آج علم ودانش کا گہوارہ ہے۔

لاہور چڑیا گھر

لاہور کا چڑیا گھر برصغیر کے بہترین چڑیا گھروں میں شمار کیا جاتا رہا ہے اسے عوامی تفریح گاہ کی حیثیت حاصل ہے 1872ء میں لفٹیننٹ گورنر سر رابرٹ ڈیوبر کے دور میں یہ چڑیا گھر قائم ہوا اس وقت چڑیا گھر کی صورت آج کے چڑیا گھر سے بہت مختلف تھی یہ تھوڑے رقبے میں قائم ہوا تھا بعد میں ترقی اور توسیع ہوتے ہوئے 1942 میں یہ اس صورت کو پہنچا جس میں ہم آج اسے دیکھتے ہیں۔موجودہ چڑیا گھر کا رقبہ 124 ایکڑ پر مشتمل ہے اس احاطے میں عجیب وغریب جانوروں کا وہ انبوہ کثیر ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے چڑیا گھر کے ڈپٹی ڈائریکٹر کے مطابق یہاں پر 842 کے قریب مختلف اقسام کے جانور موجود ہیں جانوروں اور عمارت کی دیکھ بھال کے لیے تقریباً دو کروڑ روپے سالانہ خرچ کے لیے جاتے ہیں ابتدا میں یہ میونسپلٹی کے تحت کام کرتا تھا اب وائلڈ لائف کے تحت کام کرتا ہے چڑیا گھر سے تقریباً ساٹھ لاکھ سالانہ منافع آمدنی ہوتی ہے اور تقریباً پانچ ہزار افراد کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہ دنیا میں دوسرے نمبر کا چڑیا گھر ہے جو سب سے پرانا ہے پہلا چڑیا گھر 1854ء میں برطانیہ میں بنا تھا۔

فری میسن ہال

چڑیا گھر کے بائیں جانب ایک پرانی عمارت موجود ہے جسے آج 90 شاہراہ قائداعظم کہتے ہیں یہ عمارت 1859ء میں تعمیر ہوئی تھی لوگ اسے میجک ہاؤس کے نام سے یاد کرتے تھے اس عمارت میں مسلمانوں کا داخلہ سختی سے منع تھا کہا جاتا ہے کہ اس عمارت میں انگریزوں کے خفیہ اجلاس ہوا کرتے تھے پاکستان بننے کے بعد اسے پنجاب آرٹس کونسل میں تبدیل کردیا گیا پھر جب پنجاب میں سیاحت کو فروغ دینے کے لیے ایک اعلیٰ سطحی فیصلہ کیا گیا تو پنجاب ٹورازم ڈویلپمنٹ کارپوریشن کا ضلعی ہیڈ آفس بھی اسی عمارت میں قائم کیا گیا جس کا افتتاح پی ٹی ڈی سی کی بانی

چیئرمین اور پرتگال میں پاکستان کی سابق سفیر بیگم وقارالنساء نون نے کیا پھر اسے تحریک پاکستان کا میوزیم بنادیا گیا اب اسے وزیراعلیٰ ہاؤس کا درجہ حاصل ہے۔

انگریزوں کے دور کی تاریخی عمارت ''فری میسن ہال'' مختلف مرحلوں کا قیام عمل میں لایا گیا ہے جس کا افتتاح صدر پاکستان سردار فاروق احمد خان لغاری نے جنوری 1994ء میں کیا۔ اس تاریخی عمارت کو 1972ء کے بعد کی کئی حکومتوں نے سیاسی مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا اور 1989ء سے یہ عمارت 90 شارع قائداعظم کے نام پر مختلف وزرائے اعلیٰ کے سرکاری دفاتر کے طور پر استعمال ہو رہی ہے جس میں اعلیٰ سطح کے حکومتی اجلاس منعقد ہوتے ہیں۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق اس تاریخی عمارت پر 1989ء کے بعد سے لے کر اب تک یعنی 1996ء کے اعداد و شمار کے مطابق اب تک تقریباً تین کروڑ روپے کے اخراجات مرمت و توسیع کے منصوبوں پر خرچ کیے گئے ہیں۔ وزیراعلیٰ میاں افضل حیات نے اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد اخراجات میں کمی کے لیے جاری کردہ پہلے احکامات کے تحت ہی اس تاریخی عمارت میں موجود اپنے سیکرٹریٹ کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا جس کے بعد محکمہ اطلاعات و ثقافت پنجاب کو اس عمارت کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سونپ دی گئی جس کے بعد یہاں ''تحریک پاکستان میوزیم'' کا قیام عمل میں لایا گیا۔

یہ تاریخی عمارت 1911ء میں مکمل ہوئی تھی۔ 1972ء میں سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اسے قومی تحویل میں لے لیا تھا۔ اس کے بعد یہ جگہ پی پی پی کے سیکرٹری جنرل کے دفتر کے طور پر استعمال میں رہی اس کے بعد پیپلز پارٹی خواتین ونگ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اور بیگم نصرت بھٹو ویمن ونگ کی پہلی چیئرمین پرسن بھی اسی جگہ منتخب ہوئیں۔ 1977ء میں بھٹو دور کے خاتمہ کے بعد فری میسن ہال کو کچھ عرصہ کے لیے بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد ایل ڈی اے نے پارکنگ پلازہ قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ جس پر سخت عوامی ردعمل کے بعد عمل درآمد موخر کر دیا گیا۔ 1976ء میں فری میسن ہال کو پنجاب آرٹس کونسل کے سپرد کر دیا گیا۔ 1984ء میں یہاں محکمہ سیاحت کا صوبائی صدر دفتر قائم کیا گیا جس کا افتتاح پاکستان ٹورازم ڈویلپمنٹ کارپوریشن کی بانی چیئرمین بیگم وقار النساء نون نے کیا۔ 1985ء میں اس عمارت کی تعمیر نو کا ایک جامع منصوبہ تیار کیا گیا جس کے تحت یہاں پنجاب فوک آرٹس اینڈ کرافٹ کمپلیکس بنانے کا فیصلہ کیا گیا اس منصوبے پر 29.68 ملین روپے لاگت آئی اس کے بعد اچانک ہی اس فیصلے پر عمل درآمد روک دیا گیا اور اسے وزیراعلیٰ

پنجاب کا سیکرٹریٹ بنا دیا گیا۔اس وقت صوبے کے وزیر اعلیٰ میاں نواز شریف تھے جن کی ہدایت پر اس عمارت کی خوبصورتی اور حسن کو بحال کرنے کے منصوبہ پر کروڑوں روپے خرچ کیے گئے۔اس حوالے سے ہال کی آرٹ گیلری کو ڈرائنگ روم میں تبدیل کر دیا گیا۔ بالائی حصہ پر نہایت خوبصورت ڈائینگ ہال بنایا گیا۔اس کے بعد سابق وزرائے اعلیٰ میاں منظور وٹو، سردار عارف نکئی اور چوہدری پرویز الٰہی کے دور میں بھی اس تاریخی عمارت میں سیاسی نوعیت کی اہم تقریبات منعقد کی جاتی رہیں۔

پنجاب اسمبلی

اپریل 1937ء میں صوبہ پنجاب کی قانون ساز اسمبلی قائم ہوئی قانون ساز اسمبلی کے لیے ضروری تھا کہ ایک موزوں اور مستقل عمارت ہو جس میں اس کے اجلاس منعقد ہوں۔ 17 نومبر 1935ء میں اس ایوان کا سنگ بنیاد وزیر زراعت سر جوگندر سنگھ نے رکھا اور 1938ء میں یہ عمارت تکمیل کو پہنچی پنجاب اسمبلی کا پہلا اجلاس 1939ء میں یہاں منعقد ہوا یہ عمارت مغربی طرز تعمیر کا ایک شاہکار نمونہ ہے سرکاری انجینئر مسٹر سلمین کے زیر نگرانی یہ عمارت بننا شروع ہوئی تھی مگر وہ اس کی تکمیل سے قبل ہی ریٹائرڈ ہو کر انگلستان واپس چلے گئے پھر مسٹر پی ایل ورما کی زیر نگرانی میں اس عمارت کا کام اختتام کو پہنچا۔اس پر تقریباً 16 لاکھ روپے خرچ ہوئے اسمبلی چیمبر میں ایک ہشت پہلو عمارت ہے۔جس میں پچاسی کمرے ہیں یہ ایک سہ منزلہ عمارت ہے۔جس کے نیچے تہہ خانے ہیں بالائی منزل میں اسمبلی کے ممبروں کے لیے ایک عظیم الشان ہال ہے۔جس میں کم وبیش اشخاص بیٹھ سکتے ہیں گیلری میں اجلاس کی کارروائی دیکھنے کے لیے بہترین سیٹیں لگائی گئی ہیں۔چھوٹی کمیٹیوں کا اجلاس کے لیے چھ کمیٹی روم مختص ہیں دو کمروں میں لائبریری قائم ہے اس ایوان میں غیر ملکی سربراہان نے بھی خطاب کیا۔ 1974ء میں اس عالی شان عمارت میں اسلامی سربراہی کانفرنس کے اجلاس بھی منعقد ہوئے اس عمارت کی دیکھ بھال محکمہ تعمیرات ومواصلات کرتا ہے اور اس کی پرانی شکل کو بحال رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔

لکشمی انشورنس بلڈنگ

چمن آئس کریم کی بلڈنگ کو لکشمی انشورنس بلڈنگ کہا جاتا تھا اس عمارت میں رینکسن سٹور

بھی موجود تھا پاکستان بننے کے بعد اس عمارت کو احمد مختار نے خرید لیا اور پھر اس کا نام احمد مینشن رکھ دیا گیا احمد مختار قائد، ملت خان لیاقت علی خان کے قریبی عزیز تھے یہ عمارت تقریباً 100 سال پرانی ہے یہ عمارت 105 مرلہ پر مشتمل ہے اور اب یہ چار حصوں میں تقسیم ہو چکی ہے اس عمارت پر گھڑی موجود تھی لیکن اب یہ غائب ہو چکی ہے۔ 1968ء میں عدالت نے حکم دیا تھا کہ اس عمارت کو نہ گرایا جا سکتا ہے اور نہ ہی فروخت کیا جا سکتا ہے۔

دیال سنگھ مینشن کالج و لائبریری

سٹیٹ بینک کے ساتھ ایک پوشیپ کی مارکیٹ موجود ہے جسے دیال سنگھ میشن کہتے ہیں یہ عمارت 1930ء میں تعمیر کی گئی اس عمارت کے مالک سردار دیال سنگھ تھے انہوں نے اس عمارت کے علاوہ لاہور میں دیال سنگھ کالج اور دیال سنگھ لائبریری بھی تعمیر کروائی۔ وائی ایم سی اے کی عمارت نیلا گنبد کے ساتھ موجود ہے انگریزوں نے عوامی فلاح و بہبود کے لیے اس عمارت کو تعمیر کیا تھا۔ اس عمارت میں ایک زمانے میں انڈیا ئی ہاؤس ہوتا تھا جو بعد میں پاکستان ہاؤس میں بن گیا۔

کمرشل بلڈنگ

ٹولنٹن مارکیٹ اور جنرل پوسٹ آفس کے درمیان مال روڈ پر واقع کمرشل بلڈنگ کے نام سے ایک وسیع سلسلہ عمارات سے اوپر کی منزلوں میں مکانات اور دفاتر ہیں جبکہ نیچے دکانیں ہیں انگریز دور کی دکانیں آج بھی موجود ہیں جن میں کپڑے بنانے والوں کی دکانیں بھی شامل ہیں آج جس جگہ پر یہ کمرشل بلڈنگ موجود ہے ایک زمانے میں یہاں دھوبی منڈی ہوا کرتی تھی، اس کی جنوبی دیوار کپورتھلہ ہاؤس تک جاتی تھی کمرشل بلڈنگ میں آج بنکوں کے دفاتر بھی موجود ہیں آج جس جگہ سٹینڈرڈ چارٹرڈ بنک موجود ہے یہ عمارت 1945 میں تعمیر ہوئی پاکستان سے قبل اس عمارت میں الہ آباد بنک قائم تھا۔ 1957ء میں یہ چارٹرڈ بنک میں تبدیل ہو گیا اب اسے سٹینڈرڈ چارٹرڈ بنک کہتے ہیں اس بنک کی پرانی شکل آج بھی موجود ہے۔

ٹولنٹن مارکیٹ

انارکلی کے علاقے میں عجائب گھر سے متصل مال روڈ پر ایک خوبصورت عمارت ہے جو ٹولنٹن

مارکیٹ کہلاتی ہے ایک زمانے میں اسے میونسپل مارکیٹ بھی کہا کرتے تھے یہاں سے گول باغ تک جو سڑک جاتی تھی وہ نمائش روڈ کے نام سے مشہور تھی اس کی وجہ تسمیہ 1864ء میں منعقد ہونے والی نمائش ہے یہ نمائش ٹولنٹن مارکیٹ کی عمارت میں ہوئی تھی ٹولنٹن مارکیٹ کی عمارت خاص اس نمائش گاہ کے لیے تعمیر کی گئی تھی یہی تاریخی نوادارت بعد میں عجائب گھر میں منتقل کر دیئے گئے بعد ازاں گورنر کو شکایت کی گئی کہ انگریز اندرون شہر جاکر خرید وفروخت کے دوران شور شرابہ کرتے ہیں جس سے مقامی لوگ پریشان ہوتے تھے لہٰذا گورنر نے حکم دیا کہ ٹولنٹن مارکیٹ میں گوشت سبزی، اور ضروریات زندگی کی دکانیں قائم کر دی جائیں۔

پنجاب یونیورسٹی بلڈنگ

عجائب گھر کے سامنے پنجاب یونیورسٹی کی قدیم عمارت موجود ہے جسے 1869ء میں لاہور یونیورسٹی کالج کہا جاتا تھا اس کا دائرہ عمل صرف لاہور تک محدود نہ رہا بلکہ تمام صوبہ پنجاب کا تعلیمی نظام اس کے ماتحت لایا گیا تو یہاں پنجاب یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ 14 اکتوبر 1882ء کو پنجاب یونیورسٹی پہلی مرتبہ باقاعدگی کے ساتھ قانونی طور پر تسلیم کی گئی۔ سینٹ ہال کی عمارت جو 1876ء میں تعمیر ہوئی تھی جسے 1882ء میں سینٹ کے اجلاس کے لیے مخصوص کر دیا گیا عمارت میں مختلف بلاکوں میں بنی ہوئی ہے جسے مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اب اس یونیورسٹی کے بیشتر شعبے اور دفاتر نیو کیمپس میں منتقل کر دیئے گئے ہیں۔

لاہور عجائب گھر

فنون لطیفہ، آثار قدیمہ، سکہ سازی اور تاریخ کے بعض اہم نوادرات وعجائبات کے ذخیروں کے لحاظ سے لاہور کا عجائب گھر، پاکستان بھر میں سب سے قدیم اور عظیم عجائب گھر ہے اس کا آغاز 1864ء میں ایک صنعتی نمائش سے ہوا اور یہ نمائش ٹولنٹن مارکیٹ میں منعقد کی گئی بڑی بڑی ریاستوں، رئیسوں اور پنجاب کے امیروں، سرداروں اور جاگیرداروں نے جوش وخروش سے اس نمائش میں حصہ لیا ان نوادرات میں زیورات، لباس، قالین، ہاتھ کی بنی ہوئی نایاب تصاویر، ادویات، اوزار، ہتھیار، تلواریں، اور دیگر اشیاء و نمائش میں پیش کی گئیں 30 سال کے عرصے میں قدیم وجدید اشیاء کا اس قدر وسیع ذخیرہ ہو گیا کہ کسی دوسری عمارت کی ضرورت لاحق ہو گئی لہٰذا

1890ء میں لاہور عجائب گھر کی موجودہ عمارت کی بنیاد اسی چندے سے رکھی گئی جو ملکہ وکٹوریہ کی گولڈن جوبلی کے سلسلے میں فراہم کیا گیا تھا۔ تکمیل عمارت کے بعد عجائب گھر کی اشیاء اس عمارت میں منتقل ہوئیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عجائب گھر کا دائرہ محدود کیا جاتا رہا اور کئی شعبے یہاں سے ہٹا دیئے گئے مردہ حیوانات کا شعبہ، گورنمنٹ کالج کو منتقل کر دیا گیا اب لاہور کا عجائب گھر صرف فنون لطیفہ اور آثار قدیمہ تک محدود کر دیا گیا ہے۔

پنجاب پبلک لائبریری

پنجاب پبلک لائبریری 8 نومبر 1884ء کو لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کی خواہش پر مندرجہ ذیل قرار داد کی بنیاد پر قائم کی گئی۔

لیفٹیننٹ گورنر پنجاب اس بات کی شدید خواہش رکھتے ہیں کہ لاہور میں ایک پبلک لائبریری قائم کی جائے جو کہ عوام الناس کے ہر طبقے کے لیے کھلی رہے یہ لائبریری سرکاری مطبوعات اور عمومی ادب سے مزین ہو جو مشرقی یا دیگر کوئی ہو اس کا بنیادی تصور صرف یہی نہ ہو کہ مختلف حکومتی لائبریوں کے وہ حصے جو فوری حوالہ جات کے لیے اب حکومتی شعبہ جات کو درکار نہیں، انہیں یکجا کر دیا جائے بلکہ یہ عوامی سطح کا ایک ایسا ادارہ ہوگا جو بڑے پیانے پر صوبے کے مفاد میں ہو۔

ابتداء میں یہ لائبریری تاریخی اہمیت کی حامل شاہی عمارت بارہ دری وزیر خاں میں شروع کی گئی۔ یہ بارہ دری مغل شہنشاہ شاہ جہان کے دور حکومت میں گورنر لاہور نواب وزیر خاں نے تعمیر کروائی تھی۔ اسے حکومت پنجاب کے تعاون سے قائم کیا گیا جس کا مقصد ایک پبلک لائبریری اور مطالعہ مہیا کرنا تھا جو کہ ہر طبقے کے لوگوں کے لیے بلا امتیاز مذہب جنس نسل اور مسلک کھلی رہے۔

لائبریری کے دیگر بلاک بالترتیب 1924، 1939، 1992 میں قائم کئے گئے۔ ایک اضافی بلاک ہاؤسنگ آڈیٹوریم اور بیت القرآن کا سیکشن 1968ء میں قائم کیا گیا اس وقت کے گورنر مغربی پاکستان جنرل محمد موسیٰ نے اس بلاک کا افتتاح 1968 میں کیا۔

پنجاب پبلک لائبریری لاہور شہر کے قلب میں لائبریری روڈ پر این سی اے اور عجائب گھر شاہراہ قائداعظم سے ملحقہ واقع ہے یہ شہر کے مشہور تعلیمی اداروں اور پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپس سے گھری ہوئی ہے۔ نئی اور پرانی انارکلی کا تجارتی مرکز۔ میٹروپولیٹن کارپوریشن لاہور کا مرکزی

دفتر ٹاؤن ہال اور صوبائی حکومت کے دفاتر یعنی سول سیکرٹریٹ پنجاب پبلک لائبریری سے نہایت مختصر فاصلے پر واقع ہیں۔ الغرض پنجاب پبلک لائبریری لاہور مرکز میں واقع اور مطالعے کے لیے نہایت سازگار اور پرسکون ماحول کی حامل ہے۔

پنجاب پبلک لائبریری میں انگریزی اردو فارسی عربی اور پنجابی زبانوں میں علوم کا نادر ذخیرہ موجود ہے یہاں تین لاکھ کے لگ بھگ کتب مجلد مجموعہ جات رسائل حتی کہ غیر منسقم ہندوستان کے گزٹ اور قریباً 850 قلمی نسخہ جات جمع کئے گئے ہیں۔ لائبریری میں 170 جریدے باقاعدہ آتے ہیں جن میں 24 رسائل چندے کی بنیاد پر جبکہ باقی تمام عطیہ کے طور پر بھیجے جاتے ہیں۔ 12 عدد روزنامے لائبریری میں آتے ہیں۔ لائبریری میں 500 کے قریب نابیناؤں کے لیے مخصوص کتب بھی موجود ہیں۔

جناح ہال

جناح ہال جسے ایک زمانے میں ٹاؤن حال کے نام سے یاد کیا جاتا تھا لفٹیننٹ گورنر سر چارلس ایچی سن نے 1887ء میں ٹاؤن ہال کی بنیاد رکھی اس ہال کا نام ملکہ وکٹوریہ کی نسبت سے وکٹوریہ جوبلی ٹاؤن ہال رکھا گیا کیونکہ 1887ء کا سال ملکہ وکٹوریہ کی 50 سال جوبلی کا سال تھا ڈیوک آف کلارنس نے 1890ء میں اس عمارت کا رسمی افتتاح کیا یہ عمارت مسٹر بل کی زیر نگرانی تعمیر ہوئی اور اس پر 60 ہزار روپے صرف ہوئے اس عمارت کا ڈیزائن مسٹر بوگ سن نے تیار کیا جس پر انہیں پانچ سو روپے انعام دیا گیا ٹاؤن ہال کا مقصد شہری حقوق کے نمائندوں کے لیے مل بیٹھنے اور اہلیان شہر کے اجتماعی مفادات پر غور و فکر کے لیے ایک موزوں جگہ فراہم کرنا تھا۔ 1950ء کے عشرے میں اس ہال کو جناح ہال کا نام دے دیا گیا۔

جنرل پوسٹ آفس (GPO)

ڈاک خانے کا موجودہ نظام انگریز دور کی پیداوار ہے مال روڈ پر واقع جنرل پوسٹ آفس کی عمارت 1849ء میں تعمیر ہوئی اس کے قریب بھی پوسٹ ماسٹر کا بنگلہ موجود تھا 1912ء میں موجودہ خوشنما جدید وضع کی عمارت تعمیر ہوئی۔ جی پی او کی موجودہ عمارت تقریباً تین کنال 6 مرلہ رقبہ پر پھیلی ہوئی ہے جنرل پوسٹ آفس کا اصل نقشہ آج بھی برٹش لائبریری لندن میں موجود ہے۔ جی پی او

کی گھڑی بڑی نایاب ہے۔ 1983ء میں جی پی او کے فارن یونٹ کو آگ لگ گئی جس سے عمارت کو نقصان پہنچا لہٰذا حکومت برطانیہ کی درخواست پر سابق صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے اس کو پرانی شکل میں بحال کرنے کا حکم دیا۔ پی ڈبلیو ڈی نے کراچی کی ایک پرائیویٹ کمپنی کے ساتھ مل کر اس عمارت کو اصل شکل دی اس عمارت پر پلاسٹر آف پیرس کی تہہ جمی ہوئی تھی اسے صاف کیا گیا۔ نیپا کی پرانی بلڈنگ کی اینٹیں اسی عمارت میں استعمال کی گئی اور اسے وہی شکل دے دی گئی جو 1912 میں موجود تھی 1996ء میں جی پی او کی عمارت کا کام مکمل ہو گیا اس منصوبے پر تقریباً ڈیڑھ کروڑ روپے خرچ ہوئے۔ 1954ء میں موجودہ پوسٹ ماسٹر جنرل آفس تعمیر ہوا اور 1956ء میں جی پی او یہاں منتقل ہو گیا۔

محکمہ ڈاک، پاکستان کے بڑے محکموں میں سے ایک ہے جہاں روزانہ کے معمولات سے آج بھی قدیم دور کی یاد تازہ ہو جاتی ہے ٹیلی فون، کمپیوٹر، ای میل اور موبائل فون کے آنے سے قبل پیغامات کا واحد طریقہ خط و کتابت ہی تھا جونہی ڈاکیا گاؤں میں آتا تو لوگ اس کی طرف لپکتے اور پوچھتے کہ ان کے پیاروں کی طرف سے ان کا کوئی خط آیا ہے دور حاضر میں کمپیوٹر اور ای امیل کی وجہ سے خط و کتابت کا رواج کافی حد تک کم ہو گیا ہے لیکن ان ذرائع کے باوجود بھی ڈاکخانے اسی رفتار سے کام کر رہے ہیں جس رفتار سے ماضی میں کام کر رہے تھے۔

جنرل پوسٹ آفس لاہور، پاکستان کا سب سے بڑا اور قدیم ڈاکخانہ ہے 1887ء میں ملکۂ وکٹوریہ کے تخت نشین ہونے کی گولڈ جوبلی کے موقعہ پر وائی ایم سی اے کی عمارت اور جی پی او کا سنگ بنیاد رکھا گیا اس سے قبل ٹیلی گراف آفس انارکلی بازار میں قائم تھا جی پی او کی موجودہ شکل اس وقت سامنے آئی جب اس عمارت کو پوسٹ آفیس میں تبدیل کر دیا گیا۔ جی پی او کا افتتاح پورے ہندوستان میں کلاک ٹاورز اور یادگار عمارتوں کے ساتھ ایک ہی موقع پر ہوا یہاں آویزاں کی گئی تاریخی گھنٹی کو ٹیلی گراف آفس سے اتار کر لگایا گیا ہے تاکہ پرانی عمارت کا تسلسل برقرار رہے جی پی او مال روڈ اور نابھہ روڈ کے سنگم پر واقع ہے 1916ء کے لاہور گزیٹیر کے مطابق یہ لاہور کی ایک خوبصورت ترین عمارت ہے اس عمارت میں ایک گھنٹہ گھر اور چار مینار ہیں۔ اس کا کل رقبہ 4.425 ایکڑ ہے۔ 1904ء میں اس عمارت کو محکمہ ڈاک کے حوالے کر دیا گیا اور اس سال اس عمارت نے کام کرنا شروع کر دیا۔ لاہور شہر میں گنگا رام ہسپتال کے سامنے فٹ پاتھ پر لگا قدیم لیٹر بکس آج بھی اس عہد کی یاد تازہ کرتا ہے۔

1904ء میں لاہور کی ہر گلی میں ایسے لیٹر بکس موجود تھے جن پر ملکہ وکٹوریہ کی تصویر کندہ کی گئی تھی اس زمانے میں ان کی تعداد 132 تھی یہ دور دراز کے علاقوں میں نصب کئے گئے تھے لیٹر بکس سے ڈاک اکٹھی کرنے کے لیے محکمہ ڈاک کا اہلکار یا ڈاکیا سائیکلوں پر سوار ہو کر جاتا چیئرنگ کراس، لاہور کینٹ اور مغل پورہ کے ڈاک خانے لاہور کے مشہور ڈاک خانے تھے جہاں بہت زیادہ ڈاک اکٹھی ہوتی تھی ریلوے اسٹیشن سے ڈاک گھوڑا گاڑیوں کے ذریعے اکٹھی کی جاتی تھی جس کے بعد ڈاکیے انہیں مطلوبہ مقام پر پہنچا دیتے ہر ہفتے جی پی او کی عمارت پر دو جھنڈے لہرائے جاتے تھے سرخ جھنڈا اس بات کا اشارہ ہوتا تھا کہ بیرون ملک سے خطوط ممبئی پہنچ چکے ہیں اور جلد ہی ان کی آمد لاہور متوقع ہے جبکہ سفید جھنڈا اس روز لہرایا جاتا تھا جس روز لاہور سے دوسرے ممالک کے لیے ڈاک کی ترسیل کی جاتی تھی یہاں یہ ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ 1876ء تک فیروز پور، بہاولپور، سیالکوٹ، جہلم، راولپنڈی اور پشاور سے آنے والی ڈاک جی پی او کی پرانی عمارت میں ہی وصول کی جاتی تھی۔

جی پی او کی عمارت دو بڑے ہالوں پر مشتمل ہے ایک ہال میں اندرون ملک ڈاک وصول کی جاتی ہے جبکہ دوسرے ہال میں بیرون ملک بھیجنے والی ڈاک وصول کی جاتی ہے یادگاری ٹکٹیں، ثقافتی ورثہ اور جنگلی حیات کی تصاویر والی ٹکٹیں جاری کرنے والا شعبہ بھی اسی عمارت میں ہے تین ہزار افراد پر مشتمل عملہ روزانہ بیس ہزار ترسیلات دوسرے شہروں میں بھیجتا ہے۔

جی پی او میں ٹوکن ٹیکس وصول کرنے کے علاوہ پنشن کی ادائیگی بھی کی جاتی ہے ان دنوں میں یہاں آنے والے لوگوں کی تعداد 3 ہزار سے بھی تجاوز کر جاتی ہے اس کے باوجود ملازمین بہت خوش اسلوبی سے اپنی ڈیوٹی انجام دیتے ہیں اس تاریخی عمارت میں آج ہر کام کمپیوٹر سے انجام دیا جاتا ہے خطوط بھیجنے والے لوگوں کو ایک کاؤنٹر پر ہی تمام درکار معلومات فراہم کر کے ان سے ڈاک وصول کی جاتی ہے۔ انٹرنیٹ کی سہولت دستیاب ہونے سے ڈاک کی تعداد میں معمولی کمی واقع ہوئی ہے لیکن تجارتی ڈاک میں اضافہ کی وجہ سے پوسٹ آفس آج بھی منافع کمانے والا ادارہ ہے۔ جنرل پوسٹ آفس لاہور ڈاک کی سہولت مہیا کرنے کے علاوہ بیت المال کے معاملات بھی سنبھالتا ہے۔

جی پی او میں صبح 8 بجے سے شام 5 بجے تک ایک خوبصورت گہما گہمی دیکھنے میں آتی ہے جب اہلکار اپنے کام میں مصروف ہوتے ہیں خط کو منزل تک پہنچانے کا سب سے پہلا قدم لیٹر بکس

ہی ہوتا ہے جہاں سے خط کے سفر کا آغاز ہوتا ہے لیٹر بکس سے خطوط نکالنے کے بعد ایک بڑے ہال میں ان کو اکٹھا کیا جاتا ہے جہاں سے خطوط کو ان کی منزل کی طرف روانہ کیا جاتا ہے آج کئی سال گزرنے کے بعد بھی یہ عمارت اپنی اصل حالت میں قائم و دائم ہے وقت کے ساتھ ساتھ اس کی تزئین و آرائش ہوتی رہتی ہے یہاں لٹکتی ہوئی ٹیوبوں اور بلبوں سے ہالوں کا اندرونی منظر نظروں کو بہت اچھا لگتا ہے۔

جنرل پوسٹ آفس کی عمارت کو ہر سال 14 اگست اور ڈاک کے عالمی دن 9 اکتوبر کو برقی قمقموں سے سجایا جاتا ہے 9 اکتوبر کو عمارت پر پاکستانی جھنڈے کے ساتھ یونیورسل پوسٹل یونین کا جھنڈا بھی لہرایا جاتا ہے۔

لاہور ہائی کورٹ

لاہور ہائی کورٹ کی عمارت، مال روڈ کے کنارے مزار شاہ چراغ سے متصل اور جنرل پوسٹ آفس کے قریب واقع ہے پہلے اس عمارت میں پنجاب چیف جسٹس کا اجلاس ہوتا تھا چنانچہ اب بھی پرانے لوگوں کی زبان پر اس عمارت کے لیے ہائی کورٹ کی بجائے چیف کورٹ کا لفظ ہی آتا ہے یہ عمارت 1879ء میں تعمیر ہوئی اس کا ڈیزائن ایک ماہر فن تعمیر مسٹر بروسنگٹن نے تیار کیا اور اس کی تعمیر ایگزیکٹو انجینئر مسٹر جے ای ہلٹن کے زیر نگرانی ہوئی اس عمارت پر -/3.12.837 روپے صرف ہوئے۔ 1919ء میں اس عمارت میں ہائی کورٹ قائم کی گئی اور قیام پاکستان کے بعد اس میں سپریم کورٹ آفس بھی قائم رہا یہ ایک وسیع عمارت ہے جس کے صحن میں سنگ مرمر کا ایک فوارہ اور اطراف میں چھوٹے چھوٹے خیاباں ہیں جو اس کے حسن میں اضافہ کر رہے ہیں۔ پتھر میں جالی کا کام نہایت دیدہ زیب ہے عمارت کے چاروں اطراف بڑے بڑے برآمدے ہیں اس عمارت پر دہلی کے قطب مینار کے وضع کردہ دو مینار ہیں جن کی طرز تعمیر اسلامی ہے کونوں پر دو برجیاں ہیں میناروں کی بلندی 95 فٹ اور برجیوں کی بلندی 72 فٹ ہے عمارت کے بڑے ہال کا فرش سنگ مرمر کا ہے اور دوسرے کمروں کا فرش ہشت پہلو چوکیوں کا ہے بڑا ہال 55 فٹ لمبا اور 35 فٹ چوڑا ہے۔

غلام رسول بلڈنگ

الفلاح بلڈنگ کے ساتھ مال روڈ پر غلام رسول بلڈنگ موجود ہے یہ عمارت 1917ء میں تعمیر ہوئی یہ 09 کنال اراضی پر بنی ہوئی ہے غلام رسول معروف اداکار اسلم پرویز کے والد تھے آج بھی یہ عمارت اس خاندان کی ملکیت ہے اس عمارت کی حالت بڑی خستہ ہو چکی ہے پی ڈبلیو ڈی کے مطابق خراب سیوریج کے باعث اس کی بنیادیں کمزور ہو چکی ہیں مالکان کے مطابق متعدد مرتبہ دکانداروں کو نوٹس دیا گیا کہ دکانیں خالی کر دیں مرمت کرنے کے بعد آپ واپس اپنا کاروبار چلا سکتے ہیں لیکن وہ رضامند نہیں ہوئے ایک سال قبل صبح چھ بجے فیروز سنز کے سامنے شیڈ گر گیا تھا جن سے کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔

ڈ نگا سنگھ بلڈنگ

مسجد شہداء کے سامنے باوا ڈ نگا سنگھ بلڈ نگ 1927ء میں تعمیر ہوئی تقسیم ہند کے وقت عمارت کی بڑی اچھی حالت تھی پاکستان بننے کے لیے بعد لاہور کے رہائشی تاج دین نے اسے خرید لیا سیوریج کا نظام خراب ہونے کے باعث عمارت کی حالت خستہ ہو گئی ہے عمارت پر لگی ہوئی گھڑی چابی دینے سے آٹھ دن چلتی تھی لیکن اب یہ خراب ہے اس عمارت کا رقبہ تقریباً 08 کنال ہے اس کے باوجود عمارت کا اگلا حصہ خستہ ہو گیا ہے 20 سال قبل شیزان ہوٹل اس عمارت میں موجود تھا۔

شاہراہ قائداعظم پر تاریخی اور بیش قیمت عمارات کو ختم کر کے وہاں جدید عمارتوں کی تعمیر کا .سلسلہ بدستور جاری ہے لاہور ہائیکورٹ اور محکمہ آثار قدیمہ، شاہراہ قائداعظم پر واقع تقریباً 70 عمارات کو قومی و تاریخی ورثہ قرار دے چکی ہے۔

وائی ایم سی اے بلڈنگ

مال روڈ پر انارکلی اور نیلا گنبد کے قریب واقع ایک پرانی مگر نفیس اور سادہ عمارت پر وائی ایم سی اے کے الفاظ واضح نظر آتے ہیں اس آرگنائزیشن کا مختصر تعارف یہ ہے کہ لندن میں ایک شخص جارج ویلیم نے 06 جون 1844ء میں اپنے 12 ساتھیوں کے ساتھ اس ادارے کی بنیاد رکھی جس کا بنیادی مقصد نوجوانوں کو ایک بہترین اور مددگار زندگی گزارنے کے لیے حوصلہ افزائی فراہم

کرنا تھا یہ آرگنائزیشن شروع میں لندن میں بڑی تیزی سے مقبول ہوئی اور 1851ء تک مغربی یورپ کے بہت سے ملکوں امریکہ اور کینیڈا میں شروع ہوگئی 1876ء میں اس کے ایک رکن مجید ایڈورڈ نیو بدلی نے لاہور اور بمبئی میں اس کی بنیاد رکھی۔ ورلڈ الائنس آف وائی ایم سی اے کا ہیڈ کوارٹر جینوا سوئٹزرلینڈ میں ہے وائی ایم سی اے کی علامت تین کونوں والی لال تکون رکھی گئی جس میں جسم دماغ اور روح کے ملاپ کو ظاہر کیا گیا۔ وائی ایم سی اے کے پاکستان میں لاہور کے علاوہ کراچی، حیدرآباد، کوئٹہ اور پشاور میں بھی دفاتر ہیں۔ وائی ایم سی اے میں سب سے پہلے ٹائپنگ، شارٹ ہینڈ، اور بک کیپنگ کی کلاسز شروع ہوئیں اس کے علاوہ انگلش، فرنچ، اور جاپانی لینگویج کی کلاسیں بھی صبح و شام جاری رہی ہیں گذشتہ کافی عرصے سے پرائمری تک بچوں کے لیے ایک سکول بھی قائم کیا گیا جو کامیابی سے جاری ہے۔

تحریر و تحقیق: محسن اقبال۔ روزنامہ ''پاکستان'' لاہور
اشاعت خاص ایڈیشن۔ 31 مئی 1999ء

○

مینار پاکستان، لاہور

23 مارچ 1940ء کو لاہور کے منٹو پارک (اقبال پارک) میں مسلم لیگ کا وہ تاریخی اجلاس منعقد ہوا جس میں وہ قرارداد پیش کی گئی جس میں مسلمانوں کے لیے ایک الگ آزاد اور خود مختار مملکت کے قیام پر زور دیا گیا تھا اور پھر چند برس بعد ہی ''پاکستان کا نقشہ دنیا کے نقشے پر ابھرا۔''

وہ مقام جہاں قائداعظم کی صدارت میں یہ اجلاس ہوا وہاں اب بہت خوبصورت مینار اس قرارداد لاہور کی یاد تازہ کر رہا ہے مینار پاکستان کی تعمیر کے سلسلے میں سابق صدر ایوب خان نے بیس مارچ 1959ء کو پاکستان ڈے میموریل کمیٹی تشکیل دی جس میں بہت سی اہم شخصیات شامل تھیں مینار کی حیثیت اول 23 مارچ 1960ء 25 رمضان المبارک 1379ء ہجری بروز بدھ گورنر مغربی پاکستان اختر حسین نے رکھی۔ اس موقع پر کمشنر لاہور ڈویژن شیخ اکرام الحق نے استقبالیہ دیا۔

مینار کے ڈیزائن کی تیاری روس کے ترک نژاد ماہر تعمیرات جناب نصیرالدین مراد نے کی انہوں نے تین نقشے بنائے تاہم ان پر اخراجات کا اندازہ زیادہ ہونے کی بناء پر دو ڈیزائن مسترد کر دیئے گئے تاہم موجودہ ڈیزائن 2 نومبر 1962ء کو منظور کر لیا گیا۔ یادگار، قرارداد پاکستان کی تعمیر کا ٹھیکہ 9 مئی 1963ء کو تحریک پاکستان کے کارکن اور مسلم لیگی راہنما میاں عبدالخالق کو دیا گیا تقریباً 75 لاکھ روپے کی لاگت سے مینار پانچ سال کی مدت میں مکمل ہوا اس مقصد کے لیے سب سے بڑا مسئلہ تعمیر پر خرچ ہونے والی رقم کی فراہمی تھا کیونکہ حکومت کے پاس بھی فنڈ مخصوص تھا لہٰذا نومبر 1962ء میں سینما کے ٹکٹوں پر دس پیسے اور گھڑ دوڑ کے ٹکٹوں پر پچاس پیسے ٹیکس لگا کر رقم جمع کی گئی تاہم جناب مراد خان نے ڈیزائن اور تعمیری کام کی نگرانی کی مقررہ فیس دو لاکھ باون ہزار روپے نہ لی اور کام کی نگرانی بھی مفت کرتے رہے۔

مینار پاکستان کی بلندی ایک سو چھیانوے فٹ ہے ایک سو اسی فٹ تک اسے لوہے اور کنکریٹ سے بنایا گیا ہے باقی حصہ سٹین لیس سٹیل وغیرہ سے مل کر بنا ہے اس کے سرے پر بھی

سٹیل ہی کا برج ہے اس کے تمام لوہے پر موسم قطعی اثر نہیں کرتا مینار پاکستان کی پانچ گیلریاں اور کوئی 20 منزلیں ہیں۔ اس کی پوری سیڑھیاں تقریباً 330 ہیں مینار کی تعمیر میں استعمال ہونے والے سازوسامان سے بھی عمارت کا پس منظر عیاں ہوتا ہے مینار کے نچلے حصے میں چبوترہ ہے اسے کھردرے پتھروں سے بنایا گیا ہے جو اس بات کے غماز ہیں کہ پاکستان کس طرح کسمپرسی اور بے سروسامانی کی حالت میں بنا دوسرے چبوترے پر نرم اور ملائم پتھر ہیں اس طرح جوں جوں اوپر جائیں پتھر کی ملائمیت بڑھتی جاتی ہے جس کا مطلب ہے کہ اب پاکستان بتدریج خوشحالی، ترقی اور سربلندی کی طرف گامزن ہے جبکہ اس کے آخری سرے پر چمکتا اسٹیل کا گنبد ہے جو سورج کی روشنی سے چمکتا ہے گویا پاکستان عالم اسلام اور بین الاقوامی برادری میں خوب جگمگا رہا ہے بقول جناب مراد خان نے ڈیزائن تیار کرنے سے پیشتر قیام پاکستان کے مطالبہ کے پس منظر اس مطالبہ کے بتدریج ارتقاء اور کامیابی اور بعد ازاں پاکستان کی مسلسل ترقی کا بغور مطالعہ کیا یہ تمام خصوصیات اور پہلو ڈیزائن میں موجود ہیں۔ یہ 157 ایکڑ رقبے پر مشتمل ہے۔

مینار پاکستان کے نچلے حصے میں جدوجہد آزادی کی پوری تاریخ پر روشنی ڈالنے کے لیے مختلف تحریریں رقم کی گئی ہیں اس کے لیے اس حصے میں سات سات فٹ لمبی اور دو دو فٹ چوڑی سنگ مرمر کی سلیں نصب ہیں ان پر اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسمائے مبارک اور قرارداد پاکستان کی پوری عبارت اردو، انگریزی اور بنگلہ زبانوں میں درج ہیں ایک سل پر علامہ اقبال کی نظم اور قائد اعظم کی تقریروں کے اقتسابات کندہ ہیں اس کے علاوہ سورۂ بقرہ سورۂ آل عمران سورۂ مائدہ اور سورۂ الرعد بھی یہاں مقدس اور روح پرور ماحول پیدا کرتی ہیں۔

مینار کے صدر دروازے پر بھی آیات قرآنی درج ہیں اوپر دلکش نقش ونگار بھی عجیب بہار دکھاتے ہیں یہ خطاطی کے فن پارے معروف خطاطوں جن میں حافظ محمد یوسف سدیدی، صوفی خورشید عالم رقم، محمد صدیق الماس رقم، ابن پروین رقم اور محمد اقبال شامل ہیں نے بنائے دوسرے چبوترے پر چاند کی شکل کا حوض ہے جو ملک کے دو حصوں مشرقی اور مغربی پاکستان کے ترجمان ہیں۔ صد افسوس کہ مشرقی پاکستان ہم سے کٹ کر الگ وطن یعنی بنگلہ دیش کی شکل اختیار کر چکا ہے اس سے اوپر والے چبوترے پر پانچ کونوں والا ستارہ ہے۔ اس کے وسط میں ہی کنول کے پھول جیسا مینار ہے پہلے پہل مینار کی تمام دیکھ بھال میموریل کمیٹی ہی انجام دیتی تھی جون 1982 ہُوا سے لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی (ایل ڈی اے) نے اپنی تحویل میں لے لیا پھر اس کے گردونواح میں قطعات کو

بہتر پارکوں اور باغوں کی صورت دینے کے ساتھ ساتھ صفائی کا بھی موثر انتظام ہوا اس ادارے نے مختلف مراحل میں اس کی ترقی کے کام نمٹائے بوڑھے راوی کی جگہ 2000 فٹ لمبی اور 190 فٹ چوڑی جھیل بنائی گئی۔ داتا نگر پل کی جانب سے داخلے کے گیٹ بنائے اور جھیل میں گھومنے والا ٹی سٹال بنایا۔

مینار پاکستان کی تعمیر کو استعاراتی زبان دی گئی ہے تعمیراتی سامان کو اس انداز میں استعمال کیا گیا ہے کہ یہ بذات خود جدوجہد آزادی کی داستان سناتا ہے مینار کے ابتدائی چبوترے کی تعمیر کھردرے پتھروں سے کی گئی ہے جو اس بات کی علامت ہیں کہ پاکستان کس بے سروسامانی کے عالم میں کھٹن مراحل سے گذر کر بنا تھا اس سے اگلے چبوترے پر ملائمت بڑھ جاتی ہے جوں جوں مینار اوپر چڑھتا ہے ملائم پتھروں کا استعمال بھی زیادہ کیا گیا ہے جو اس امر کا عکاس ہے کہ پاکستان بتدریج ترقی کی راہوں پر رواں دواں ہے اس کے آخری سرے پر چمکنے والا گنبد اس بات کا اظہار ہے کہ پاکستان اقوام عالم اور اسلامی دنیا میں نمایاں مقام کا حامل ملک ہے۔

مینار پاکستان کے دوسرے چبوترے پر چاند کی شکل کا حوض ہے اس کے دونوں کونے آپس میں ملے ہوئے ہیں جو مشرقی اور مغربی پاکستان کے اتحاد کی علامت تھے اس پر پانچ کونوں والا تارا ملک کے پانچ صوبوں کا نمائندہ ہے۔

مینار پاکستان کے سائے میں موجود چھوٹی سی جھیل دراصل راوی کی پرانی گذرگاہ کی باقیات میں سے ہے اسے کبھی بڈھا راوی کہا جاتا تھا بڈھا راوی اب ایک جھیل کی صورت میں اس کے ماضی کی یاد دلاتا ہے یہاں پر ایک گھومنے والا ریسٹورنٹ بھی تعمیر کیا گیا۔ ایل ڈی اے نے مینار پاکستان کو اپنی تحویل میں لیا تو اس نے پچاس لاکھ روپے کی لاگت سے اسے جھیل میں بدل دیا تھا بڈھے راوی یا جھیل کا رقبہ نو ایکڑ کے لگ بھگ ہے اس کی لمبائی 2000 فٹ اور چوڑائی 190 فٹ ہے اسے باقاعدہ جھیل کی شکل دینے کے لیے پرانے دریا میں وسعت کی گئی تھی۔ اس کا کورڈ ایریا 60 × 480 پر مشتمل ہے

مینار پاکستان کی تعمیر کے ابتدائی دنوں میں اسے یادگار پاکستان کے نام سے یاد کیا جاتا تھا البتہ اہل دانش اور پڑھے لکھے لوگوں نے اس پر احتجاج کیا اور یہ دلیل پیش کی کہ یادگار تو اس چیز کی ہوتی ہے جو ختم ہو جائے مگر الحمد للہ پاکستان ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے لہٰذا اسے یادگار قرار داد پاکستان'' کہا جانے لگا جو چند سال بعد ہی تبدیل کر کے ''مینار پاکستان'' ہو گیا! سے اب مینار

پاکستان ہی کہا جاتا ہے جو پاکستان کے قیام کی قومی علامت بن چکا ہے یہاں داخلے کے لیے کوئی ٹکٹ نہیں ہے کیونکہ یہ ہر پاکستانی کا سرمایہ ہے بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی نے اپنے دورۂ پاکستان کے دوران مینار پاکستان پر حاضری دے کر دوقومی نظریئے پر اپنے یقین کی مہر ثبت کردی تھی مینار کے متعلق ممتاز دانشور مختار مسعود، آواز دوست میں لکھتے ہیں ہمیں یہ طے کرنے میں بڑی مشکل پیش آئی کہ قرارداد پاکستان کو علامت اور عمارت کے طور پر کیا صورت دی جائے باغ، جھیل، فوارے، مسجد، کتب خانہ، عجائب گھر، ہال، ہسپتال، دروازہ، درسگاہ یا مینار فہرست کچھ اس قسم کی بنی تھی مگر بحث وتمحیص کے بعد کامیابی کا سہرہ مینار کی صورت سجا۔ برصغیر میں عالمگیری مسجد کے میناروں کے بعد جو پہلا اہم مینار مکمل ہوا وہ مینار قرارداد پاکستان ہے۔

اقبال پارک میں کسی یادگار کے قیام کی تجویز لاہور کارپوریشن کے ایک سابق ایڈمنسٹریٹر ملک عبداللطیف خان نے پیش کی تھی۔

قیام پاکستان کے بعد عوامی حلقوں نے یہ مطالبہ کیا کہ قرارداد کی یاد کو قائم رکھنے کے لیے منٹو پارک کی جلسہ گاہ میں کوئی یادگار عمارت تعمیر کی جائے اس کے متعلق بہت بحث وتحقیق بھی ہوئی کہ عمارت کی نوعیت کیا ہو؟ یہ کوئی لائبریری ہو، عبادت گاہ یا مینار وغیرہ۔ آخر مینار کی تعمیر پر اتفاق ہوا کیونکہ مینار کو فتح اور کامیابی کی علامت قرار دیا جاتا ہے۔

مینار پاکستان کو ملک کے اتحاد واتفاق کی علامت قرار دیا جاتا ہے یہ قوم کے سرمائے سے ہی تعمیر ہوا تھا اور قومی ملکیت ہی قرار دیا جاتا ہے۔

○

اسلامک سمٹ مینار، لاہور

سفید ماربل کا 139 فٹ 6 انچ اونچا یہ سمٹ مینار 1974 کی دوسری اسلامی سربراہی کانفرس کی یادگار ہے۔ ''سمٹ'' کا مطلب ''چوٹی کانفرنس'' ہوتا ہے جس میں دنیا بھر کے اسلامی حکمران شرکت کرتے ہیں۔ پہلی اسلامی سربراہی کانفرنس یا سمٹ 1969ء میں مراکش کے دارالحکومت رباط میں منعقد ہوئی تھی۔

1974ء کو لاہور میں ہونے والی چوٹی کانفرنس بہت اہمیت کی حامل تھی اس موقع پر دنیا کے تقریباً سبھی اسلامی ملکوں کے سربراہوں نے اجلاس میں شرکت کی تھی۔ ان میں شاہ فیصل، معمر قذافی، یاسر عرفات، عیدی امین اور دیگر حکمران شامل تھے۔

لاہور میں یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے سب سے بڑی اور اہم کانفرنس تھی اس کا انعقاد پنجاب اسمبلی میں ہوا تھا اس کی تیاری میں کئی ماہ صرف ہوئے اور پورے لاہور میں ایک جشن کا سا سماں تھا۔ اس کانفرنس کے انعقاد کے بعد پاکستان کی شناخت اور اہمیت اسلامی دنیا پر مزید بڑھ گئی تھی لوگ پاکستان کے وجود سے پہلی مرتبہ بڑے پیانے پر واقف ہوئے تھے۔

دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس کی یاد کے طور پر اسمبلی ہال کے سامنے واقع پارک میں ایک مینار تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس مقصد کے لیے اس وقت کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے ماہرین تعمیرات سے گفتگو بھی کی۔

میناروں کے ڈیزائن کے مقابلے میں ترکی کے ماہر تعمیرات ویدات الود کے بنائے ہوئے ڈیزائن کو سراہا گیا۔ یاد رہے کہ شاہ فیصل مسجد، اسلام آباد کا نقشہ بھی ویدات الود نے ہی تیار کیا۔ دونوں عمارات میں ترک طرز تعمیر کا رنگ جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اسلامک سمٹ مینار کے نقشے کے متعلق ویدات کا کہنا ہے کہ انہوں نے اس مینار کے ڈیزائن کو تیار کرتے ہوئے اس جذبے کو پیش نظر رکھا کہ یہ پاکستانی ثقافت وتہذیب کا آئینہ دار ہی نہ ہو بلکہ لاہور میں ہونے والی بین الاقوامی

کانفرنس میں شریک اسلامی ممالک کی تہذیب وثقافت کو بھی اس تعمیر میں سمو دیا جائے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ سمٹ مینار کی تعمیر میں مغلیہ، ترکی، عربی، افریقی اور یورپی فن تعمیر کو شامل کیا گیا ہے مینار کو اسلامی طرز دینے کی بھر کوشش کی گئی ہے تا کہ اسلامی کانفرنس کی حقیقی یادگار معلوم ہو۔

اسلامی سمٹ مینار کا سنگ بنیاد کانفرنس کی پہلی سالگرہ کے موقع پر 22 فروری 1975ء کو رکھا گیا اس سلسلے میں ایک پروقار تقریب منعقد کی گئی جس میں شمولیت کے لیے اس وقت کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو، لاڑکانہ سے خصوصی طور پر لاہور پہنچے تھے۔

سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب میں 29 ممالک کے سفیروں نے شرکت کی اس موقع پر حکومت پاکستان نے خصوصی سکے بھی جاری کئے تھے ایک روپے کا یادگاری سکہ تانبے اور نکل کا تھا۔ اس کا وزن 7.5 گرام تھا اور اس کے ایک جانب مینار کی شبیہ اور کانفرنس کا طغرا بنا ہوا تھا۔ یہ طغرا کانفرنس کے دوران سرکاری طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ جو بالترتیب سونے اور چاندی کے نکل شدہ تھے سونے چاندی کے سکے سٹیٹ بنک اور تانبے کے نکل شدہ سکے نیشنل بنک آف پاکستان نے جاری کیے تھے۔

افتتاحی تقریب کا آنکھوں دیکھا حال ریڈیو پاکستان نے براہ راست نشر کیا اس موقع پر اس وقت کے وفاقی وزیر برائے خوراک وزراعت شیخ رشید نے مینار کا مختصر تعارف پیش کیا۔

تعمیر کے کام کا سلسلہ جولائی 1975ء میں شروع ہوا۔ یہ پراجیکٹ نیشنل کنسٹرکشن کمپنی کو سپرد کیا گیا اس پر ترک اور پاکستانی انجینئروں کے علاوہ ملک بھر سے 200 سنگ تراشوں اور 500 کارکنوں نے شب و روز محنت کی۔ سید امجد حسین جعفری نے پراجیکٹ مینجر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔

مینار کی تعمیر کے لیے ترکی سے مخصوص ٹائلیں اور وادی سون سے 1000 ٹن سرخ پتھر منگوایا گیا۔ عمارت کا رقبہ تقریباً ڈھائی ہزار مربع میٹر ہے باقی رقبے پر گھاس کے قطعات ہیں مینار کا حجم 5 مربع فٹ ہے اس کی تعمیر میں کنکریٹ اور لوہے کا استعمال کیا گیا ہے اور باہر سنگ مرمر لگا ہوا ہے جس پر 20 فٹ اونچا لفظ "اللہ اکبر" کندہ ہے مینار کی اونچائی فٹ ہے۔

محرابی کمروں کے دروازے نہیں ہیں بقول چیف آرکیٹکٹ "ہال کمروں کو اس لیے بے در رکھا گیا کہ اسلام کے دروازے ہر فرد و بشر پر کھلے ہیں اور تا قیامت کھلے رہیں گے مینار کے ہالوں

میں آنے کے لیے ایک سیڑھی رکھی گئی ہے جو اسلام کے یکساں راستے کی علامت ہے۔ مینار کے ساتھ مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کی ہدایت کے مطابق ایک عجائب گھر بھی بنایا گیا یہ ساری عمارت اس لیے زیر زمین رکھی گئی ہے کہ آس پاس کی عمارتوں کا حسن متاثر نہ ہو۔

زمین سے اُٹھنے والے بڑی مخروطی پتھر سے مینار اوپر کو اٹھتا ہے اس میں تالاب بنایا گیا ہے یہ مخروطی پتھر اور تالاب ایک چوکور راستے کی مانند کھڑے ہیں جس پر مخروطی چھت ہے مینار کی تعمیر کے سلسلے میں آفات سماوی آنے والے طوفانوں اور آندھی کی تباہ کاریوں کو بطور خاص مدنظر رکھا گیا ہے مینار بنانے والوں کا دعوی ہے کہ اگر زلزلہ اور طوفان ایک ہی سمت سے آئیں اور طوفان کی رفتار 200 میل فی گھنٹہ ہو اور زلزلے کے جھٹکے (خدانخواستہ) مکانات تو زمین بوس کردیں تو بھی یہ مینار نقصان سے بچا رہے گا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ مینار کی تعمیر کے سلسلے میں مغل عہد کی کاریگری کے طریقے پہلی بار دوبارہ آزمائے گئے یوں ڈیڑھ کروڑ روپے کی لاگت سے مینار کی تعمیر کا کام بیس ماہ میں مکمل ہو گیا اور یہ عالم اسلام کے اتحاد کی علامت بن کر اُبھرا۔

مینار کے تہہ خانے میں چار کمرے ہیں جنہیں اسلامی ممالک کے میوزیم کی شکل دی گئی ہے اس میں اسلامی ملکوں سے متعلق اشیاء شیشے کے شوکیسوں میں رکھی گئی ہیں یہیں چاروں کونوں میں انتظامیہ کے دفاتر ہیں دو ہالوں میں لیکچر دینے کے لیے نشستوں اور اوورڈائس کا انتظام بھی ہے۔

شیشے کے شوکیسوں میں جو اشیا، سجائی گئی ہیں ان کی تفصیل کچھ یوں ہے مصر کی مورتیاں، ملائشیا، موریطانیہ، فلسطین کی اشیاء بیت المقدس کا پتھر سے بنا ماڈل، پی ایل او کے مجاہدوں کے ملبوسات کے نمونے، فلسطین کا دھاتی نقشہ، ایران کی مورتیاں اور شاہی طغرا، قطر عدن اور عرب ممالک کے بھاری بھرکم چاندی کے زیورات، انڈونیشیا کی مورتیاں، ناخن نگاری کے پاکستانی نمونے، ترکی کے ٹیکسٹائل اور ٹائلوں کے ڈیزائن، اومان کی کشتی کا ماڈل، چادریں اور گھوڑے کی زین، صومالیہ کی ٹوپیاں، لبنان کے ظروف اور چاقو، اومان کی روایتی زیورات اور ظروف موریطانیہ کا قالین، سعودی عرب کی تنکوں کی چٹائی، افغانستان کی پینٹنگز، ملائیشیا کا تاریخی پتھر جس پر قدیم زبان کندہ ہے ترکی و عراق کے قالین، افغانی قالین، تغلق، سوری اکبر اور شاہجہان کے دور کے سکے، مثنوی مولانا روم کا نسخہ ابن سینا کی کتاب ''القانون'' کا نسخہ، خطاط محمد نعیم لاہور کا خط نسخ میں لکھا ۱۸۰۱ھ کا طلائی قرآنی نسخہ اور خانہ کعبہ کے غلاف کا ٹکڑا شامل ہے یہاں مینار کا ماڈل بھی

دیکھا جا سکتا ہے۔

مینار سے متصل پارک میں انگریز دور کی یادگار ایک برجی یا کسنیو پی ہے کبھی اس میں ملکہ وکٹوریہ کا بت رکھا ہوتا تھا قیام پاکستان کے بعد ملکہ کے بت کو یہاں سے ہٹا کر لاہور عجائب گھر میں منتقل کر دیا گیا۔ اسکے بعد عرصہ تک برجی خالی رہی۔

سمٹ مینار تعمیر ہوا تو اس کی مناسبت سے ایک مخیر خاتون عائشہ بیگم خالد مرزا نے 27 رمضان المبارک 1401ھ 1980ء میں قرآن پاک کا لکڑی کا ایک ماڈل لگوایا جس پر طلائی الفاظ ابھرے ہوئے ہیں۔

بعد ازاں 1981ء میں اس ماڈل کو گرد و غبار سے محفوظ رکھنے کے لیے بیگم ثریا شاہ محمد چوہدری نے اس پر شیشے کا بکس لگوایا۔

اس مینار کا ایک حصہ تالاب کی شکل میں سڑک کے پار تیار کیا گیا ہے نیلے رنگ کی ٹائلوں سے بنا ہوا یہ تالاب گول شکل کا ہے اس میں چھوٹے چھوٹے فوارے نصب ہیں سنگ مرمر کی ان سلوں پر ذوالفقار علی بھٹو کی تقریر جو انہوں نے 22 فروری 1974ء کو کانفرنس کے موقع پر کی تھی عربی فارسی اردو اور انگریزی میں درج ہے۔

کتبوں کا سنگ مرمر اٹلی سے منگوایا تھا اور ایل ڈی اے نے اس کی تیاری پر تقریباً ساڑھے تین لاکھ روپے صرف کیئے۔ تالاب کی تیاری ڈیڑھ ماہ میں عمل میں آئی اس پر یہ عبارت کندہ ہے۔

"صدیوں سے ہم بھی تقدیر بدلنے کی آس لگائے بیٹھے تھے اب وہ منزل آ پہنچی ہے ایک نئی صبح کی آمد اور اب کوئی موہوم امید نہیں ہے اب یہ ضروری نہیں کہ غربت و ناداری ہمارا مقسوم ٹھہرے یا ذلت و خواری کو ہم اپنا ورثہ سمجھیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ دنیا میں ہم محض جہالت اور ناسوادگی کی وجہ سے پہچانے جائیں۔"

ہفت روزہ "فیملی میگزین" لاہور۔ تحریر: محمد نعیم مرتضیٰ

○

چلڈرن کمپلیکس، لاہور

لاہور کی معروف شاہراہ ریس کورس پر واقع ''چلڈرن کمپلیکس'' بچوں کی دلچسپی کا ایک بہت بڑا مرکز جہاں دن بھر بچوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہتا ہے یہاں بچے اپنی اپنی من پسند دلچسپیوں سے دل بہلاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

چلڈرن کمپلیکس 75 کنال کے وسیع رقبے پر پھیلا ہوا ہے اس کی تعمیر کا باقاعدہ آغاز 21 اکتوبر 1987ء کو ہوا اور اس کی تکمیل 10 نومبر 1988ء کو ہوئی۔ تعمیر پر دو کروڑ روپے کی خطیر رقم خرچ ہوئی جس کا مقصد بچوں کے لیے صحت مند تفریحات کی فراہمی تھا اس کا افتتاح 16 نومبر 1988ء کو اس وقت کے وزیر اعلیٰ پنجاب میاں محمد نواز شریف نے کیا۔ اس موقع پر انہوں نے اس امر کا اظہار کیا کہ کمپلیکس کی تعمیر سے بچوں کو صحت مند تفریحات میسر آئیں گی کیونکہ بچے بلاشبہ ہمارے معاشرے کی بنیاد ہیں۔ جدید سہولتوں سے آراستہ اس کمپلیکس میں بچوں کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی طرف خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔

کبھی آپ کا دل چاہے کہ آپ بھی اپنے بچوں کو لے کر اس کمپلیکس میں جائیں تو اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے آپ بچوں کو کمپلیکس کا ممبر بنائیں جس کی فیس بہت معمولی سی ہے یعنی صرف 100 روپے سالانہ اس کے علاوہ صرف 100 روپے سیکورٹی فیس ہے جو کہ قابل واپسی ہے بھلا آپ ہی بتائیں کہ اتنے کم پیسوں میں بچوں کو اتنی سہولتیں کہیں اور مل سکتی ہیں۔ چلڈرن کمپلیکس کے مین گیٹ سے اندر داخل ہوں تو عمارت کے شروع ہونے سے پہلے گھاس کے وسیع قطعے میں جہاں بچوں کی دلچسپی کے لیے بہت سے جھولے وغیرہ لگے ہوئے ہیں شاید ہی کوئی وقت ایسا ہو جب یہاں آپ کو بچے کھیلتے ہوئے نہ دکھائی دیں۔ گھاس کے ان قطعات میں خوبصورت روشیں بنی ہوئی ہیں جن سے گذر کر عمارت تک پہنچا جا سکتا ہے عمارت کے بڑے دروازے سے اندر داخل ہوں تو کسی حد تک مغلیہ طرز تعمیر سے ملتی جلتی اس خوبصورت عمارت کا اندرونی منظر

سامنے دکھائی دیتا ہے یہیں بہت سے حنوط شدہ جانور رکھے گئے ہیں جو اپنی جانب متوجہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جتنے بھی بچے یہاں آتے ہیں وہ ان حنوط شدہ جانوروں اور پرندوں کے بارے میں ضرور دریافت کرتے ہیں جن سے ان پرندوں کے بارے میں ان کی معلومات میں بہت اضافہ ہوتا ہے اس کے بالکل ساتھ ہی سمعی و بصری معاونت کا شعبہ قائم ہے۔ جس میں مختلف موضوعات پر تقریباً ایک ہزار ویڈیو کیسٹیں موجود ہیں۔ بہت سی آڈیو کیسٹیں بھی اس شعبے کی زینت ہیں اس شعبے میں بچوں کی دلچسپی دیدنی ہوتی ہے۔ کیونکہ یہاں آ کر ان کے پاس مختلف موضوعات پر فلمیں دیکھنے کے مواقع ہوتے ہیں یہاں ہر وقت بہت سے بچے مختلف دلچسپیوں میں مصروف نظر آتے ہیں۔

اس شعبے سے باہر نکلیں تو اس کے بالکل سامنے کمپیوٹر سیکشن ہے۔ اس شعبے کے وسیع عریض کمرے میں کمپیوٹرز کا ایک جال بچھا ہوا ہے یہاں بچے بڑے انہاک سے کمپیوٹرز پر مختلف گیمز کھیلنے میں مصروف رہتے ہیں۔ سیڑھیوں کے ذریعے اوپر کی منزل پر جائیں تو یہاں ایک لابی سی بنی ہوئی ہے جہاں مختلف کلاس روم بنے ہوئے ہیں یہاں بچوں کو مجسمہ سازی اور پینٹنگز وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔

اس شعبہ کے بالکل ساتھ کمپلیکس کی لائبریری واقع ہے۔ جس میں مختلف موضوعات پر تقریباً بارہ ہزار کتابیں موجود ہیں بچے جس موضوع پر کتاب پڑھنا چاہتے ہیں انہیں وہ کتاب میسر کر دی جاتی ہے اوپر والے فلور پر واقع شعبے دیکھنے کے بعد نیچے کا رخ کریں تو دائیں طرف کمپلیکس کا آڈیٹوریم واقع ہے اس آڈیٹوریم میں اکثر و بیشتر تقریبات منعقد ہوتی رہتی ہیں اس آڈیٹوریم میں ہر اتوار کو فلم شو بھی منعقد کیا جاتا ہے۔ جس میں بچوں کو مختلف موضوعات پر مزے مزے کی فلمیں دکھائی جاتی ہیں اس شو میں شریک ہونے کے لیے بچوں کو بہت معمولی سی رقم دینی پڑتی ہے یہ آڈیٹوریم کثیر المقاصد ہے۔

کمپلیکس میں ایک جدید ترین جمنازیم بھی تعمیر کیا گیا ہے کمپلیکس کا یہ حصہ خاصا جدید ہے یہاں بچوں کی جسمانی تعلیم و تربیت کے لیے مختلف کھیلوں کا اہتمام کیا گیا ہے ٹیبل ٹینس اور لان ٹینس بھی یہاں کھیلی جا سکتی ہیں اس کے علاوہ فزیکل فٹنس برقرار رکھنے کے لیے بھی یہاں جدید آلات موجود ہیں یہاں پر بلیئرڈ اور بچوں کی دلچسپی کے دوسرے لوازمات بھی موجود ہیں جن میں بچوں کی دلچسپی دیدنی ہوتی ہے اس موقع پر بہت چھوٹی عمر کے بچوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا جن

کے لیے ہلکے پھلکے کھیلوں کا شعبہ قائم کیا گیا ہے اس شعبہ میں بلاکس، مونٹیسری وغیرہ رکھی گئی ہیں۔ مائیں بچوں کو لے کر یہاں آتی ہیں بڑے بچے اپنی اپنی دلچسپی کے شعبوں کا رخ کرتے ہیں اور چھوٹے بچے ہلکے پھلکے کھیلوں کے شعبے کی طرف چلے جاتے ہیں خواتین یہاں پر سلائی، کڑھائی، ڈریس ڈیزائنگ، مجسمہ سازی، کیلی گرافی اور دوسرے بہت سے ہنر سیکھ سکتی ہے۔

خواتین فی کورس 8 سو روپے دے کر ان کلاسز میں داخلہ لے سکتی ہیں یہاں جاری کورسز میں قرات، نعت، کہانی نویسی، فن موسیقی، اور دوسرے کورسز بھی کرائے جاتے ہیں۔ کورس کا دورانیہ تین ماہ ہوتا ہے جس کے اختتام پر بچوں میں سرٹیفکیٹس تقسیم کیے جاتے ہیں کمپلیکس کے بیشتر حصے ائیر کنڈیشنز ہیں اور عنقریب ہالی سیکشن اور ٹوائے سیکشن کی ائیر کنڈیشنگ کے بعد کمپلیکس مکمل طور پر ائیر کنڈیشنڈ ہو جائے گا۔ چلڈرن کمپلیکس میں بچوں کو لانے اور لے جانے کے لیے کمپلیکس کی فری بس سروس بھی ہے اگر کسی سکول کی انتظامیہ خواہش مند ہو کہ وہ اپنے سکول کے بچوں کو کمپلیکس لے کے جائے تو اس سلسلے میں کمپلیکس کی بس سروس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

ابھی ہمارے پاس بہت سی جگہ میسر ہے جہاں کئی اور دلچسپیوں کا اہتمام کیا جا سکتا ہے آپ یوں سمجھیئے ہمارے پاس اس وقت جتنی جگہ ہے اس کا ہم صرف 40 فی استعمال کر رہے ہیں اور 60 فیصد کی استعمال کی گنجائش موجود ہے ویسے ہم سب سے پہلے یہاں سوئمنگ پول تعمیر کرنا چاہتے ہیں اس کے لیے منصوبہ بندی ہو رہی ہے جیسے ہی ممکن ہوا اس کی تعمیر شروع کر دی جائے گی ہم چاہتے ہیں کہ اس کمپلیکس میں بچوں کی ضرورت کی ہر چیز موجود ہو۔ یعنی یہ کمپلیکس ہر لحاظ سے بچوں کی تمام ضروریات پوری کرے۔ اس کے علاوہ یہاں سپیشل بچوں کے لیے سہولیات کی فراہمی کا بھی منصوبہ ہے بنیادی طور پر یہ پنجاب کے سابق گورنر جنرل غلام جیلانی خان کا آئیڈیا تھا اور وہ اس کے بارے میں بہت پر جوش تھے بعد ازاں آنے والی حکومتوں نے بھی اس منصوبے کو آگے بڑھایا۔ میں والدین سے کہوں گا کہ وہ اپنے بچوں کو یہاں لے کر ضرور آئیں کہ یہ ان کے لیے بہت خوبصورت جگہ ہے۔

چلڈرن کمپلیکس لاہور میں واحد ایسی جگہ ہے جہاں بچوں کو پر سکون اور پر اعتماد ماحول مہیا کیا جاتا ہے اس حوالے سے عبداللہ محمود صاحب نے ذکر کرتے ہوئے کہا یہاں بچوں کی حفاظت و نگہداشت کا بھی مکمل طور پر خیال رکھا جاتا ہے اس لیے والدین کو قطعاً گھبرانا نہیں چاہیے۔

الغرض یہ پاکستان کا واحد ادارہ ہے جو بہترین سائنسی بنیادوں پر استوار کیا گیا ہے۔ خصوصاً

بچوں کے ساتھ ساتھ ان کے والدین کے لیے تعلیمی مواقع مہیا کرنا بہت خوش آئند بات ہے این جی او، ڈونرا یجنسیز اور خصوصاً حکومت کو چاہیے کہ وہ بڑے شہروں کے ساتھ ساتھ ڈویژن اور ضلعی سطح پر چلڈرن کمپلیکس جیسے ادارے وجود میں لائے جہاں بچوں کو جدید سائنسی اصولوں کے ساتھ بہترین کھیلوں و دیگر مشاغل کے زیادہ سے زیادہ مواقع میسر آ سکیں۔

حکومت نے اس پروجیکٹ کی کامیابی کے بعد پنجاب کے 7 بڑے اضلاع میں چلڈرن کمپلیکس بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ سرگودھا میں چلڈرن کمپلیکس 3 ماہ میں شروع ہو جائے گا۔ اس کے بعد راولپنڈی، ملتان، بہاولپور، رحیم یار خان، فیصل آباد، میں بھی چلڈرن کمپلیکس تعمیر ہوں گے۔

سہیل قیصر

ہفت روزہ ''فیملی میگزین'' لاہور

31 جنوری تا 6 فروری 1999ء

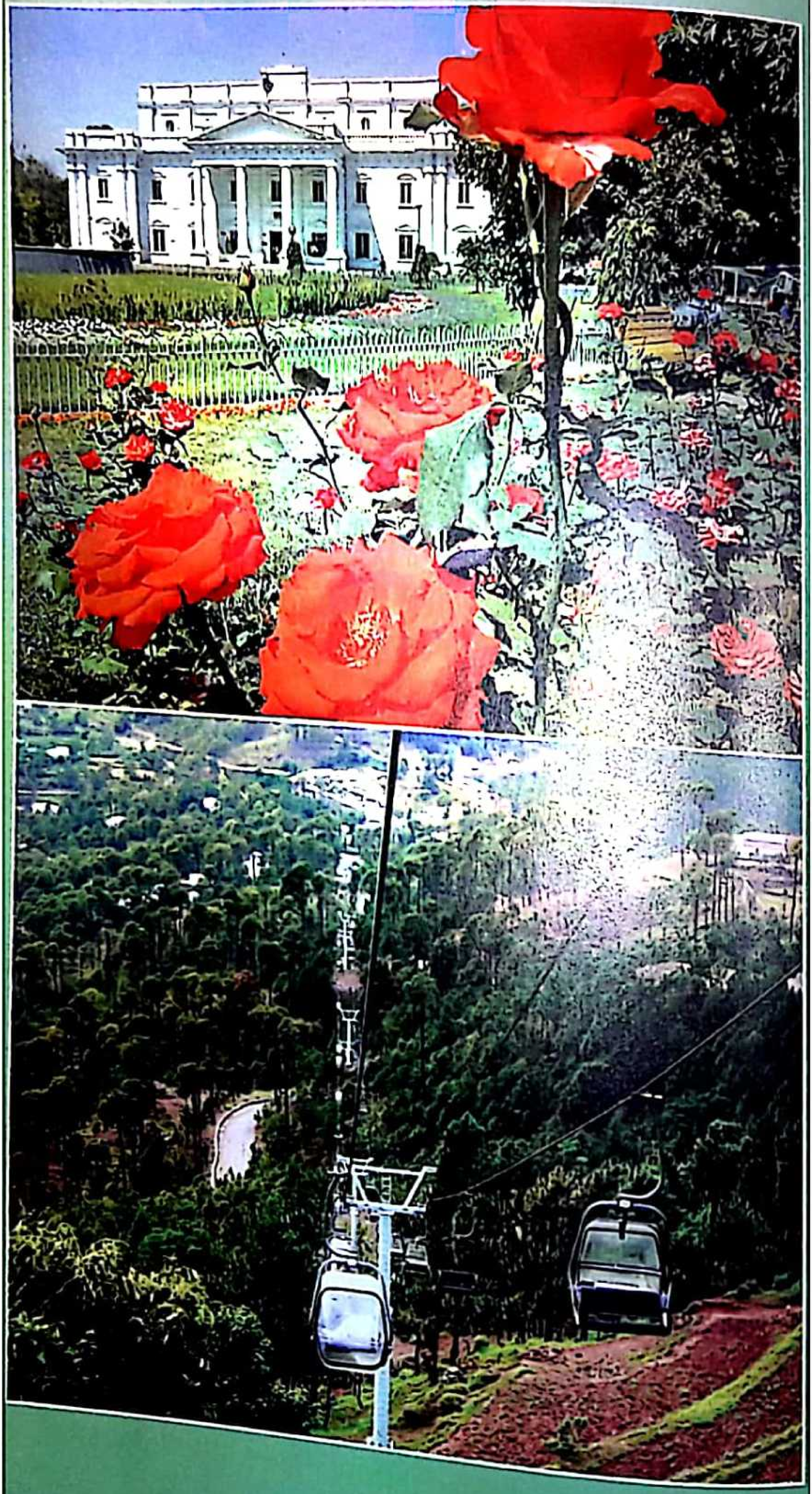

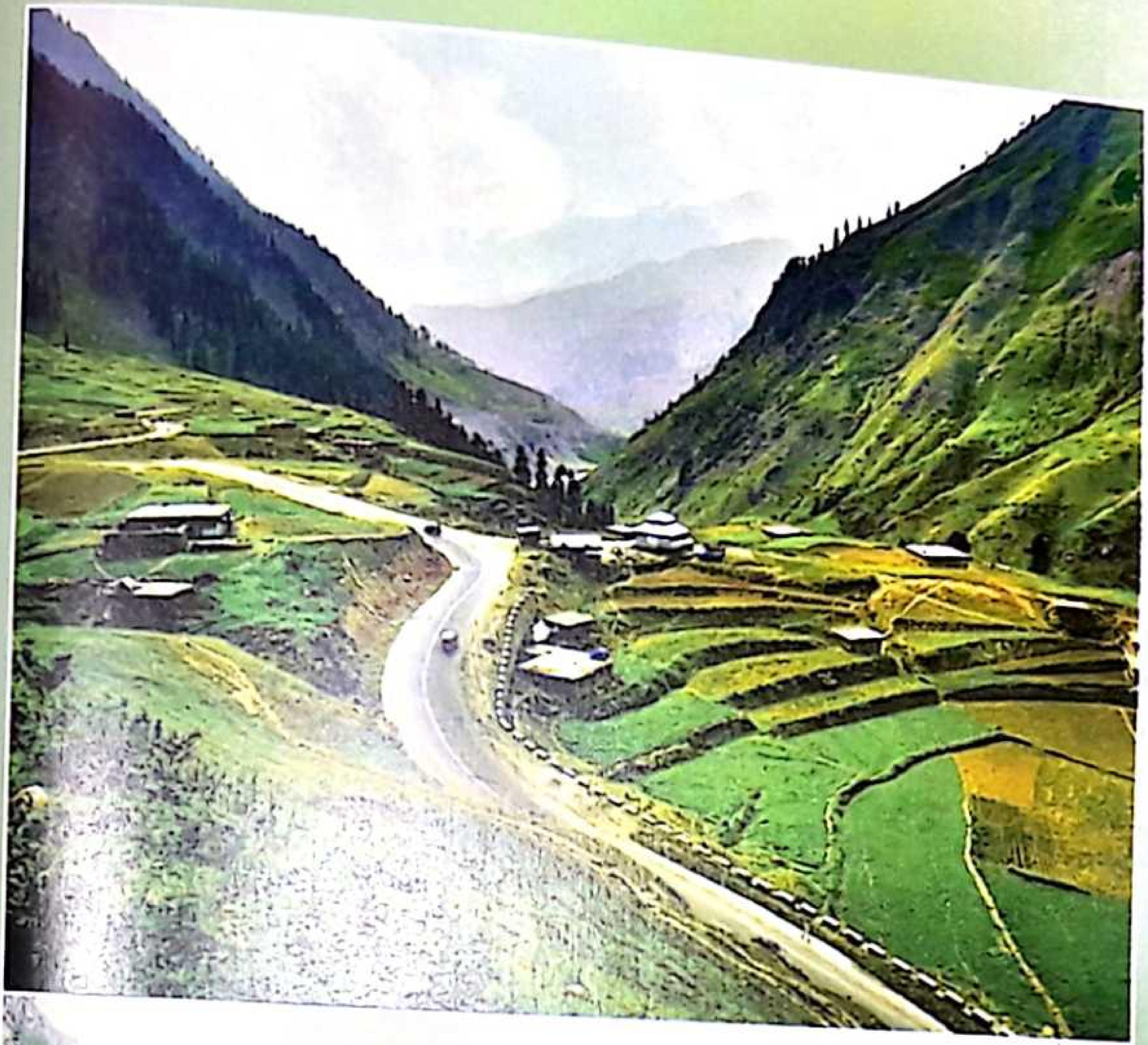

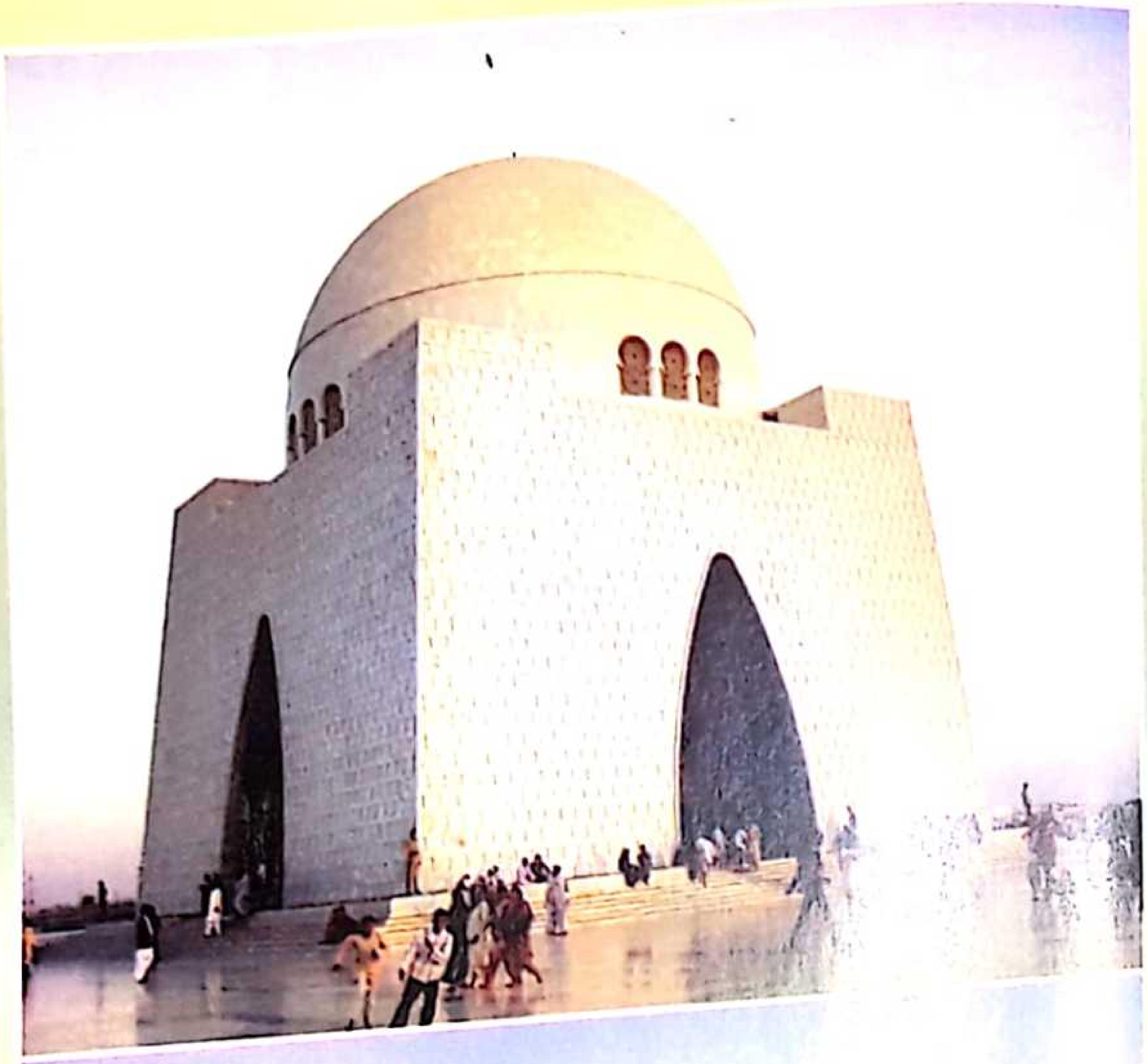

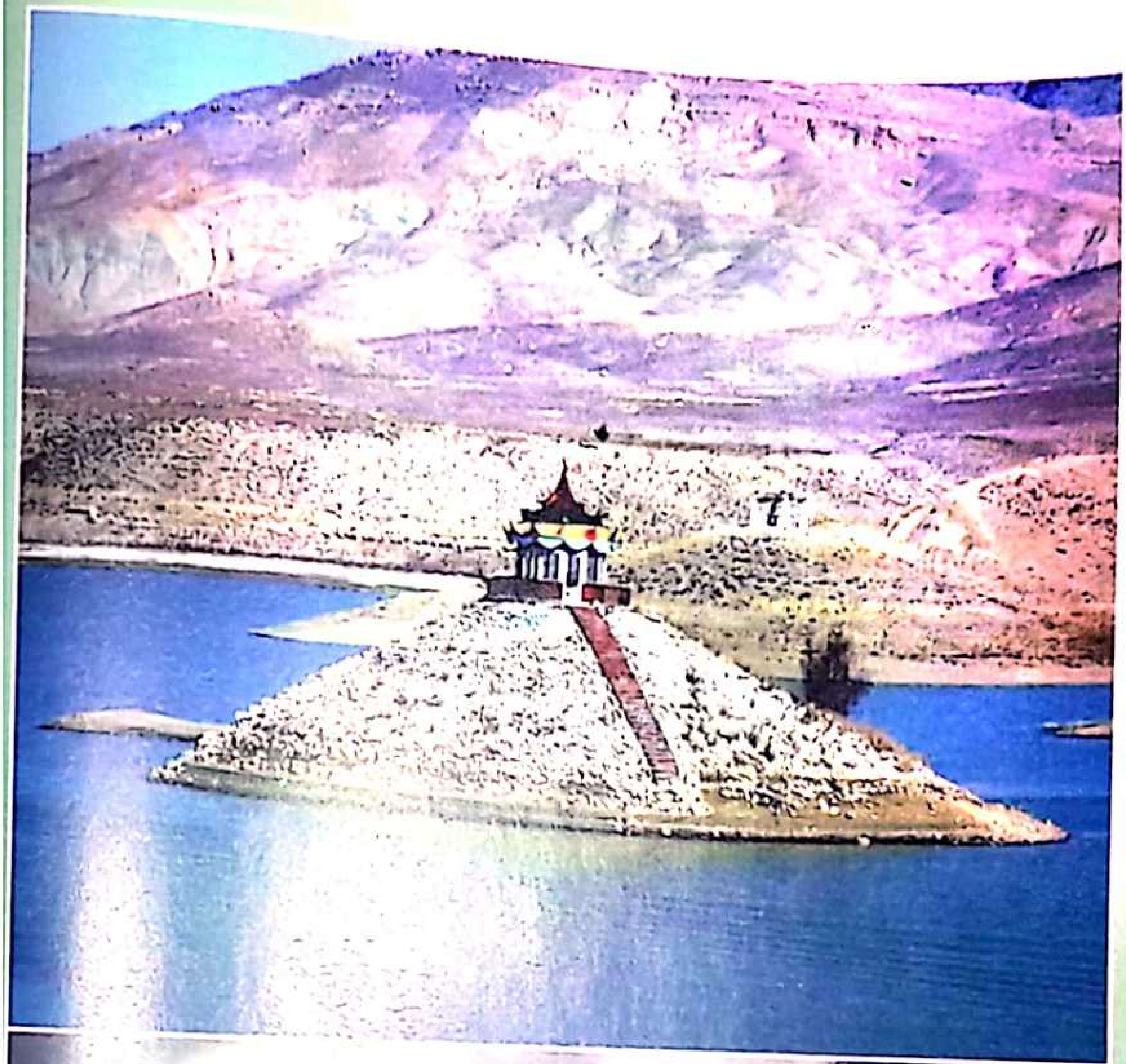

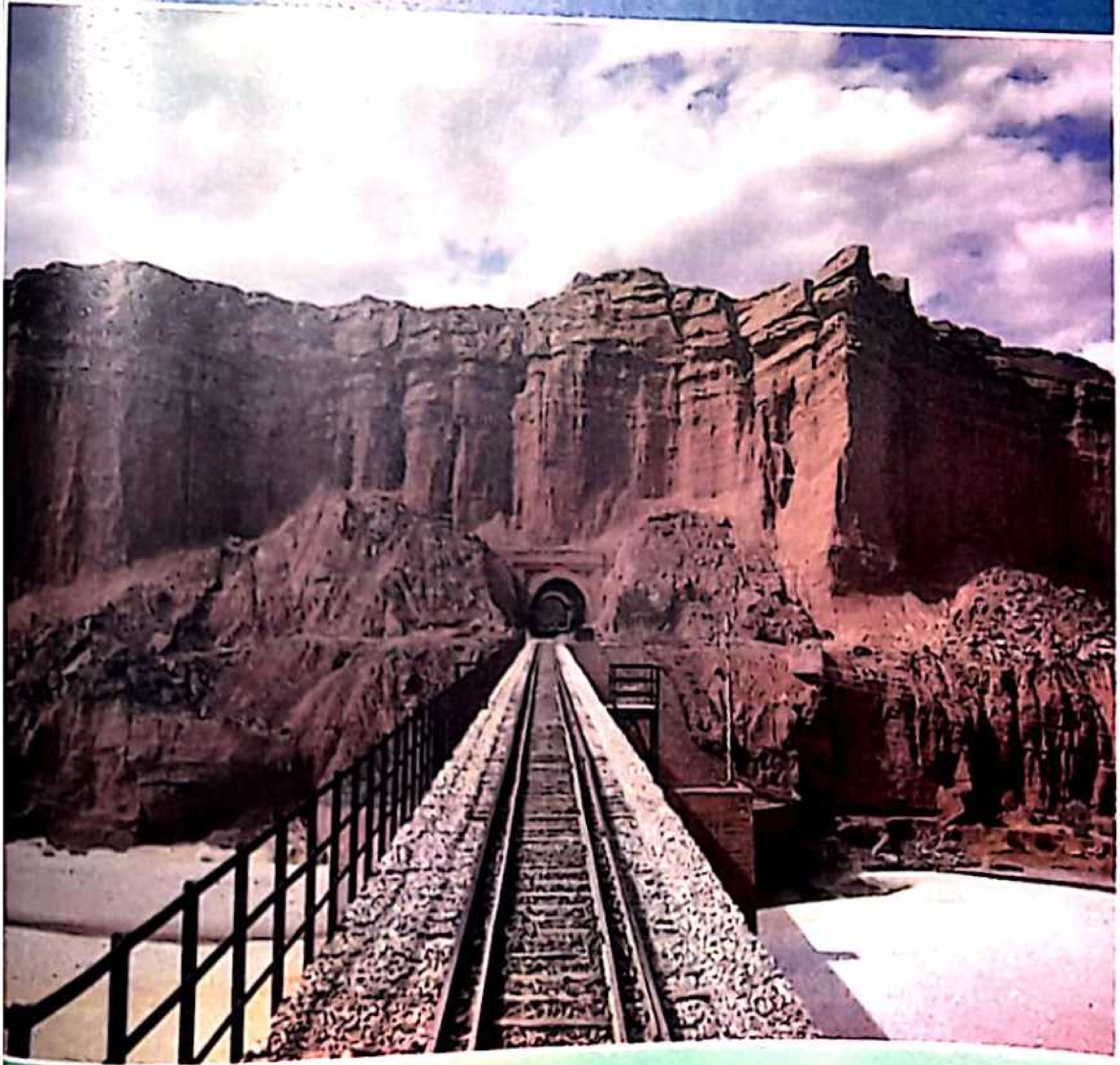

ایوانِ اقبال، لاہور

لاہور میں شملہ پہاڑی سے اسمبلی ہال کی طرف جانے والی دو رویہ وسیع سڑک پر چلئے جائیں تو دائیں جانب ایک بلند و بالا عمارت سب سے منفرد نظر آتی ہے اس کا نام ایوان اقبال ہے سفید رنگ کی تین عدد سات منزلہ بلڈنگ تین بلاکوں پر مشتمل ہے جن میں ایڈمنسٹریٹو بلاک، لائبریری بلاک اور رینٹ ایبل بلاک شامل ہیں۔

ایوان اقبال میں سب سے اعلیٰ اور پر شکوہ حصہ کانفرنس ہال کا ہے جس کی تعمیر پر کروڑوں روپے خرچ ہوئے۔ کانفرنس ہال میں 720 افراد کے بیٹھنے کی گنجائش جبکہ گیلری میں 320 افراد مزید بیٹھ سکتے ہیں اس ہال میں ایسا نظام نصب ہے جو پانچ زبانوں میں تقریب کی تقاریر کا ترجمہ بیک وقت کر سکتا ہے ہال کی چھت گول ہے اور اس کو سہارا دینے کے لیے کوئی ستون نہیں۔ چھت پر روشنی کے لیے خوبصورتی سے 700 کے قریب لائٹیں لگائی گئی ہیں۔ خیابان اقبال سے عمارت میں داخل ہوں تو سامنے صدر دروازہ نظر آتا ہے جو اپنی ساخت کے اعتبار سے جدید اور قدیم طرز تعمیر کا امتزاج ہے بلند دروازے سے اندر آئیں تو اس حصے کو لابی کہا جاتا ہے اس کا چکنا اور شفاف فرش دیکھ کر سیاح حیران رہ جاتے ہیں یہیں سے ایک دروازہ کانفرنس روم کے اندر کھلتا ہے کانفرنس ہال کی چھت کے قریب علامہ اقبال کے کلام سے منتخب اشعار لکھے گئے ہیں جو نیچے بیٹھے ہوئے افراد آسانی سے پڑھ سکتے ہیں کانفرنس ہال میں ملکی اور عالمی سطح کی کانفرنس اور اجلاس ہوتے ہیں یہ ہال مکمل طور پر ائیر کنڈیشنڈ ہے اور اس میں داخل ہونے والے کو احساس ہوتا ہے کہ یہ عمارت واقعی شاعر مشرق کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے بنائی گئی ہے سٹیج کے پیچھے وی آئی پی دروازہ ہے جو کشمیر لنک روڈ پر کھلتا ہے۔

کانفرنس ہال کے اردگرد تین منزلہ اقبالیات کے ماہرین گیلری ہے جہاں بچوں کی دلچسپی کے لیے کلام اقبال کو تصویری شکل میں سجایا گیا ہے ملک کے نامور کارٹونسٹ نے بڑی مہارت اور

کمال کے ساتھ اقبال کے شعروں کو تصویری شکل دی ہے اس سے ذرا آگے جائیں تو لابی کی نچلی منزل میں کمیٹی رومز بنے ہوئے ہیں ان کی تعمیر بھی عالمی معیار کے عین مطابق کی گئی ہے اس لابی میں آگے چل کر بائیں جانب تو وسیع بینکویٹ ہال کا دروازہ کھلتا ہے۔

اس میں عام طور پر اجلاس ہوتے ہیں اور اگر کھانے کا وقت ہو جائے تو یہاں سے کھانے کا بھی بندوبست کیا جاتا ہے مگر ساتھ بنے ہوئے کچن میں کھانا تیار کرنے کی اجازت نہیں باہر سے لایا ہوا کھانا گرم کرنے کا اہتمام ضرور کیا جاتا ہے۔

ایوان اقبال کی تعمیر میں اس بات کو خاص طور پر مدنظر رکھا گیا ہے کہ عمارت دیکھنے میں کمرشل نہ لگے چنانچہ اس کے آگے اور پیچھے وسیع قطعہ زمین پر خوبصورت فوارے اور باغیچے بنائے گئے ہیں جنہیں سنکن گارڈن کہا جاتا ہے اقبال کے کلام میں آبشاروں، چشموں اور خوبصورت وادیوں کا خصوصی ذکر ملتا ہے ان کی عکاسی کے لیے یہ ہرے بھرے باغیچے بنائے گئے ہیں۔

ایجرٹن روڈ کی طرف کھلنے والا دروازہ اس بلاک کا ہے جو کرائے پر دیا جاتا ہے اس بلاک کو تعمیر کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ایوان اقبال فنڈز کے حصول میں خود کفیل ہو جائے یہاں پر مختلف کمپنیوں نے اپنے دفاتر قائم کر رکھے ہیں۔

ایوان اقبال کے پچھلی طرف انڈر گراؤنڈ دومنزلہ کار پارکنگ بنائی گئی ہے اس پارکنگ کی تعمیر اصل منصوبے کا حصہ نہیں تھی لیکن ایوان کے اردگرد ہریالی قائم رکھنے کے لیے اس کی اوپری سطح پر گھاس کے قطعات ہیں جو عمارت کی خوبصورتی کو دوبالا کرتے ہیں۔ضروری تھا کہ گاڑیوں کی پارکنگ کا انتظام کہیں اور کیا جائے اس پارکنگ میں 150 کاریں اور 250 موٹر سائیکلیں کھڑے کرنے کی گنجائش موجود ہے۔

لائبریری بلاک کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایسی شاندار لائبریری قائم کی گئی ہے جن میں اقبالیات کے بارے میں ڈیڑھ لاکھ سے زائد کتب موجود ہیں یہ لائبریری عوام کے لیے کھلتی ہے اور اس کی رکنیت کی کوئی فیس نہیں جو لوگ مطالعہ کے خواہش مند ہوں وہ یہاں آ کر اپنے ذوق کی تسکین کر سکتے ہیں یہاں سے کتابیں باہر لے جانے کی اجازت نہیں البتہ فوٹو کاپی اور آڈیو کیسٹ کی سہولت یہیں فراہم کی جاتی ہے۔1985ء میں حکومت پنجاب نے ایوان اقبال کی تعمیر کے لیے 42 کنال زمین وقف کی تھی ابتدا میں اس کی تعمیر پر لاگت کا اندازہ 37 کروڑ روپے لگایا گیا تھا اور حقیقت میں اتنے ہی پیسے خرچ بھی کیے گئے گذشتہ پندرہ سالوں میں قائم ہونے والی ہر حکومت

نے فنڈز کی فراہمی میں دیر نہیں کی تقریباً ساڑھے تین کروڑ روپیہ مخیّر حضرات نے فراہم کیا ہے ایوان اقبال کی دیکھ بھال کا ٹھیکہ نیسپاک کو دیا گیا ہے جو بجلی، مینٹیننس اور دیگر امور کا ذمہ دار ہے سکولوں اور کالجوں کے طلباء یہاں آئیں اور اپنے عظیم قومی شاعر کی یاد میں تعمیر ہونے والے اس ایوان کو دیکھیں۔

ایوان اقبال کی مجموعی دیکھ بھال کا ذمہ دار ایڈمنسٹریٹر ہے جس کے ماتحت ایوان اقبال اپنے فرائض کی جانب رواں دواں ہے۔ یہاں سیر کے لیے آنے والوں کی رہنمائی کے لیے ایک کتابچہ شائع کیا گیا ہے اس کے علاوہ ایک گائیڈ بھی یہاں تعینات ہے اقبال شناسی کے لیے فارسی کلاسوں کا باقاعدہ آغاز کیا جارہا ہے۔ یہاں پر بجلی کے دو طرح کے انتظامات ہیں نارمل انتظام واپڈا کی بجلی سے کیا جاتا ہے جبکہ ہنگامی طور پر بجلی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے پاور فل جنریٹر لگائے گئے ہیں ایوان میں نصب چار لفٹیں لگائی گئی ہے جو تینوں بلاکوں میں آنے جانے کے لیے سہولت مہیا کرتی ہیں۔

گراؤنڈ فلور پر ایک خوبصورت مسجد بنائی گئی ہے جس میں 300 افراد نماز ادا کر سکتے ہیں۔

ایوان کے لیے وقف 42 کنال زمین میں صرف ایک چوتھائی حصے پر ایوان کی عمارت تعمیر کی گئی ہے باقی زمین آرائش اور لینڈ سکیپ کے لیے استعمال کی گئی ہے۔ ایوان اقبال کی سیر کے خواہش مند لوگوں کو گروپ کی صورت میں یہاں آنا چاہیے اس بارے میں اپنے پروگرام سے ایک ہفتہ قبل ایوان اقبال سے رابطہ قائم کریں۔

ایوان صبح 8 بجے سے سہ پہر تین بجے تک کھلا رہتا ہے ایوان کے کانفرنس ہال میں موسیقی اور رقص و سرور کی محفلوں کے علاوہ ہر قسم کی تقریبات منعقد ہو سکتی ہے یہاں داخلے کا کوئی ٹکٹ نہیں۔

اکرام الحق وڑائچ

روزنامہ جنگ، لاہور

14 اپریل 1999ء

○

لاہور پلانٹریم

لاہور پلانٹریم کراچی کے بعد دوسری سیارہ گاہ ہے ان سیارہ گاہوں کی تعمیر کا بنیادی مقصد فلکیات کے علم کو سائنس کی آسان ترین اور عام فہم زبان میں لوگوں تک پہنچانا ہے۔ پلانٹریم، سائنس کے ان کمالات میں سے ہے جو فلکیات جیسے تکنیکی علم کو ایک گنبد نما عمارت میں بچے سے بوڑھے تک ہر ایک کے لیے اتنا آسان بنا دیتا ہے کہ آپ صدیوں کا سفر اور برسوں کا فاصلہ پل بھر میں طے کر لیتے ہیں۔ یہاں آپ نظام شمسی کی سیر بھی کر سکتے ہیں آسماں پر ہونے والی تبدیلیوں اور سرگرمیوں کا مشاہدہ کر سکتے ہیں اور یوں آپ معلومات کا وہ ذخیرہ حاصل کر لیتے ہیں جس کا حصول عام حالات میں آپ کے لیے شاید ممکن نہ ہو۔

سیارہ گاہ کے اندر ایک سپیس ماسٹر نصب ہے ایک کروڑ روپے مالیت کے اس سپیس ماسٹر کے ساتھ دوسرے سمعی و بصری آلات بھی اپنے کرشمے دکھاتے ہیں۔ لیکن اصل کام سپیس ماسٹر ہی دکھاتا ہے اور مختلف برقیاتی طریقوں اور زاویوں سے رخ بدل کر گنبد کی اندرونی سطح پر چاند، ستاروں اور سورج کی گردش سے لے کر نظام شمسی کی باقی سرگرمیوں کو اس طرح تخلیق کرتا ہے کہ انسانی آنکھ کو یہ سب کچھ بہت قریب اور حقیقی معلوم ہوتا ہے۔

225 نشستوں کی گنجائش کے اس پلانٹریم میں داخلے کا ٹکٹ بڑوں کے لیے چالیس روپے اور بچوں کے لیے بیس روپے ہے۔ پلانٹریم میں ایک گھنٹے دورانیے پر مشتمل پروگرام دکھائے جاتے ہیں جس کے ساتھ انگریزی یا اردو کمنٹری بھی کی جاتی ہے جبکہ پہلے کی نسبت آج کل ان پروگراموں کو مزید نئی تبدیلیوں اور جدت کے ساتھ جدید اور بھرپور انداز میں پیش کیا جا رہا ہے۔

دو کروڑ روپے لاگت سے قائم ہونے والے اس منصوبے کے لیے مشینری، مشرقی جرمنی کی فرم ''کارل زائس'' نے فراہم کی جو دنیا بھر میں سیارہ گاہوں کی تعمیر کے لیے خصوصی مہارت رکھتی

ہے۔ سیارہ گاہ کے لیے روزانہ آٹھ ہزار واٹ بجلی درکار ہوتی ہے اس کے ساتھ ساتھ سپیس ماسٹر جیسی حساس اور نازک مشین کے لیے ائیر کنڈیشنگ کا خصوصی نظام بھی قائم کیا گیا ہے۔

پلانٹریم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں دکھائے جانے والے تمام پروگرام کمپیوٹر کنٹرول کرتا ہے اور اس کا سارا نظام خودکار ہے اس طرح کے تین پلانٹریم مستقبل قریب ہی اسلام آباد، پشاور، اور کوئٹہ میں بھی قائم کیے جائیں گے تاکہ طالب علم سے لے کر تمام آدمی تک ہر کوئی یہ جان سکے کہ ہماری کہکشاں اور نظام شمسی کی حقیقت اور خلاؤں کے راز کیا ہیں اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ سب کچھ اس طرح ہوگا جس طرح کائنات میں ہوتا ہے ہر تفصیل اتنی مکمل اور واضح صورت میں ہوگی کہ آپ کو نقل پر اصل کا گماں ہوگا۔

سائنس کی جدید ترین ایجاد نے جہاں علم کے نئے سفر کا آغاز کیا وہاں صحت مند تفریح کے لیے بھرپور مواقع بھی فراہم کیے اور لاہور کے شہریوں کے لیے پی آئی اے کا یہ تحفہ انہیں ساری زندگی ''پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز'' کی علم دوستی کی یاد دلاتا رہے گا پلانٹریم میں ایک جدید اور شاندار قسم کی لائبریری بھی قائم کی گئی ہے اس کے علاوہ سبزہ زار میں بوئنگ 720 طیارہ بھی رکھا گیا ہے یہ بوئنگ 720 پی آئی اے کے اس بیڑے کا حصہ ہے جس نے 1962ء میں کراچی سے لندن تک نان سٹاپ پروازیں کیں اور انہی جہازوں کو حاصل کرنے کے بعد پی آئی اے کو ایشیاء میں جیٹ اڑانے والی پہلی فضائی کمپنی کا اعزاز حاصل ہوا تھا اس جہاز میں بہت سے سربراہان مملکت بھی سفر کر چکے ہیں اور یہ مشرقی پاکستان، چین، یورپ اور امریکہ کے براہ راست سفر بھی کر چکا ہے لیکن پٹرول کے بڑھتے ہوئے خرچ اور زیادہ آواز کے باعث اب ایسے جہازوں کا استعمال ختم کر دیا گیا ہے اس جہاز نے کراچی سے لاہور تک اپنی آخری پرواز کی بعد میں لاہور ائیر پورٹ پر اس کے انجن علیحدہ کر کے نومبر 1986ء میں اسے سیارہ گاہ لایا گیا اور یہ سفر اس جہاز نے ایک رات شاہراہ قائداعظم پر تقریباً آٹھ گھنٹے کا سفر پیدل کیا۔ کراچی کی سیارہ گاہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ایک جہاز رکھا گیا ہے۔ اس جہاز میں بچوں کو تفریح معلوماتی اور سائنسی نوعیت کی فلمیں وغیرہ دکھائی جاتی ہیں یہ فلمیں پی آئی اے کا سمعی اور بصری شعبہ تیار کرتا ہے اس جہاز کی باقاعدہ پرواز، اڑان، ٹیک آف اور لینڈنگ کے تمام مراحل کے بارے میں اصل کی طرح اعلان کیا جاتا ہے جس کے ساتھ رنگین ٹیلی ویژن سیٹ پر بچوں کو معلوماتی فلمیں اور فضائی مناظر دکھائے جاتے ہیں۔

پاکستان کے سابق وزیراعظم جناب محمد خان جونیجو نے 30 جولائی 1987ء کو اس شاندار سیارہ گاہ کا افتتاح فرمایا۔ اپنے خطاب میں وزیراعظم نے لاہور میں سیارہ گاہ کے قائم کرنے پر پی آئی اے کی تعریف کی اور کہا کہ علوم جدیدہ کا آغاز قرون اولی کے مسلمان سائنس دانوں اور ماہرین ریاضی کا مرہون منت ہے یہ ہمارے اسلاف کی میراث ہے ہمیں پھر سے ہمت باندھ کر اس میدان میں آگے بڑھنے اور اس کھوئی ہوئی میراث کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اگر ہم اپنے تمام وسائل کو سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کے لیے وقف کر دیں تو ہم آج بھی اس میدان میں اپنی گذشتہ عظمت کو حاصل کر سکتے ہیں اور سیارہ گاہ اس سلسلے کی ایک بنیادی اور اہم کڑی بن سکتی ہے۔''

○

سائنس میوزیم، لاہور

یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کے ساتھ واقع سائنس میوزیم پاکستان میں اپنی نوعیت کا واحد ''سائنسی میوزیم'' ہے جس کا منصوبہ 1965 میں منظور ہوا تعمیر کا پہلا مرحلہ مکمل ہونے پر اسے 1976 میں عوام کے لیے کھول دیا گیا یہاں سکولوں اور کالجوں کے طالب علموں کا زیادہ رش رہتا ہے ایک اندازے کے مطابق ہر سال ایک لاکھ سے زائد لوگ اسے دیکھنے کے لیے یہاں آتے ہیں۔

سائنس میوزیم میں جو ماڈلز رکھے گئے ہیں ان میں کمپیوٹر، برقی موٹریں، جنریٹر متحرک انسانی دل، انسانی آنکھ اور کان، نظام شمسی، موٹر کار، میزائل خوردبین، دوربین، خلائی سیارہ اور دوسری بے شمار اشیاء شامل ہیں ان ماڈلز میں ایک ایسا کمپیوٹر بھی شامل ہے جو حسب ہدایت اردو میں بات کرتا ہے کمپیوٹر کے ذریعے سنائی دینے والی آواز، انسانی نہیں بلکہ میکانکی ہے۔ کمپیوٹر کی زبانی ادا ہونے والے الفاظ سکرین پر بھی نمودار ہوتے ہیں۔ صنعتی کیمسٹری ماڈل، متحرک تصویروں کے ذریعے واضح کیے گئے ہیں کچھ ماڈل ایسے کھیلوں پر مشتمل ہیں جس کے ذریعے بچوں کی ذہنی صلاحیتوں کا امتحان ہوتا ہے ایسے ماڈل خاص طور پر نسب کیے گئے ہیں جن سے برقی توانائی حاصل کی جاسکتی ہے پلاسٹک کے انسانی ڈھانچے کے ذریعے یہ بتایا گیا ہے کہ جسمانی اعضاء کیسے کام کرتے ہیں میوزیم میں کائنات کا ماڈل سب سے دلچسپ ہے جس میں نظام شمسی کو باقاعدہ گردش کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے ساتھ ہی چارٹ پر درج ہے کہ کائنات میں ایک ارب سے زیادہ کہکشائیں اور یہ سب باہمی کشش کی وجہ سے ایک گروپ کی صورت میں ایک دوسرے سے مربوط ہیں نیز یہ تمام کہکشائیں مسلسل ایک دوسرے سے دور ہو رہی ہیں یہاں پر آنے والا کوئی بھی شخص ماڈل کا ایک بٹن دبا کر یہ دیکھ سکتا ہے کہ نظام شمسی میں ان کی زمین کی پوزیشن کیا ہے ایک کمرے میں پاکستان میں سب سے پہلے انجینئرنگ یونیورسٹی میں آنے والے کمپیوٹر کا ماڈل رکھا گیا ہے

جس کے دس علیحدہ علیحدہ حصے ہیں یہ کمپیوٹر کمرے کی لمبائی سے بھی بڑا ہے اب اس کمپیوٹر کے تمام حصے ایک چھوٹی سی میز پر آ جاتے ہیں۔ ملک کے مایۂ ناز سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے بھی اے کیو خان ریسرچ لیبارٹری کی طرف سے چند ماڈل میوزیم کو تحفے میں دیئے ہیں یہاں کے ایک حصے میں غوری اور دوسرے میزائلوں کے ماڈل رکھے گئے ہیں۔ بچے شوق سے ان میزائیلوں کے ساتھ تصاویر بنواتے ہیں یہاں ایک اور دلچسپ ماڈل پلی سسٹم اور لیور شامل ہیں جنہیں حرکت میں لا کر اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ اگر کسی بھاری چیز کم طاقت لگا کر اوپر اٹھانا ہو تو ہمیں کیا کرنا چاہیے اس طرح مسئلہ فیثاغورث کو ثابت کرنے کے لیے کسی جیومیٹری یا حسابی فارمولے کو استعمال کرنے کی بجائے مائع استعمال کیا گیا ہے۔

لاہور کا یہ سائنس میوزیم پورے ملک میں اپنی نوعیت کا پہلا میوزیم ہے وزارت تعلیم، حکومت پاکستان کے زیر اہتمام قائم کردہ اس میوزیم کا بنیادی مقصد طلبہ و طالبات اور عام لوگوں میں سائنسی شعور بیدار کرنا ہے۔ 2001ء میں اسے قائم ہوئے 25 سال سے زائد عرصہ ہو چکا ہے یکم دسمبر 2000ء سے جنوری 2001ء کے دوران ایک لاکھ پندرہ ہزار طالب علموں نے میوزیم کو دیکھا میوزیم میں سالانہ سائنس میلے بھی منعقد کیے جاتے ہیں میوزیم کی دو گیلریوں میں 300 سے زائد ماڈلز رکھے گئے ہیں انہیں چھ سیکشنوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ گیلریوں میں رکھے ہوئے سائنسی ماڈلز میں گاہے بگاہے تبدیلیاں لائی جاتی ہیں تاکہ طالب علم انہیں اچھی طرح سمجھ سکیں۔ طلبہ کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے چلا کر ان ماڈلوں کی تفصیلات سے آگاہی حاصل کر سکیں۔

خصوصاً نوجوانوں میں سائنس سے دلچسپی پیدا کرنے کے لیے ایسے میوزیم دوسرے چھوٹے بڑے شہروں میں بھی قائم کیے جانے چاہئیں۔

آج کا ترقی یافتہ دور بلاشبہ سائنس ہی کے مرہون منت ہے حقیقت میں وہی قومیں اوج ثریا تک پہنچیں جنہوں نے سائنس کی دنیا میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے۔ ہمارے ملک میں بھی اس وقت سائنس کی ترقی و تعمیر کے لیے بہت سے منظم ادارے کام کر رہے ہیں جن میں اور زیادہ بہتری کی گنجائش ہے۔

نیشنل میوزیم آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، لاہور میں مورخہ 08-06-2004 کو ایک بجے سہ پہر تین بجے تک جدید اور پیچیدہ دوربینوں کے ذریعے اور بڑی سکرین پر لوگوں کو سیارہ زہرہ کا سورج کے سامنے سے گزرنے کا مشاہدہ کرانے کا اہتمام کیا گیا۔ لوگوں کثیر تعداد نے یہ نظارہ براہ

راست دیکھا۔ زہرہ سیارہ تقریبا08 سال میں دو دفعہ اور پھر 122 سال کے بعد دو دفعہ زمین سے ٹکرانے والا منظر فراہم کرتے ہوئے سورج کے سامنے سے گزرتا ہے اب یہ سیارہ 2012 میں دوبارہ سورج کے سامنے سے سے گزرے گا اس سے پہلے یہ سیارہ 1882ء میں سورج کے سامنے سے گذرا تھا۔

سائنس میوزیم نے محدود پیانے پر کمپیوٹر پروگرام کا ماہانہ کورس شروع کیا ہوا ہے جس میں کوئی فیس نہیں لی جاتی یہ پروگرام ہر ماہ کی 15 تاریخ سے شروع ہوتا ہے اوراس کے لیے درخواستیں ہر ماہ کی پہلی تاریخ سے دس تاریخ تک وصول کی جاتی ہیں۔

''بچوں کا جنگ'' لاہور۔ تحریر: رؤف ظفر

O

قذافی سٹیڈیم، لاہور

قذافی سٹیڈیم نے اپنے قیام کے بعد کرکٹ کے علاوہ ریسلنگ، فٹ بال، والی بال مقابلوں کے کئی رنگ دیکھے یہاں تک کہ میلے ٹھیلوں، ریچھ کتوں کی لڑائی، سیاسی جلسوں، میوزک کی تقریبات اور اجتماعی شادیوں کی میزبانی بھی کی۔ جھارا اور انوکی کا مقابلہ آج بھی لوگوں کے ذہنوں میں تازہ ہے کیونکہ یہی تاریخی دنگل طاقت کے پہاڑ زبیر عرف جھارا کی زندگی کی اختتامی کہانی بھی بن گیا تھا اس مقابلے کے مصنف خواجہ محمد اسلم جیسی کھیلوں کی نامور شخصیت تھی اس سٹیڈیم میں ملک کے مقبول ترین کھیل کرکٹ کو چلانے والے ادارے پاکستان کرکٹ بورڈ کا ہیڈ کوارٹر بھی ہے لاہور کے مرکزی علاقے میں اب قذافی سٹیڈیم کے اردگرد نیشنل ہاکی سٹیڈیم، سائیکلنگ ویلوڈروم، پنجاب سٹیڈیم نیشنل کرکٹ اکیڈیمی، فٹ بال ہاؤس تعمیر ہو چکے ہیں۔ایک وقت تھا جب اس پورے علاقے کو نشتر پارک کہا جاتا تھا اور اب بھی اسی نام سے پکارا جاتا ہے گویا دوسرے لفظوں میں یہ سارا علاقہ سپورٹس زون کے حوالے سے جانا پہچانا جاتا ہے۔

یہ 1951-52 کی بات ہے جب اس وقت مغربی پاکستان کے گورنر اور کرکٹ بورڈ کے سربراہ سردار عبدالرب نشتر نے اس سٹیڈیم کی بنیاد رکھی۔ پی ڈبلیوڈی نے اس کی تعمیر کا بیڑہ اٹھایا۔ اس کے بعد سٹیڈیم کے کئی نام بدلے گئے۔اولمپک سٹیڈیم، لاہور سٹیڈیم کے بعد نام تبدیل کرنے کا یہ سلسلہ قذافی تک آن کر اختتام کو پہنچا۔اس وقت یہ نام بھی بدلنے کے خدشات پیدا ہورہے تھے جب یہاں ورلڈ کپ 1996ء کے میچ منعقد کئے گئے اور یہ کہا جانے لگا کہ امریکہ بہادر کو کسی طور لیبیا کے مردآہن کا نام بار بار سننا پسند نہیں ہے۔

1972ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے اس کو قذافی سٹیڈیم کا نام دے دیا اگلے ہی برس لاہور اسلامی سربراہ کانفرنس کا میزبان بنا تو دنیا بھر سے آئے مہمانوں کا بے پناہ استقبال کیا گیا اس کانفرنس کے بعد سٹیڈیم میں جلسے کا اہتمام کیا گیا جس میں کرنل معمر قذافی مہمان خاص تھے

ذوالفقار علی بھٹو اور کرنل معمر قذافی جیسی وقت کی سحر انگیز شخصیات کی جھلک دیکھنے کے لیے سٹیڈیم عوام سے بھرا ہوا تھا۔ اس خاص موقع کے لیے خصوصی طور پر چاندی کا ماڈل بنوایا گیا تھا نیا نقشہ بنوایا گیا جس پر عمل ہوتا تو موجودہ سٹیڈیم سے کہیں زیادہ گنجائش ہوتی کیوریٹر محمد بشیر نے ماڈل اور نقشہ گورنر غلام مصطفیٰ کھر کو پیش کیے انہوں نے اس وقت سپورٹس بورڈ پنجاب کے سربراہ افضل محمود کو دیئے اور ان کو ذوالفقار علی بھٹو تک پہنچے جنہوں نے کرنل قذافی کو پیش کر دیئے قذافی سٹیڈیم کا نام رکھنے کے بعد یہ سلسلہ رک گیا لیکن اسے خوبصورت بنانے کا سلسلہ نہ صرف جاری رہا بلکہ اب بھی جاری ہے ورلڈ کپ 1987ء اور عالمی کرکٹ کپ 1996ء میں اس نے شاندار میزبانی کی نئی مثال قائم کی۔

1987ء کے ورلڈ کپ کے کامیاب انعقاد میں بورڈ کے سربراہ جنرل صفدر بٹ، سیکرٹری اعجاز بٹ اور یارو سعید کا بڑا ہاتھ تھا اس کے بعد 96ء کے عالمی کپ سے ایک سال پہلے ایک نئے سٹیڈیم کا منصوبہ بنایا گیا ان دنوں نواز شریف کی حکومت تھی جسٹس نسیم حسن شاہ کے ساتھ شاہد رفیع سیکرٹری تھے۔ اس مجوزہ سٹیڈیم میں تماشائیوں کے لیے بہت زیادہ گنجائش رکھی گئی اور ساتھ کلب ہاؤس بنانے کا پروگرام بھی تھا لیکن اس پر عمل نہ کیا جا سکا۔ اس جگہ اب پنجاب سٹیڈیم تعمیر کیا گیا ہے یہ منصوبہ پورا نہ ہونے پر قذافی سٹیڈیم کی ہی تزئین و آرائش کی گئی۔ اس کے گرد 71 دکانیں بنائی گئیں جو لیز پر دی گئی ہیں فائبر کی بنی چھتیں ڈالی گئیں سٹیڈیم کے اندر انکلوژرز کو کرسیوں سے مزین کیا گیا جس سے اس میں تماشائیوں کی گنجائش کم ہو کر اب 25 ہزار کے قریب رہ گئی ہے فلڈ لائٹس لگائی گئیں اور ان کی روشنیوں میں سری لنکا، آسٹریلیا، کے درمیان مارچ 1996ء میں کھیلے جانے والے ورلڈ کپ فائنل نے خوب سماں باندھ دیا۔ عارف عباسی نے اس سلسلے میں انتھک کام کیا۔ اب ایک بار پھر سٹیڈیم میں تبدیلیاں لائی جانے والی ہیں پی سی بی کے سربراہ بورڈ کے دفاتر کو یہاں سے منتقل کرنے کا اعلان کر چکے ہیں جبکہ میڈیا گیلریز کو مخالف سمت میں منتقل کیے جانے کا امکان ہے جنوبی افریقہ میں ہونے والے ورلڈ کپ 2003ء میں شرکت کرنے والی پاکستانی ٹیم کو موسیقی کی رنگارنگ تقریب سجا کر الوداع کیا گیا۔ قذافی سٹیڈیم اب تک کرکٹ بورڈ کے 25 سربراہ دیکھ چکا ہے جبکہ پاکستان کی اور کئی غیر ملکی کرکٹرز کی لاوزوال کارکردگی کا چشم دیدہ گواہ بھی ہے اس سٹیڈیم میں اب تک کھیلے جانے والے ٹیسٹ میچوں میں پاکستانی ٹیم کا سب سے بڑا اسکور پانچ وکٹوں کے نقصان پر 699 رنز ہیں جو بھارتی ٹیم کے خلاف بنائے گئے تھے ایک ہی اننگز میں سب سے بڑا

مجموعہ پاکستانی ٹیم نے سات وکٹ پر 699 بنا کر سجایا تھا اور یہ بھی بھارت کے خلاف ہی بنایا گیا۔ قذافی میں سب سے کم سکور پر نیوزی لینڈ کی ٹیم آؤٹ ہوئی جب تمام کھلاڑی پاکستان کے خلاف صرف 73 رنز پر آؤٹ ہو گئے تھے پاکستان ٹیم نے اس سٹیڈیم میں اپنا کم سے کم سکور 77 کیا جب ویسٹ انڈیز کی ٹیم نے میزبان بیٹسمینوں کی ایک نہ چلنے دی تھی۔ انگلینڈ کا یہاں کم سے کم سکور 130، انڈیا کا 156، سری لنکا کا 156، ویسٹ انڈیز کا 173، آسٹریلیا 214 اور جنوبی افریقہ 241 ہے ون ڈے انٹرنیشنل میچوں میں پاکستانی ٹیم نے سب سے زیادہ اسکور آٹھ کھلاڑیوں کے نقصان پر 315 رنز بنائے جو آسٹریلیا کے خلاف بنائے گئے جبکہ مجموعی طور پر یہاں سے بڑا اسکور بنانے کا اعزاز انگلش ٹیم کو حاصل ہے جس نے پاکستان کے خلاف چار وکٹوں پر 324 رنز بنائے تھے ایک روزہ میچوں کے سب سے کم اسکور پر یہاں بھارتی ٹیم پاکستان کے خلاف 122 رنز پر آؤٹ ہوئی جبکہ پاکستان ٹیم کا کم سے کم سکور سری لنکا کے خلاف 137 ہے۔

قذافی سٹیڈیم میں انضمام الحق، وسیم اکرم، ظہیر عباس، عمران خان، جاوید میاں داد، سلیم ملک، محمد یوسف کے ساتھ ساتھ کئی پاکستانی کرکٹرز نے یادگار کارکردگی دکھائی۔ ورلڈ کپ 1996ء کے بعد کینیڈا میں صحارا کپ کھیل کر پاکستان میں تین ایک روزہ میچ کھیلنے والی بھارتی ٹیم کی جو درگت اعجاز احمد نے بنائی تھی وہ بھی تاریخ کا حصہ بن گئی۔

1998ء کے ورلڈ کپ کے سلسلے میں اس سٹیڈیم کو دوبارہ سے تزئین و آرائش کی گئی اس کو ملک کے مشہور ماہر تعمیرات نیر علی دادا نے ڈیزائن کیا تھا جنہوں نے مغلیہ طرز کی اینٹوں سے اس کو مزین کیا۔ اس میں کنکریٹ بینچز کے بجائے سٹیڈیم کے چاروں جانب مکمل طور پر بیٹھنے کا انتظام کر دیا ہے۔ وی آئی پی لاؤنجز کے داخلے کے راستے اور ڈریسنگ رومز کو بھی مکمل طور پر ائیر کنڈیشنز اور جدید سہولتوں سے آراستہ کیا گیا ہے اُن میں ٹی وی سیٹ کی سہولت بھی فراہم کی گئی ہے سٹینڈ کے نیچے جو جگہ ہے وہ دکانوں اور دفاتر میں تبدیل کر دی گئی ہے۔ یہ پاکستان کا واحد سٹیڈیم ہے جس میں جدید فلڈ لائٹس کی تنصیب کی گئی ہے اور ان کو جلانے کے لیے متبادل بجلی پیدا کرنے کی سہولیات بھی مہیا کی گئی ہیں۔ قذافی سٹیڈیم نے 1996 کے ورلڈ کپ کرکٹ ٹورنامنٹ کے میزبانی کے فرائض بھی انجام دیئے جس کو تقریباً 60,000 شائقین نے براہ راست دیکھا۔

○

لاہور فلائنگ کلب

لاہور میں پہلا فلائنگ کلب 1931ء میں قائم ہوا اس کلب کا آغاز پنجاب فلائنگ کلب کے نام سے چار ماہر ہوابازوں ڈاکٹر گوکل چند، سر بندر سنگھ مجیٹھ، روپ چند اور ڈاکٹر جے بی سپرول نے کیا تھا۔ کلب کے قیام کے ایک سال بعد اس کا نام بدل کر نادرن انڈیا فلائنگ کلب رکھا گیا والٹن میں واقع یہ ایئر پورٹ جنوبی ایشیا کے پہلے فلائنگ کلب کی حیثیت بھی رکھتا ہے یہیں سے سول ایوی ایشن نے پروازوں کا سلسلہ شروع کیا تھا لاہور اور کراچی کے درمیان فضائی سروس 1934ء اور لاہور دہلی سروس 1938ء میں شروع ہوئی تھی۔

جس دور میں اس ایئر پورٹ اور کلب کا آغاز ہوا اس وقت طیارے اتنے مہنگے نہیں ہوتے تھے اور نہ ہی ایندھن بہت مہنگا تھا یہی وجہ ہے کہ اس نے بہت جلد شائقین میں اپنی جگہ بنالی۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ والٹن ایئر پورٹ اس خطے کا سب سے بڑا اور اہم تفریحی ہوائی اڈہ مشہور ہوگیا۔ اس زمانے میں امراء اور روساء محض تفریح طبع کے لیے ہوابازی سیکھتے تھے مگر دوسری عالمی جنگ میں ماہر ہوابازوں کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی ایسے میں والٹن ایئر پورٹ اور اس کا فلائنگ کلب انتہائی اہمیت حاصل کر گئے اور یہاں عام لوگوں کو بھی ہوابازی کی تربیت دی جانے لگی۔ ہندوستان کے طول وعرض سے آنے والے صوبہ پنجاب کے مہمان اسی ایئر پورٹ پر اترتے۔ قیام پاکستان کے موقع پر حضرت قائداعظم کا طیارہ دارالحکومت جانے سے پہلے والٹن میں ہی اترا تھا قائداعظم یہاں متعدد بار تشریف لائے تھے۔

یہیں سے فضائی کمپنی اورنیٹ ایئرویز کی پروازیں پورے ملک اور دوسرے ممالک میں جاتی تھیں البتہ تقسیم کے بعد مالی مشکلات کی وجہ سے دو سال تک اس ایئر پورٹ کی سرگرمیاں تقریباً معطل رہیں۔ 1949ء میں جب پاکستانی حکومت کو فضائی ماہرین کی شدید ضرورت کا احساس ہوا تو والٹن ایئر پورٹ اور اس میں چلنے والے فلائنگ کلب کا سلسلہ دوبارہ سے شروع ہوا اور یہاں

سے ازسرنو فضائی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ نومبر 1954ء میں فلائنگ کلب کا نام ناردرن انڈیا فلائنگ کلب لاہور سے تبدیل کر کے ''لاہور فلائنگ کلب'' رکھ دیا گیا۔ لاہور فلائنگ کلب نے نہ صرف پاکستان میں ہوابازی کی تربیت کے سلسلے میں خدمات انجام دیں بلکہ یہ دوسرے ممالک کی ایئر لائنز کو بھی ماہر ہواباز مہیا کرنے میں معاون ثابت ہوتا رہا۔ تربیت کے سلسلے میں حکومت بھی فلائنگ کلب کی امداد کیا کرتی تھی 1955ء میں لاہور چھاؤنی کے علاقے میں نیا ایئر پورٹ تیار ہوا تو والٹن ایئر پورٹ صرف ہوابازی کی تربیت کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا۔

1959ء میں مارشل لاء کے زمانے میں تمام قسم کی فضائی سرگرمیاں وزارت دفاع کے زیر انتظام کر دی گئیں تو ہوابازی کا شوق بھی عام لوگوں کے لیے شجر ممنوعہ قرار پایا اس کے ساتھ ہی ہوا بازی سکھانے کے سلسلے میں حکومت کی جانب سے ملنے والی امداد بھی بند ہوگئی نئے طیارے اور پرانے طیاروں کے پرزوں کا حصول شائقین کے لیے مشکل کر دینے سے وہ بھی ہوابازی کی تربیت سے کنارہ کش ہو گئے جس کی وجہ سے کلب ایک بار پھر بحران کا شکار ہو گیا۔

فلائنگ کلب کا کردار مختصر کر کے اسے چارٹر پروازیں چلانے اشتہاری بینر لہرانے فصلوں پر سپرے کرنے اور پبلسٹی پرچیاں پھینکنے تک محدود کر دیا گیا۔ ان نامساعد حالات کے باوجود لاہور فلائنگ کلب بند نہ ہوا اس کی تنظیم کے عہدیدار اپنے طور پر مشکلات پر قابو پاتے رہے۔ لاہور فلائنگ کلب کی سلور جوبلی والٹن ایئر پورٹ پر 9 اپریل 1961ء کو منائی گئی جس کے مہمان خصوصی زون بی کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر لیفٹیننٹ جنرل بختیار رانا تھے اس زمانے میں لاہور فلائنگ کلب نے یہ پروگرام بھی بنایا تھا کہ وہ بڑے شہروں کے لیے اپنی ٹیکسی سروس شروع کرے سابق وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے 13 مئی 1990ء کو فلائنگ کلب کی گولڈن جوبلی تقریبات میں شرکت کی تھی۔

''نیا لاہور'' تحریر: محمد نعیم مرتضیٰ

○

سیکرڈ ہارٹ کیتھڈرل (چرچ)، لاہور

لاہور شہر میں دو نمایاں اور بڑے کیتھڈرل ہیں۔ ان میں سے ایک سٹیٹ بنک آف پاکستان کی عمارت کے سامنے واقع ہے اور دوسرا لارنس روڈ پر موجود ہے لارنس روڈ کے کیتھڈرل کو سیکرڈ ہارٹ آف جیسز کیتھڈرل کہتے ہیں اس گرجا گھر کا سنگ بنیاد گارڈ فری پلیمکنس نے 14 اکتوبر 1903ء کو رکھا تھا۔ اس کی عمارت نومبر 1907 میں مکمل ہوگئی اور یہاں ارچ بشپ خدمات انجام دے رہے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد 6 نومبر 1956ء کو مقامی آبادی کی خاطر اس گرجا گھر میں پنجابی واعظ کا آغاز کر دیا گیا اس کے روح رواں پادری لڈون تھے اگلے برس یعنی 1957ء کو گرجا گھر کی گولڈن جوبلی دھوم دھام سے منائی گئی۔ 19 اکتوبر 1973ء کو کراچی کے پادری ارمانڈو فرنیڈ کو یہاں بطور اسقفی نامزد کیا گیا۔

1975ء میں ٹرتیڈ اڈ لاہور کے بشپ اور 23 اپریل 1994 کو آرچ بشپ مقرر کئے گئے۔ ساتھ ہی ساتھ پوپ جان پال دوم نے لاہور ڈایوسیز کو آرچ ڈیواسز کا درجہ بھی دے دیا تھا اس ڈیوایسز میں لاہور ڈویژن کے اضلاع قصور، شیخوپورہ، گوجرانولہ اور نارووال شامل ہیں یہ رومن کیتھولک فرقے کا بڑا چرچ ہے اور اس طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔

لاہور ڈیوایسز کے تحت 236 سکول، دو کالج اور بارہ ہاسٹلز کام کر رہے ہیں پیشہ وارانہ اور فنی تعلیم کے ادارے اس کے علاوہ ہیں۔ اس نے کمیونٹی ہال، گرجا گھر اور مقدس پہاڑیاں بھی بنوائی ہیں۔ ریڈیو ویریقیاس جو ایک بین الاقوامی کیتھولک ریڈیو ہے ڈیوایسز کے اشتراک سے لاہور میں کام کر رہا ہے۔ ڈیوایسز نے لاہور میں ایک جدید سٹوڈیو بھی قائم کر رکھا ہے جہاں مذہبی گیت ریکارڈ کیے جاتے ہیں۔ ڈیوایسز سے مراد کسی بشپ یا آرچ بشپ کے زیر انتظام موجود مذہبی علاقہ ہوتا ہے۔

سیکرڈ ہارٹ کیتھڈرل گرجا گھر کا نقشہ انیورپ کے ایک ماہر انجینئر نے تیار کیا تھا اس ماہر فنکار کو بہترین فن تعمیر کا انعام ''پرائز آف روم'' بھی دیا گیا۔ گرجا گھر کے بڑے مینار کی بلندی 165 فٹ ہے جبکہ گنبد 120 فٹ اونچا ہے یہ مخصوص انداز تعمیر گوتھک میں بنایا گیا ہے جو یورپ میں عرصہ دراز تک رائج رہا اس طرز کو سولہویں اور سترھویں صدی عیسوی میں زیادہ فروغ حاصل ہوا تھا۔

برصغیر میں انگریز عہد حکومت کے دوران جہاں گرجا گھر ''گوتھک'' انداز میں تعمیر کیے گئے وہیں شہر کی بعض دوسری عمارات بھی اسی طرز پر بنائی گئیں۔ ان میں کراچی کا فریئر ہال اور لاہور کا گورنمنٹ کالج نمایاں ہیں۔

چرچ کی کل لمبائی 200 فٹ ہے جن میں سے 30 سے 40 فٹ کا حصہ عبادت گاہ کے طور پر مختص کیا گیا ہے چرچ کی چوڑائی 68 فٹ ہے عیسائیوں کے مقدس بزرگوں جن میں ہربرٹ، آگسٹائن، مارگریٹ اور میری وغیرہ کے مجسمے بھی اسی چرچ میں موجود ہیں جبکہ چار دوسرے مجسمے سینٹ جوزف اور سینٹ انتھونی کے لیے مخصوص ہیں۔ 1955ء میں سینٹ انتھونی کی یاد میں ایک عبادت گاہ بنائی گئی جس میں آٹھ شیشوں والی کھڑکیاں ہیں چرچ کا اندرونی حصہ بھی انتہائی دلفریب ہے جتنا قریب سے اس عمارت کو دیکھا جائے تو یہ تعمیر کی ایک نفیس اور عمدہ کڑی معلوم ہوتی ہے اس چرچ کا شمار ملک کے بڑے بڑے چرچوں میں ہوتا ہے 19 نومبر 2001ء کو لاہور کا سیکرڈ ہارٹ کیتھڈرل اپنے 94 وی سال پورے کر چکا ہے۔

سیکرڈ ہارٹ کیتھڈرل میں لکڑی کا عمدہ اور نفیس کام کیا گیا ہے علاوہ ازیں جیومیٹری کی شکل کے بعض شاہکار بھی دیکھے جا سکتے ہیں دیواروں پر سنگ مرمر کی تختیاں نصب ہیں جن پر ماضی کے پادری صاحبان کے متعلق تحریریں درج ہیں یہیں ایسی تصاویر موجود ہیں جو حضرت مسیح علیہ السلام کو مصلوب کرنے کی داستان بیان کرتی ہیں یہ چرچ لاہور کے خوبصورت ترین گرجا گھروں میں شمار ہوتا ہے۔ کیتھڈرل ہارٹ کے بڑے بڑے گنبد رومن فن تعمیر کی یاد دلاتے ہیں۔

لاہور کیتھڈرل دی مال

لاہور کا یہ سب سے بڑا اور خوبصورت گرجا گھر شاہرا قائداعظم پر واقع ہے جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ یہ سٹیٹ بینک کی لاہور شاخ کے عین سامنے واقع ہے شروع میں یہ ''کگڑ گرجا'' کے

نام سے معروف تھا۔ اس کی وجہ اس کے مینار پر نصب مرغ بادنما تھا۔ اس لیے لوگ اسے اس نام سے موسوم کرنے لگے مگر 1911ء کے زلزلے میں یہ مرغ گر گیا اور لوگ اسے رفتہ رفتہ اس نام سے پکارنا بھولنے لگے آج شاید بہت کم لوگ اس نام سے واقف ہوں گے اب اسے لاہور کیتھڈرل کے نام سے ہی جانا جاتا ہے۔ لاہور کیتھڈرل، انجلیکن فرقے کا بڑا گرجا گھر ہے یوں مال روڈ پر بھی دونوں بڑے عیسائی فرقوں کے نمایاں کیتھڈرل موجود ہیں۔ کیتھڈرل اس گرجا گھر کو کہتے ہیں جہاں بشپ یا آرچ بشپ خدمات سرانجام دیتے ہیں اور ان کی رہائش بھی اس کے احاطے میں ہوتی ہے۔

انجلکین چرچ میں آرچ بشپ سب سے بڑا مذہبی رہنما ہوتا ہے جبکہ رومن کیتھولک میں پوپ کو یہ مقام حاصل ہوتا ہے اس کے بعد کارڈنیل اور پھر آرچ بشپ صاحبان ہوتے ہیں یوں مسیحی مذہبی دنیا اس طریقے سے اپنا نظام چلاتی ہے۔

لاہور کیتھڈرل کی نبیاد بشپ تھامس والپی فرنچ کے ہاتھوں مال روڈ کی تعمیر کے وقت ہی رکھ دی گئی تھی اور یہ 1887ء میں مکمل ہوا اس کے لیے انگریز گورنر نے 50 ہزار روپے کی امداد دی جبکہ پچاس ہزار پونڈ کے عطیات بھی جمع کیے گئے اس کا ڈیزائن آرنلڈ سکارٹ کا بنا ہوا تھا جو اپنے زمانے کا نمایاں ماہر تعمیرات تھا اس کی وفات کے بعد اس کے بیٹے نے چرچ کی تکمیل کا فریضہ سرانجام دیا۔

کیتھڈرل کی عمارت 225 فٹ طویل اور 152 فٹ چوڑی ہے اس کے مینار نما کمروں کی اونچائی 65 فٹ ہے گرجا مال روڈ سے قدرے اونچا ہے۔ یہ اندر سے بھی اتنا دلکش ہے جتنی اس کی عمارت باہر سے دیکھنے میں خوبصورت ہے اس میں ایک سنگ مرمر کا حصہ سکاؤٹنگ تحریک کے بانی لارڈ بیڈن پاول کا عطیہ کردہ ہے گرجے پر گھنٹیاں 1904ء میں ملکہ وکٹوریہ کی یاد میں لگائی گئی تھیں۔

چرچ کی عمارت قدیم برطانوی محلات کی یاد دلاتی ہے اس میں رنگ برنگے کھڑکیوں کے شیشے عجب بہار دکھا رہے ہیں جو برطانیہ کے پرانے گرجا گھروں کی یادگار ہیں یہ کھڑکیاں انگلستان سے ہی بنوا کر لائی گئی تھیں۔ ایسی کھڑکیاں صرف انگریز عہد کے گرجا گھروں میں ہی دیکھی جا سکتی ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد تو گرجا گھروں کی تعمیر کا انداز بھی خاصا بدل چکا ہے ایسے میں اس قسم کی لکڑی کی کھڑکیاں تو اب بالکل ہی خواب ہو چکی ہیں۔ اس کیتھڈرل کے احاطے میں صلیب بھی دیکھی جا سکتی ہے جو انارکلی کے مقبرے پر اسی وقت لگائی گئی تھی جب اسے گرجا کی شکل دی گئی تھی۔

1925ء میں صلیب یہاں لاکر رکھ دی گئی۔ علاوہ ازیں یہیں پنجاب کے انگریز گورنر ڈونلڈ میکلوڈ کی یاد میں بنائی گئی سنگ مرمر کی یادگار بھی موجود ہے۔

یہ یادگار ایک صلیب کی شکل ہے کبھی یہ لوئر مال روڈ پر پنجاب سول سیکرٹریٹ کے قریب نصب ہوا کرتی تھی تاہم جب استعماری دور کے بت اور یادگاریں شہر سے ہٹالی گئیں تو یہ یادگار بھی اتار کر کیتھڈرل کے احاطے میں رکھ دی گئی یوں مال روڈ کیتھڈرل دو تاریخی یادگاروں کو بھی اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔

اس گرجا گھر کی تعمیر کلکتہ کی ایک فرم میسر برن اینڈ کمپنی نے کی تھی۔ گرجے میں پتھر کا کام مذکورہ کمپنی نے بلا معاوضہ کیا تھا۔ یہاں ایک کتب خانہ بھی قائم کیا گیا تھا جس میں دینی کتب رکھی گئی ہیں یہ کتابیں پروٹسٹنٹ فرقے کے نقطۂ نظر سے تحریر شدہ ہیں۔ گرجے کی تعمیر اس انداز سے کی گئی ہے کہ یہ گرمی کے شدید موسم میں بھی ٹھنڈا رہتا ہے۔

O

ریس کورس پارک، لاہور

ریس کورس پارک 188 ایکڑ رقبے پر مشتمل ہے یہ قطعہ زمین لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی LDA نے 78-1977 میں یہاں پارک کے قیام کے لیے وقف کی تھی۔ جبکہ اس پر کام کا آغاز 81-1980ء کے عشرے میں شروع ہوا۔ پارک کے ترقیاتی کام اور اس کے مکمل ہونے پر پنجاب کے گورنر مرحوم لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ غلام جیلانی خان نے 3 اکتوبر 1985ء کو اس پارک کا باقاعدہ طور پر افتتاح کیا۔ ریس کورس پارک کا نقشہ جاپان کے ماہر نقشہ نویس پروفیسر کیمو کانڈو نے اپنی خصوصی کاوش اور ذاتی ہنرمندی کے ساتھ تیار کیا۔

اس پارک کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ لاہور میں نئے قائم ہونے والے پارکوں میں سے یہ اپنی نوعیت کا واحد پارک ہے کہ جو ہرا بھرا اور سرسبز و شاداب ہے اس میں 50 فٹ اونچی پلاسٹر آف پیرس کی بنی ہوئی آبشار شائقین کو بہت محظوظ کرتی ہے۔

پاکستانی نقشے کی شکل میں بنی ہوئی جھیل، کشتیوں کی سہولت کے ساتھ یہاں موجود ہے۔ اس پارک کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہاں کے دلچسپ فوارے ہیں جو جدید ٹیکنالوجی اور ڈیزائن کے ساتھ یہاں نصب ہیں اور شام ڈھلنے کے بعد اپنی مختلف اشکال میں لوگوں کی توجہ کھینچتے ہیں ان فواروں کے پاس لوگوں کا بے پناہ ہجوم اکٹھا رہتا ہے۔ آبشار کے تھوڑے فاصلے پر بطخوں، موروں، رنگ برنگی چڑیوں، کبوتروں خرگوش اور کونجوں کے انتہائی نفیس گھونسلے بنائے گئے ہیں۔

اس پارک میں بے شمار ہرے بھرے درخت اور دلفریب رنگوں پر مشتمل پودوں اور گملوں میں لگے اور سجے ہوئے پھول بھی اس پارک کی شادابی کو چار چاند لگا رہے ہیں۔

بہت سے شائقین جو اکثر اس باغ کی سیر کو آتے رہتے ہیں نے اپنی عوامی رائے کا اظہار یوں کیا ہے کہ بچوں کے پارک پر مشتمل حصے کو اور زیادہ بہتر بنایا جائے، سائیکل ٹریک کا قیام عمل

میں لایا جائے۔مونو ریل ٹریک بچھایا جائے اور آبشار کو مزید بہتر اور صاف ستھرا رکھا جائے۔

جبکہ پارکس اینڈ ہارٹی کلچرل اتھارٹی، ریس کورس پارک کو اور زیادہ بہتر اور اچھا کرنے کے لیے بے شمار منصوبوں پر کام کر رہی ہے جن میں جمنیزیم کا قیام وتعمیر، مطالعہ گاہ، مرد وخواتین کے لیے فٹنس سینٹر کی تعمیر، جوگنگ ٹریک کی بہتری، ریسٹورنٹ کا قیام، جیل روڈ کا منصوبہ، کرکٹ گراؤنڈ کا قیام، فواروں، فلڈ لائٹ اور روشنیوں کی تنصیبات وغیرہ شامل ہیں ریس کورس پارک کی ایک اور نمایاں اور دلچسپ خصوصیت یہاں پر منعقد ہونے والا رنگا رنگ جشن بہاراں ہے جو گذشتہ دس سال سے جاری ہے اور اس میں ہر سال بیش قیمت اور منفرد کمالات دکھائے اور بیسیوں سٹالز لگائے جاتے ہیں اس میلے میں پنجاب کی ثقافت کی جھلک واضح طور پر دکھائی دیتی ہے جشن بہاراں کو دیکھنے کے لیے لوگ بہت دور دور سے آتے ہیں۔

○

گلشن اقبال پارک، لاہور

گلشن اقبال پارک، لاہور کا ڈیزائن اور نمونہ جاپان کے مشہور ماہر نقشہ نویس پروفیسر کیمو کانڈو نے تیار کیا جس میں کچھ اضافی تبدیلی وردوبدل بھی کیا گیا۔ اس پارک کا کل رقبہ (67) ایکڑ کے لگ بھگ ہے۔

اس پارک پر 1980ء کے عشرے میں کام شروع کیا گیا یہ تمام مشکل کام لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے سابق ڈائریکٹر جنرل ایم ایچ انصاری کی ذاتی کوششوں و کاشوں کے باعث اپنے اختتام کو پہنچا۔ اس پارک کا افتتاح پاکستان کے سابق صدر جنرل ضیاء الحق نے 19 اپریل 1982ء کو کیا تھا۔

اس پارک کی نمایاں خصوصیات میں شامل جھیل جس کا رقبہ چھ ایکڑ پر مشتمل ہے نہایت ہی دیدہ زیب اور دلکش فٹ پاتھ، بچوں کے کھیلنے کا باغ اور فن لینڈ، مچھلیوں کا تالاب، جوگنگ ٹریک 1.85 کلومیٹر ایریا فن لینڈ کے لیے نئی کھیلوں کا تعارف، سیکاننگ رنگ، قیمتی گراسی لان، جاسمین، چنبیلی، گلاب اور دوسرے موسمیاتی درخت شامل ہیں۔ اپنے منفرد اور دیگر دلچسپیوں کے باعث لاہور کا یہ نیا پارک لوگوں سے کھچا کھچ پارک بھرا رہتا ہے۔

○

منٹو پارک/اقبال پارک، لاہور

لاہور کے قدیم نقشہ جات پر نگاہ دوڑائی جائے تو پرانے شہر کے اردگرد باغات کا ایک وسیع سلسلہ نظر آتا ہے وقت کے ساتھ ساتھ فیصل شہر کے ساتھ موجود باغ تجاوزات کی نذر ہو گیا اس کی باقیات سرکلر روڈ کے ساتھ کہیں کہیں موجود ہیں شاہی قلعہ کے قریب بادامی باغ اسی منظر کو چار چاند لگاتا تھا۔ سکھوں کی حکومت تک یہ باقاعدہ گراؤنڈ کی حیثیت اختیار کر گیا۔ سکھ افواج اس گراؤنڈ میں جنگی مشقیں کرتیں رفتہ رفتہ یہ جگہ سرکاری پریڈ گاہ بن گئی یہاں گھڑ دوڑ کے مقابلے ہوئے نیزہ بازی کا مظاہر کیا جاتا اور کشتیاں لڑی جاتی۔

سکھوں کے بعد حکومت انگریزوں کے پاس پہنچی تو انہوں نے اس گراؤنڈ میں گھاس پھوس لگا کر اسے پارک کی شکل دے دی اور اسے گورنر لارڈ منٹو کے نام پر ''منٹو پارک'' سے موسوم کر دیا۔

انگریزی عہد میں یہ پارک فوجیوں کے زیر استعمال رہا اہم مواقع پر یہاں فوجی پریڈ بھی ہوتی اور بوقت ضرورت فوج پڑاؤ بھی کرتی تھی۔ البتہ عام دنوں میں منٹو پارک لوگوں کے لیے سیر و تفریح کے لیے کام آتا تھا شہر کے قریب ترین ہونے کی وجہ سے عوام میں اس کی بے پناہ مقبولیت تھی و ایسے بھی اس وقت تک لاہور کے باقی باغات ابھی وجود میں نہیں آئے تھے۔

جو چند ایک باغات بنے تھے وہ صرف انگریز حکمرانوں اور امراء کے لیے مختص تھے ان میں گول باغ اور لارنس گارڈن نمایاں تھے ان دونوں باغات میں حکمران طبقے کی تفرح طبع کا سامان مہیا کیا گیا تھا جن میں بینڈ کا مظاہرہ اور رقص کی محفلیں شامل تھیں۔

عام شہریوں کی تفریح، کھیلوں اور تقریبات کے لیے منٹو پارک نمایاں مقام تھا مدتوں سے اہل لاہور آخری چہار شنبہ کے موقع پر منٹو پارک سیر کے لیے آتے ہیں اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے عرس داتا صاحب پر بھی میلہ اس گراؤنڈ میں لگتا ہے۔

ہر سال اکتوبر کے مہینے میں ہندو منٹو پارک میں ایک ہفتہ تک دسہرہ کا تہوار مناتے اس موقع

پر وہ راون کے بڑے بڑے پتلے نذر آتش کرتے اور جشن منایا کرتے تھے۔ بیساکھی کے موقع پر بھنگڑوں اور ڈھول کی تھاپ پر رقص کے لیے منٹو پارک ایک مشہور مقام ہوا کرتا تھا موسم بہار میں پتنگ بازی کے لیے ہر مذہب کے لوگ منٹو پارک میں ہی آتے تھے۔ گو بسنت کا مخصوص تہوار سکھ گورو مانگٹ ہندو سادھی حقیقت رائے اور مسلمان مادھولعل حسین پر مناتے مگر عمومی طور پر پتنگ اڑانے کے لیے وہ منٹو پارک کا ہی رخ کرتے تھے۔

جس زمانے میں انگریز حکومت کے خلاف تحریکوں کا آغاز ہوا تو کانگریس اور دیگر جماعتیں منٹو پارک اور اس کے آس پاس جلسے منعقد کیا کرتی تھیں۔ منٹو پارک کو ملک گیر شہرت اس وقت حاصل ہوئی جب یہاں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت مسلمانوں کے محبوب قائداعظم محمد علی جناح نے فرمائی اور یہ تاریخی تقریب ثابت ہوئی۔

قیام پاکستان کے بعد جب یہاں قرارداد لاہور کی یادگار کے طور پر مینار پاکستان تعمیر ہوا تو مینار پاکستان کی وجہ سے منٹو پارک نہ صرف تفریحی مقام بن گیا بلکہ بڑے بڑے سرکاری جلسے بھی یہیں منعقد ہونے لگے جنوری 1949ء میں بلدیہ نے منٹو پارک کا نام بدل کر اقبال پارک رکھ دیا تھا تاہم بڑے بوڑھے اسے ابھی تک منٹو پارک کے نام سے ہی یاد کرتے ہیں۔

ایک زمانے تک منٹو پارک پہلوانوں کا بھی مرکز رہا یہاں چھٹی کے دنوں میں کشتیوں کے مقابلے منعقد ہوتے جنہیں دیکھنے کے لیے بیس بیس چالیس چالیس ہزار افراد بھی بعض اوقات منٹو پارک ہی موجود ہوا کرتے تھے یہاں کئی یادگار کشتیاں ہوئیں۔

پہلوانوں کے علاوہ منٹو پارک پتنگ بازوں کا بھی پسندیدہ مقام رہا ہے کھلے گراؤنڈ میں لمبے پیچ لڑانا اور پتنگ بازی کے مقابلے میں منعقد کرانا اس گراؤنڈ کی روایت رہی ہے عوام کے اس قدر رجحان اور دلچسپی کے باعث حکومت پنجاب نے منٹو پارک میں سپورٹس کمپلیکس تعمیر کروایا جہاں مختلف کھیلوں کے لیے جمنیزیم بھی موجود ہیں۔ منٹو پارک نے وہ تاریخ ساز لمحہ بھی دیکھا جس کی وجہ سے یہ تاریخ اقوام عالم میں نمایاں مقام حاصل کر گیا۔ 23 مارچ 1940ء کا وہ یادگار دن تھا جب آل انڈیا مسلم لیگ کا 24واں اجلاس منعقد ہوا اس موقع پر قرارداد لاہور پیش کی گئی جو وطن عزیز پاکستان کے قیام کا عنوان بنی اس موقع پر منٹو پارک میں ہزاروں لوگ جمع تھے۔ کہنے کو یہ مسلم لیگ کا عام اجلاس معلوم ہوتا تھا مگر اس وقت شاید کسی کو یہ وہم گمان بھی نہیں ہوگا کہ تاریخ کتنا اہم فیصلہ سنا رہی ہے۔ قائداعظم کے منٹو پارک میں کہے گئے ایک ایک حرف کو سچ ثابت کر دیا تھا۔

موجودہ اقبال پارک، تقسیم برصغیر سے قبل منٹو پارک کے نام سے مشہور رہا ہے جہاں سابق بھارتی کرکٹ کپتان لالہ امرناتھ سمیت متعدد کھلاڑی انڈیا کی طرف سے کھیلے گئے ٹیسٹ کھلاڑیوں میں دلاور حسین، محمد نثار، سید وزیر علی، سید نذیر علی، امیر الٰہی، گل محمد اور عبدالحفیظ کاردار نے نام کمایا بعد میں پاکستان کی طرف سے عبدالحفیظ کاردار، فضل محمود، سرفراز احمد، نذر محمد، وقار حسین اور محمود حسن کے علاوہ بہت سے دوسرے کھلاڑیوں نے اپنے کیریئر کا آغاز کیا منٹو پارک تقسیم ہند سے قبل اور بعد میں کرکٹ کی نرسری کہلایا۔

سابق گورنر مرحوم لیفٹیننٹ جنرل غلام جیلانی خان کے دور میں کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، اور ایتھلیٹکس کے لیے ایک الگ گراؤنڈ بنائی گئی اس پارک نے ہر کھیل خصوصاً کرکٹ میں ملک کو نامور کھلاڑی دیئے یہاں کی دنگل گاہ میں بھولا برادران نے بھی نے خاصا نام کمایا ہے اب بھی ہزاروں کی تعداد میں نوجوان اور بچے یہاں کھیلنے آتے ہیں۔

ہفت روزہ ''فیملی میگزین'' لاہور۔ تحریر: محمد نعیم مرتضیٰ

24 تا 30 مارچ 2002ء

○

رائل پارک، لاہور

لاہور کی علمی، ادبی فنی، اور ثقافتی تاریخ رائل پارک کے ذکر کے بغیر ادھوری ہے شمال میں ریلوے اسٹیشن میں لکشمی چوک، تین اطراف میں سینما گھر میکلوڈ روڈ اور محمود غزنوی روڈ (سابقہ ایبٹ روڈ) کے سنگم پر واقع یہ تاریخی جگہ بلند و بالا پرانی طرز کی عمارتوں کا جھرمٹ ہے جہاں کل کی طرح آج بھی فلمی دافتر ہیں اور فلموں کی ڈسٹری بیوشن ہوتی ہے فلم پروڈیوسرز کے دفاتر میں پان سگریٹ کی پرانی دکانیں ہیں اور ان دکانوں پر پان کھانے والوں کا رش رہتا ہے پرنٹنگ پریس ہیں۔

رائل پارک میں ''ویٹ اینڈ'' اور کنگ سرکل'' جیسے ہوٹلوں کی جگہ کاروباری مراکز نے لے لی ہے جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ اس علاقے میں علم وادب، ثقافت، فن اور اعلیٰ اقدار کی علمبردار شخصیات رہائش پذیر تھی یا جمع ہوا کرتی تھیں۔ بیٹھکیں جمتی تھیں۔ شعر وادب کی بات ہوتی تھی۔ موسیقی کی دھن تیار کی جاتی تھیں۔ ساٹھ سالہ پاکستانی کو پرانا رائل پارک ایک بارونق علاقے کے طور پر یاد ہے۔

رائل پارک دور دراز سے رزق کی تلاش میں آنے والوں، گلوکار، اداکار بننے کے شوقین اور سینما بینوں کے لیے خصوصی اہمیت کا حامل تھا۔

اب رائل پارک کی مرکزی سڑک پر نہ تو وہ ہوٹل ہی اور نہ ہی وہ سینما گھر۔ پیلس اور ریجنٹ سینما کی جگہ پلازوں نے لے لی ہے اور کچھ نئے تعمیر ہونے والے سینما بھی تھیٹروں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ لکشمی بلڈنگ موجود ہے مگر شکست وریخت کے آخری مراحل میں کچھ بھی حال دیگر عمارتوں کا ہے۔

تجدید لاہور کمیٹی اور میونسپل کارپوریشن کے ارباب بست وکشاد کو چاہیے کہ وہ رائل پارک کی جانب بھی توجہ دیں یہ علاقہ اب اپنے نام کا مصنوعی حسن کھو چکا ہے۔

روزنامہ ''نوائے وقت'' سنڈے میگزین۔ تحریر: جاوید علوی

○

ناصر باغ، لاہور

ناصر باغ، سیاسی تحریکوں اور جلسے جلوسوں کے باعث ملک گیر شہرت کا حامل ہے نواز شریف نے اس علاقے سے الیکشن جیتا تھا اس طرح جاوید ہاشمی، اصغر خاں، میاں اظہر، عبدالحفیظ کاردار اور اسحاق ڈار جیسے لوگ بھی یہیں سے جیتے تھے یہ علاقہ شاعروں اور ادیبوں کا مسکن بھی رہا۔ ناصر باغ، لاہور کی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز چلا آ رہا ہے یہ باغ رنجیت سنگھ کے ایک مصاحب دیوان ہر چند کا تھا اس کی سمادھی اس باغ میں تھی ایک مسلمان بزرگ شادی شاہ کا بھی یہاں مزار ہے انگریزوں نے اس باغ کو ''کمپنی باغ'' کا نام دیا تھا قیام پاکستان کے بعد اس باغ کو مختلف تحریکوں کے حوالے سے خاص شہرت حاصل ہوئی اسے مصر کے صدر جمال عبدالناصر سے موسوم کر کے ناصر باغ کا نام دیا گیا۔ پنجاب کی حکومت نے ادیبوں اور شاعروں کے لیے چوپال کے نام سے یہاں ایک مسکن تشکیل دیا ہے جس میں شہر کے دانشور اور صحافی حضرات اکٹھے ہوا کرتے ہیں۔

حکومت پنجاب اس باغ کو سیاسی، مذہبی اور دیگر جماعتوں کے کارکنوں کے لیے ''ہائیڈ پارک'' کا درجہ دینے پر غور و خوض کر رہی ہے جس میں کارکنان ہر مکتب فکر کے لوگ اپنے اپنے خیالات کا کھل کر اظہار کر سکیں گے۔

○

سوزو واٹر پارک، لاہور

دنیا بھر میں سیاحوں کی تفریح کے لیے رنگارنگ دلچسپیوں کا اہتمام کیا جاتا ہے یعنی خطے تو سیاحت کے لیے ایک مسلمہ حیثیت اختیار کر چکے ہیں جہاں سیاحوں کو ان کے فارغ اوقات سے بھرپور استفادہ حاصل کرنے کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں پاکستان میں بھی سیاحت کا شعبہ روز افزوں ترقی کی منازل طے کر رہا ہے عوام کو زیادہ سے زیادہ سیاحتی سہولیات بہم پہنچائی جارہی ہیں اس اہم شعبہ میں پرائیویٹ سیکٹر کی شمولیت سے نت نئی تفریح گاہوں کا قیام عمل میں آرہا ہے انہی میں سے ایک سوزو واٹر پارک ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک منفرد تفریح گاہ ہے۔

پانی سے تفریح کا حصول سیاحوں کا من پسند مشغلہ ہے جن میں پیراکی، غوطہ خوری، کشتی رانی، مچھلی کا شکار، موٹر بوٹنگ، واٹر سکوٹر کی سواری اور دوسرے واٹر سپورٹس شامل ہیں واٹر سلائیڈنگ بھی پانی کے کھیلوں میں ایک دلچسپ تفریح شمار کی جاتی ہے اور اس حیثیت سے تو یہ ایک امتیازی مقام بھی رکھتی ہے کہ اس سے وہ لوگ بھی تفریح حاصل کر سکتے ہیں جو تیرنا نہیں جانتے۔

سوزو واٹر پارک لاہور کے مشرق میں جلو پارک کے قریب واقع ہے برلب نہر خوبصورت جگہ پر واقع یہ تفریح گاہ 18 مئی 1988ء کو سوا کروڑ روپے کی لاگت سے دو سال کے عرصہ میں مکمل ہوئی۔ یہ واٹر پارک تھائی لینڈ میں واقع ''سیام پارک'' کی طرز کا ہے لیکن اس میں نصب شدہ سامان پاکستان ہی میں بنایا گیا اور پاکستانی انجینئروں نے یہاں کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

قارئین کے لیے یہ بات یقیناً دلچسپی کا باعث ہوگی کہ اس پارک کا نام سوزو SoZo اس کے چیئرمین سہیل لاشاری اور منیجنگ ڈائریکٹر ضوریز لاشاری کے ناموں کے پہلے دو دو حرف کا مخفف ہے سیاحوں کو صحت مند تفریح فراہم کرنے کے لیے دنیا میں کئی واٹر پارک تعمیر کیے گئے ہیں۔ سوزو واٹر پارک پاکستان میں اپنی نوعیت کا پہلا منصوبہ ہے جہاں چھ واٹر سلائیڈس ہیں۔ جن کی اونچائی

62 فٹ اور لمبائی 225 فٹ ہے پانی کو صاف وشفاف اور حفظان صحت کے اصولوں کے مطابق رکھنے کے لیے یہاں فلٹر پلانٹ کے علاوہ کلورین اور چونے کے پانی کا پلانٹ نصب کیا گیا ہے۔ پانی کو موسم کے مطابق موزوں درجہ حرارت پر رکھنے کے انتظامات بھی کیے گئے ہیں۔ واٹر سلائیڈوں کے علاوہ سوئمنگ پول، منی ٹرین، ہوائی جھولا، ریسنگ کاریں، جوائنٹ ویل، راکٹ، بحری جہاز، جمپنگ کاریں، ملی گلی، واٹر بوٹس، سنگل انجن، وغیرہ انڈور گیمز، بیڈمنٹن اور ٹیبل ٹینس یہاں کی تفریح کو دوبالا کرتے ہیں۔

واٹر سلائیڈ لوہے کا بنا ہوا ایک لمبوترا ڈھانچہ ہوتا ہے جس پر جسم کو رگڑ سے بچانے کے لیے فائبر گلاس کی تہہ چڑھی ہوتی ہے اس سلائیڈ پر پانی رواں ہوتا ہے نوجوان سلائیڈ پر سیڑھیوں کے ذریعے اوپر جاتے ہیں اور اس پر سیدھا الٹا لیٹ کر کھڑے ہو کر اور دوسرے مختلف طریقوں سے پھسلتے ہیں۔ بچوں کے پھسلنے کے لیے نسبتاً کم اونچی سلائیڈ بنائی گئی ہے۔ سلائیڈوں پر بہتے ہوئے پانی پر پھسلنے کا تجربہ لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا یہ منفرد تجربہ خود سلائیڈنگ کرنے سے حاصل کیا جاسکتا ہے یا اس کا اندازہ وہاں پر سلائیڈنگ کرتے ہوئے نوجوان اور بچوں کے دمکتے چہروں کو دیکھ کر اور فرط مسرت سے نکلتی ہوئی ان کی آوازوں کو سن کر کیا جاسکتا ہے وہاں اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ ہمارے نوجوانوں کی قوت کے مثبت اخراج کے لیے ایسے تفریحی پارکوں کی کس قدر ضرورت ہے۔

اس منصوبہ کی تکمیل میں سابق وزیراعلیٰ پنجاب اور سابق وزیراعظم جناب نواز شریف اور ٹی ڈی سی پی کے سابق مینیجنگ ڈائریکٹر سلمان صدیق نے کردار ادا کیا اور ہر مرحلے میں ممکنہ سہولتیں بہم پہنچائیں۔ سوز و پارک کے آئندہ منصوبہ جات میں ایک مخروطی طرز کے ویو پول Wave Pool کی تعمیر شامل ہے جہاں سمندر کی طرح لہریں پیدا کی جائیں گی لوگ اس نئی دلچسپ تفریح سے بیحد محظوظ ہوں گے اس کے علاوہ یہاں نشانہ بازی کی سہولت بھی فراہم کی جائے گی۔

عوام میں پانی کی تفریحات کو مقبول عام بنانے کے لیے سوز و واٹر پارک میں سوئمنگ اور واٹر سلائیڈنگ کے مقابلے بھی منعقد کروائے جاتے ہیں پارک میں بڑوں کے لیے 20 روپے اور بچوں کے لیے 12 روپے ٹکٹ مقرر ہے اس ٹکٹ میں واٹر سلائیڈنگ کے علاوہ کئی دوسری تفریحات سے لطف اندوز ہوا جاسکتا ہے۔ جو طالب علم گروپوں کی شکل میں یہاں آتے ہیں انہیں پچاس فیصد رعایت دی جاتی ہے یہاں مختلف گروپوں کے لیے انفرادی بکنگ کا انتظام بھی موجود ہے۔

○

جلوتفریحی پارک، لاہور

لندن جیسے گنجان آباد شہر میں پارکوں کا رقبہ 90فیصد دیانا میں 250اور واشنگٹن میں 1500فیصد مربع فٹ فی کس کے حساب سے مہیا کیا گیا ہے۔

پاکستان کے لوگ صحت اور تندرستی کے لیے کھلی ہوا کے ساتھ پرانے وقتوں سے بڑی عقیدت رکھتے ہیں اس قسم کا ماحول دیہاتوں میں ازخود میسر ہے اور ہماری قومی تندرستی کا موجب ہے اس کے برعکس ہمارے شہروں میں شروع سے کھلی جگہ بہت کم دستیاب ہے۔

لاہور پاکستان کے بڑے شہروں میں شمار ہوتا ہے کراچی کے بعد ملک کا دوسرا بڑا شہر لاہور ہی ہے کچھ عرصے سے یہ شہر چاروں طرف تیزی سے پھیل رہا ہے اور آبادی کے مقابلے میں اسکے تفریحی پارک کم محسوس ہو رہے ہیں شالا مار باغ، شاہدرہ، جناح باغ اور ناصر باغ جیسے پارک لاہور کو ورثے میں ملے۔ لاہور کی بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر پنجاب کے سابق گورنر لیفٹیننٹ جنرل سوار خان نے موجودہ ریس کورس کو پارک بنانے کے احکامات جاری کیے۔

لاہور کے قریب موضع جلو سے ملحق نہر اور جنگل میں محکمہ جنگلات نے شکار اور پبلک کے لیے ایک اور پارک بھی قائم کیا گیا ہے جو نہایت قابل دید ہے 1966ء میں شہر لاہور میں تفریحی پارک کی کمی محسوس کرتے ہوئے لاہور کے نزدیک ایک تفریحی پارک بنانے کا منصوبہ سامنے آیا اور اس کے بعد جلو کے نزدیک ایک ذخیرہ اس مقصد کے لیے چنا گیا جہاں آج جلوتفریحی پارک کا کھلا چڑیا گھر موجود ہے۔

یہ تفریحی پارک یا کھلا چڑیا گھر ساڑھے چار سو ایکڑ زمین کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے جو ریلوے سٹیشن سے زیادہ دور نہیں ہے لاہور کے سٹیشن سے ہر نصف گھنٹے کے بعد ایک ریل کار جلو کو روانہ ہوتی ہے جو تقریباً نصف گھنٹے کے بعد منزل پر پہنچ جاتی ہے یہاں سے پکی اینٹوں کی ایک سڑک سیدھی پارک کے بڑے دروازے تک جاتی ہے اگر ریل گاڑی کی بجائے سڑک کے راستے

اس پارک کی طرف چلیں تو یہ فاصلہ تقریباً سترہ میل ہے لاہور واہگہ روڈ یا جی روڈ پر جاتے ہوئے باٹاپور سے آگے مشہور نہر بی آر بی سے آگے دائیں طرف جلو موڑ کے بڑے بازار سے گذر کر ایک کچی سڑک جلو سٹیشن کے پھاٹک کو پار کر کے پکی اینٹوں کی مذکورہ سڑک پر پہنچ جاتے ہیں اس تفریحی پارک میں حکومت نے 1978ء میں سیر و تفریح کے لیے آنے والوں کی خاطر بعض تفریحی سہولتوں کا انتظام کیا جن میں سے ایک پارک ایک چڑیا گھر اور نہ جھیل شامل ہیں۔

بڑے دروازے سے داخل ہوتے ہی چند گز کے فاصلے پر بائیں طرف گھاس کے سبز قطعوں میں ایک پارک ہے جس کے درمیان ایک خوبصورت پکی سڑک فوارے تک جاتی ہے درمیانی کیاریوں کے ساتھ ساتھ مناسب جگہوں پر خوب صورت پھول دار پودوں سے گھاس کے قطعوں کی خوبصورتی اور بھی بڑھ گئی ہے یہ جگہ کنبوں اور دوستوں کی پارٹیوں کے پکنک منانے کے لیے بہت مناسب ہے اس بڑے پارک کے ایک طرف کونے میں ایک چھوٹا سا بچوں کا پارک ہے جس میں بچوں کی دلچسپی کی چیزیں مثلاً جھولے وغیرہ موجود ہیں پارک کے اردگرد خوبصورت درخت اور جھاڑیاں ہیں۔

اس جگہ ایک کیفے ٹیریا بھی ہے جہاں کھانے پینے کی چیزیں میسر ہیں یہاں ایک چھوٹا سا عجائب گھر اور ایک گفٹ شاپ بھی ہے جہاں پاکستان کی لکڑی کی یعنی نادر و نایاب اشیاء ملتی ہیں ایک مچھلی گھر اور حنوط شدہ جانوروں کے لیے ایک میوزیم بھی قائم ہے۔

گھاس کے قطعوں کے بالکل سامنے ایک چھوٹا سا چڑیا گھر ہے جو اس پارک کا ایک ضروری حصہ ہے اس چڑیا گھر میں پاکستان کے کچھ پرندے اور جانور رکھے گئے ہیں ان میں بعض جانور اور پرندے غیر ممالک نے تحفتاً خصوصاً اس پارک کے لیے دیئے ہیں جو بچوں کے لیے خاص طور پر دلچسپی کا باعث ہیں جانوروں میں دو کوہانوں والا اونٹ طرح طرح کے ہرن کوریا کے تیتر اور آبی پرندے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس پارک کا ایک اور ضروری مرکز مغرب کی طرف تقریباً ایک میل کے فاصلے پر واقع شاداب پارک ہے یہ ایک مصنوعی جھیل ہے اس کے گردونواح طرح طرح کے پھولدار پودے گھاس کے قطعے اور میدان ہیں اس جھیل میں کشتیاں آنے والے کے لیے دلچسپی کا ذریعہ ہیں یہاں بھی بچوں کے لیے کھیلوں کی کچھ سہولتیں موجود ہیں۔

پارک میں دو شعبے نباتات سے اور تین حیوانات سے تعلق رکھتے ہیں نباتات سے تعلق رکھنے

والے شعبے کی دو شاخیں ہیں ایک شاخ درختوں کی تحقیق سے متعلق ہے یہ تفریح کے ساتھ ساتھ تعلیم کی حامل بھی ہے دوسری شاخ پارک اس حصے سے وابستہ ہے جو صرف تفریحی کردار کا عکاس ہے اس میں گھاس کے پلاٹ، روشیں، سایہ دار چھتریوں کے نیچے نشستیں تالاب وفوارہ گلاب کے تختے مشروب وتحائف کی دکانیں جھیل کشتی رانی جنگلات وشکار کے متعلق ایک عجائب گھر بچوں کے لیے پنگھوڑے جھولے وسلائیڈ وغیرہ شامل ہیں۔

حیوانات سے تعلق رکھنے والے شعبے کی تین شاخیں ہیں ایک شاخ پارک سے: ملک ہے جس میں زیادہ تر جانور مشاہدے اور تفریح کے لیے یہاں لاکر رکھے گئے ہیں جہاں تک ممکن ہے ان کی افزائش بھی اس پارک کے اندر ہوتی ہے۔کوشش کی گئی ہے کہ بڑے بڑے جالی دار پنجروں میں انہیں اس طرح رکھا جائے کہ قدرتی ماحول مہیا ہو سکے۔

پرندوں کی کافی اقسام تدریس اور تفریح کے لیے پارک میں موجود ہیں۔مختلف اقسام کے آبی پرندے منیا بھٹ، تیتر چکور تلور بلبل، جنگلی کونج، چینی مرغیاں کبوتر، فاختہ، تیتر اور سرخاب جیسے ضرب المثل پرندے یہاں موجود ہیں چنکارا ہرن کے بیس سے زائد بچے نسل کشی کے لیے لائے گئے ہیں پارک میں نہایت خوبصورت مور کافی تعداد میں رکھے گئے ہیں ان کا رقص دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے بطخوں مرغابیوں اور مختلف اقسام کی مرغیوں نے انڈے دے رکھے ہیں جن سے ان کی افزائش نسل مطلوب ہے ان پرندوں میں کوریا کا چکور باعث دلچسپ ہے نر کے پر خوش نما اور رنگ دار ہوتے ہیں پولٹری کی طرح اس کی افزائش نسل ہے اور اس پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے حیوانات سے متعلق دوسرا شعبہ جانوروں اور پرندوں پر تحقیق اور افزائش سے متعلق ہے۔

پارک میں اسلحہ، کتے، سکوٹر، موٹر سائیکلیں لے جانا، پنجروں اور جانوروں کو چھیڑنا انہیں کھانے کی اشیا دینا پھول توڑنا گندگی پھیلانا اور راستوں کے علاوہ پھرنا سخت منع ہے۔ کیونکہ یہ خطرناک اور غیر قانونی ہے مختصر طور پر یہ سمجھ لیجئے کہ جلو کا یہ تفریحی پارک ممکن حد تک عام شہریوں کے لیے خاص دلچسپی اور توجہ کا باعث ہے اور عام لوگوں کی مدد سے اور مشوروں سے اس کو اور بھی بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

○

علامہ اقبال انٹرنیشنل ایئرپورٹ، لاہور

لاہور تاریخی روایات کا حامل اور زندگی سے بھرپور ایک شہر ہے سیاح اور وزیٹرز کئی صدیوں سے اس شہر کے پرکشش مقامات سے لطف اندوز ہوتے چلے آرہے ہیں اور اس کی ثقافتی اور لازوال حسن مع آرٹ، آرکیٹیکچر، میوزک، سیاست، اور تعلیمی سرگرمیاں بھی اپنی مثال آپ ہیں اس شہر کو جسے پاکستان کا دل بھی کہا جاتا ہے میں آنے والا کوئی بھی شخص اس کے مغلیہ گوتھک اور وکٹورین آرکیٹیکچر کی منفرد خوبصورتی کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اپنے وسیع اور موثر ورثے کے ساتھ لاہور ملک کی سیاحت اور تجارت کے فروغ میں بھی اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ پاکستان کے دوسرے بڑے شہر کی حیثیت سے یہ سیاحت، صنعت و حرفت اور تجارت کے لیے ملک کے شمالی علاقوں کے لیے فلکرم کے طور پر خدمات انجام دے رہا ہے اب لاہور صنعتی ترقی کے تناظر میں شہروں کے مقابلے میں بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ اسلام آباد لاہور موٹروے کی تعمیر کے بعد یہ مزید قابل رسائی ہو چکا ہے اور ملک کے تمام حصوں کے لیے مختلف اشیاء کی فراہمی میں بنیادی کردار ادا کر رہا ہے۔

رسائی کی اس نئی شکل اور اقتصادی ترقی کے لیے مدومعاون ہونے کے نتیجے میں لاہور ایوی ایشن کے شعبہ میں ایک علاقائی مرکز کا درجہ تیزی سے حاصل کر رہا ہے اب جبکہ شہر کے نئے ایئرپورٹ ٹرمینل کمپلیکس اور اس کی ضروری سہولتوں کی تعمیر مکمل ہو چکی ہے لاہور ایک بڑی سطح پر نئی صدی میں ملک کے فضائی ٹرانسپورٹیشن سیکٹر سے نمٹنے کے لیے پوری طرح تیار ہے۔

لاہور کے لیے کمرشل ایئرلائن آپریشنز کے ابتدائی دور سے اب تک جیسا کہ ضروری خیال کیا گیا ایک بڑی تعداد میں تبدیلیاں ایئرپورٹ بلڈنگ کے ڈیزائن اور تعمیر میں وقتاً فوقتاً عمل میں لائی گئیں۔ ہمارے خطے میں ایوی ایشن سیکٹر میں گذشتہ دہائیوں کے دوران تیزی سے ترقی دیکھنے میں آئی ہے جو ٹریفک میں قابل قدر توسیع پر منتج ہوتی ہے۔ موجودہ سہولتوں پر بڑھتی ہوئی طلب

سے نمٹنے کے لیے یہ سوچا گیا کہ لاہور انٹرنیشنل ایئرپورٹ سے متعلق تمام تر ایوی ایشن سروسز میں مناسب توسیع وترقی کی جائے۔

یہ بات درست تسلیم کی گئی ہے کہ جدید دور میں صرف ایک اہم ایئرپورٹ بحفاظت ایئر کرافٹ کے ٹیک آف اور لینڈنگ کے لیے ضروری ہے اب تمام جدید ایئرپورٹس کو بنیادی کسٹمر جنہیں ایئر ٹریولر کہا جاتا ہے ہر طرح سے ان کے بھرپور اطمینان کے لیے ان کی خدمات کے مقاصد کے تحت ڈیزائن اور تعمیر کیا گیا ہے لہٰذا آمدنی کے مسائل صرف طیاروں کی لینڈنگ اور پارکنگ کے اخراجات کے لیے رکاوٹ نہیں بنیں گے نئے پس منظر میں آمدنی کے حصول کے لیے تمام تر دستیاب تجارتی مواقع استعمال کیے گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب پوری دنیا میں ایئر پورٹ ایک موثر تجارتی وینچرز کا کردار ادا کر رہا ہیں۔

پاکستان ایک مسابقتی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ دنیا کے ایک انتہائی اہم جغرافیائی مقام کی نمائندگی کرتا ہے یہ اہم بین الاقوامی فضائی روٹس کے نقطہ پر ہے اور برصغیر پاک وہند وسطی ایشیائی ریاستوں کا اور چین کے لیے گیٹ وے کی حیثیت رکھتا ہے پاکستان، یورپ اور مشرق بعید کے درمیان اہم روٹس پر ایک اہم مقام پر واقع ہے اور ہمالیہ کے جنوب میں قائم بین الاقوامی ٹریفک اے ٹی ایس روٹس پر کام کرنے والے ایئر ٹریفک کے رش سے نمٹنے بالخصوص یورپ، مشرق بعید اور قرب وجوار کے اندر مقامات کے لیے اہم انٹرفیسنگ فراہم کرتا ہے پاکستان، چین کے لیے ایئر روٹ اور وسطی ایشیائی ریاستوں کے لیے ایئر لنکس کا ایک مؤثر ترین ذریعہ ہے۔

بین الاقوامی ٹریفک کے لیے ایک ریجنل ایوی ایشن مرکز اور ملک کے شمالی اور جنوبی حصوں کے مابین ایئر کرافٹ کے نقل وحمل میں ایک زبردست اضافے کے طور پر لاہور انٹرنیشنل ایئرپورٹ کی شمولیت کے ساتھ سی اے اے نے فیصلہ کیا کہ موجودہ سینٹرل رن وے کے مشرقی فلینک پر ایک جدید ٹرمنل کمپلیکس تعمیر کیا جائے جبکہ لاہور انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر مسافروں کا موجودہ سالانہ ٹرن اوور 2.5 ملین سے زائد ہے۔ 10.32 ارب روپے کی لاگت سے نئے کمپلیکس کی تعمیر 2015ء تک 6.5 ملین مسافروں کا بڑھتا ہوا بوجھ اٹھانے کے لیے پوری طرح اہل ہوگی۔

علامہ اقبال انٹرنیشنل ایئرپورٹ ٹرمنیل کمپلیکس کے افتتاح کے ساتھ سی اے اے اس پوزیشن میں ہے کہ لاہور آنے والے اور جانے والے مسافروں کو ایک جدید ترین ایئرپورٹ کمپلیکس کی مکمل سہولیات اور آرام فراہم کر سکے۔

ٹرمینل بلڈنگ لاہور کے شاندار تعمیراتی ورثے کی روایات کو مدنظر رکھ کر ڈیزائن کی گئی ہے تاکہ یہ مقامی ثقافتی لینڈ اسکیپ کے ساتھ آسانی سے ہم آہنگ ہو سکے۔

عمارت لاہور کے عظیم مغلیہ طرز تعمیر کی آئینہ دار اور روایتی خطوط کے ساتھ ایک منفرد تعمیر کے ادغام اور انتہائی جدید ترین سہولتوں سے مزین ہے نئی ٹرمینل بلڈنگ ٹو لیول لائز پر 71000 مربع میٹر کے رقبہ پر تعمیر کی گئی ہے یہ پراجیکٹ سالانہ 6.6 ملین مسافروں سے زائد افرادی سفری ضروریات کو مدنظر رکھ کر ڈیزائن کیا گیا ہے اس میں دیگر سہولتیں مثلاً بینکس، ریسٹورنٹس، اور ڈیوٹی فری شاپس کے ساتھ 7 بورڈنگ برجز، 55 چیک ان کاؤنٹر، 5 بیگیج ری کلیم بیلٹس اور ٹرانزٹ لاؤنج وغیرہ شامل ہیں۔

سی اے اے کی خواہش تھی کہ ائیر پورٹ ورلڈ کلاس منی سٹی کی حیثیت سے فروغ پائے جہاں ضروری سہولتیں اور انفراسٹرکچر مثلاً ہوٹل، موٹل، ڈیوٹی فری شاپ، فلائٹ کچن، شاپنگ مال، ٹریڈ بزنس سینٹر، لیزر سینٹر، آفس کمپلیکس، بینک، ریسٹورنٹس، ویئر ہاؤس کولڈ اسٹوریج، فیول / سی این جی اسٹیشن اور آٹو ریٹنل وغیرہ دستیاب ہوں تاہم مستقبل میں اس مقصد کے لیے سول ایوی ایشن اتھارٹی نے نئی ٹرمینل بلڈنگ سے ملحق تقریباً 180 ایکڑ کھلی اراضی مختص کر دی ہے اور مالی طور پر مستحکم انویسٹرز اور کاروباری طبقے یقیناً اس موقع سے فائدہ اٹھائیں گے۔ سی اے اے کی پیش کش سے توقع ہے کہ انویسٹرز اور ڈیولپرز آمدنی کے حصول میں اضافے کے لیے ان مواقع سے ضرور مستفید ہوں گے جو کہ یہ ائیر پورٹ کمپلیکس پیش کر رہا ہے۔

علامہ اقبال انٹرنیشنل ائیر پورٹ پاکستان کے انتہائی مشرق میں بھارت کے ساتھ ملنے والی بین الاقوامی سرحد سے چند کلومیٹر دور موجودہ ائیر پورٹ کے پچھلی جانب بنایا گیا ہے۔ اس کی تعمیر پر زیادہ رقم حکومت جاپان نے فراہم کی ہے ائیر پورٹ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ نقشہ اور ڈیزائنگ پاکستانی ماہرین کی ہے لیکن یہ منصوبہ بندی غیر ملکی ماہرین نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے اس ائیر پورٹ پر سالانہ پچاس لاکھ مسافروں کے سفر کی گنجائش ہے۔

○

واہگہ بارڈر، لاہور

پاکستان کے تین شہروں میں پاک بھارت سرحد پر دونوں ممالک کی مشترکہ چیک پوسٹ قائم ہیں۔ان میں واہگہ بارڈر لاہور، گنڈاسنگھ والا قصور اور ہیڈ سلیمانکی ضلع اوکاڑہ کی چیک پوسٹ شامل ہیں۔ان تینوں چیک پوسٹ کا تعلق پنجاب کے اضلاع سے ہے۔یہاں سال کے 365دن روزانہ قومی پرچم لہرانے اور اتارنے کی تقریب ضرور ہوتی ہے آندھی ہو یا طوفان کسی بھی حالت میں قومی پرچم لہرانے کی تقریب ملتوی نہیں کی جاتی۔1965ء اور 1971ء کی جنگوں کے دوران بھی ان پوسٹوں پر قومی پرچم ضرور لہرایا جاتا تھا قومی پرچم لہرانے اور اتارنے کی تقریب کے وقت کا تعلق سورج طلوع اور غروب ہونے سے ہوتا ہے صبح سورج کی پہلی روشنی کے ساتھ ہی پرچم لہرادیا جاتا ہے اور شام کو غروب آفتاب سے قبل پرچم اتارنے کی تقریب مکمل کرلی جاتی ہے پرچم لہرانے کی تقریب صبح سویرے ہونے کی وجہ سے اس میں عوام کی شرکت نہیں ہوتی تاہم پرچم اتارنے کی تقریب میں لوگوں کی بہت بڑی تعداد شرکت کرتی ہے۔23مارچ،14اگست،اور 6 ستمبر کے اہم دنوں میں لوگ پرچم لہرانے کی تقریب میں بھی شرکت کرتے ہیں قیام پاکستان کے بعد قائداعظم نے ''ہوم گارڈز'' کے نام سے نئی فورس بنائی تھی۔اسے قائداعظم گارڈ بھی کہا جاتا تھا۔1959ء اس فورس کو رینجرز کا نام دے دیا گیا۔اس وقت سے رینجرز پرچم کشائی کی تقریب کا انعقاد کر رہی ہے۔

پاکستان رینجرز کے جوان سیاہ ملیشیا شلوار قمیض پر مشتمل وردی میں بڑے ہشاش بشاش نظر آتے ہیں۔ان کے سروں پر کالے رنگ کی پگڑیاں ہوتی ہیں۔ان کی قیادت کرنے والے دو گارڈز نے سفید رنگ کی بیلٹ پہن رکھی ہوتی ہے اور ان کی بغل میں خوبصورت چھڑیاں بھی نظر آرہی ہیں۔ان کے بوٹوں کی ایڑیوں کے نیچے لوہے کی خاص قسم کی بنی ہوئی پتریاں لگی ہوئی ہیں۔ جب گارڈز پریڈ کو دوران پاؤں اٹھا کر زمین پر مارتے ہیں تو ان کی گونج سے دھرتی ہلتی ہوئی محسوس

ہوتی ہے ان گارڈز کی باڈی لینگویج ایسی ہوتی ہے کہ پریڈ دیکھنے والے کئی افراد فرط جذبات سے سیٹوں سے کھڑے ہو کر نعرے لگانا شروع کر دیتے ہیں کئی پاکستان خواتین اور لڑکیوں کی آنکھوں میں آنسو چھلک پڑتے ہیں بعض بوڑھی خواتین پاکستانی گارڈز کو مسلسل دعائیں دے رہی ہوتی ہیں پاکستان رینجرز جو گارڈز لاہور کے واہگہ بارڈر پر جھنڈا لہرانے اور اتارنے کی تقریب میں حصہ لیتے ہیں ان میں سے اکثر قد ساڑھے چھ فٹ سے زاہد ہیں ان کے مقابلے میں بھارت کی سرحد فورس کے جو اہل اکار اپنی سرحد کے اندر رہتے ہوئے پریڈ کرتے ہیں ان میں سے اکثر کے قد پاکستانی گارڈز سے چھوٹے ہیں۔

دونوں اطراف قومی پرچم اتارنے کی تقریب. کے دوران ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب طرفین کے تماشائیوں میں تالیاں بجانے اور نعرے لگانے کا مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ تالیوں اور نعروں کی گونج کے دوران شہریوں کو اپنے جسم میں ایک کرنٹ سا دوڑتا محسوس ہوتا ہے۔ لوگ بار بار اپنی کرسیوں سے کھڑے ہو کر پر جوش نعرے لگانا شروع کر دیتے ہیں۔ دونوں ملکوں کی سرحدوں پر پریڈ کے ایام اور اوقات میں ملک کے معروف گلوکاروں کی آواز میں گائے ہوئے قومی اور ملی نغمات فضا میں ایک عجیب سی دھن بکھیر رہے ہوتے ہیں جس کی خوش کن تال اور گونج دور تک سنائی دیتی اور کانوں میں رس گھولتی ہے دونوں جانب ایک بڑی تعداد میں غیر ملکی خواتین و حضرات بھی اس والہانہ تقریب کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں اور ان لمحات کو اپنے کیمروں میں سہانی یادوں کے طور پر محفوظ کر لیتے ہیں۔

تحریر: اعجاز احمد بٹ

○

چھانگا مانگا

اٹھارویں صدی کے وسط میں انگریزوں نے پنجاب میں لاہور سے ستر کلومیٹر کے فاصلے پر کراچی جانے والی ریلوے لائن کے ساتھ ایک جنگل لگایا۔ جس سے ریل کے ڈبے اور ریلوے لائن کے سیپلر بنانا اور کوئلہ حاصل کرنا مقصود تھا۔ اس جنگل کا نام دو ڈاکوؤں کے نام سے مشہور ہے چھانگا مانگا، دونوں سگے بھائی تھے اور اس جنگل میں رہتے تھے۔

یہ جنگل دنیا کے اتنے وسیع وعریض رقبے پر انسانی ہاتھ کے لگائے ہوئے جنگلوں میں سے ایک ہے یہ 1866ء میں لگانا شروع کیا گیا اور اس کا کل رقبہ 12510 ایکڑ ہے۔

چھانگا مانگا جنگل کا موسم لاہور کے نزدیک ہونے کی وجہ سے لاہور کے موسم سے بہت ملتا جلتا ہے مگر گرمیوں میں یہاں دوپہر کو مرطوبیت بہت زیادہ ہوتی ہے اور شام کافی خوشگوار۔ گرمیوں میں اوسطاً درجہ حرارت 240 اور سردیوں میں 10 سینٹی گریڈ تک جا پہنچتا ہے اور بارش سالانہ تقریباً 400 ملی میٹر ہوتی ہے یہاں پورے ذخیرہ کو بہترین طریقے پر منظم کرنے کے لیے اس چھوٹے چھوٹے مختلف کمپارٹمننس میں تقسیم کیا گیا ہے جن کی تعداد 232 ہے اور اوسطاً ہر ایک رقبہ قریباً 150 ایکڑ پر مشتمل ہے۔

ہر سال قریباً 6000 اونس ریشم کے کیڑوں کا بیج فروری سے اپریل تک پالا جاتا ہے جس کا انحصار توت کے پتوں پر ہوتا ہے اور وہ جنگل سے مہیا کیے جاتے ہیں۔ اور حیران کن بات یہ ہے کہ 6 یا 7 ہفتوں میں تقریباً 11/2 کروڑ روپے کا ریشم فیکٹریوں کو سپلائی کیا جاتا ہے توت کے پتوں کی بڑھتی ہوئی مانگ کے پیش نظر لاہور سرکل میں ایک سکیم بھی جاری ہے۔

آج جبکہ مشینی دور میں آؤٹ ڈور تفریح کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے کیونکہ آج کل ایک تو ہر شخص کی زندگی نہایت مصروف اور تیز تر ہوگئی ہے اور انواع واقسام کی پریشانیاں

بڑھ گئی ہیں اپنے آپ کو صحت مند اور دماغ کو تر و تازہ رکھنے کے لیے ہر ایک کو گھر سے باہر تفریح کے لیے نکلنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔

چھانگا مانگا لاہور کے نزدیک اور برلب پکی سڑک ہونے کی وجہ سے تفریح کی غرض کے لیے آنے والے سیاحوں میں بہت زیادہ مقبولیت رکھتا ہے یہاں کے سبزہ زار، صحت مند سرسبز درخت حسین نظارے اور سب سے بڑھ کر آلودگی سے پاک اور پرسکون ماحول سیاحوں کے لیے انتہائی دلکشی رکھتا ہے۔

اس جنگل میں شیشم، شہتوت، بکائن، پھلاہی، پاپلر، سمبل اور سفیدے کے درختوں کی تعداد زیادہ ہے یہاں کی شیشم پورے پاکستان میں مشہور ہیں اس کی لکڑی بہت مضبوط اور قیمتی ہوتی ہے شہتوت کی لکڑی سیالکوٹ بھیجی جاتی ہے جس سے کھیلوں کا سامان تیار ہوتا ہے۔ پاپلر اور سمبل سے دیا سلائی، پلائی وڈ اور کاغذ تیار ہوتا ہے سمبل کے درخت سے روئی بھی حاصل ہوتی ہے جو تکیئے گولے اور صوفے سیٹ وغیرہ بنانے کے کام آتی ہے شہتوت کے پتے ریشم کے کیڑے پالنے اور اس کی شاخیں ٹوکریاں بنانے کے کام آتی ہیں۔ محکمہ جنگلات گھاس ایندھن شہتوت کے پتوں اور چھڑیوں کے پرمٹ جاری کرتا ہے اس جنگل سے شہد کے ٹھیکے، تفریحی مقامات کے ٹھیکے اور لکڑی سے سالانہ کروڑوں روپے سے زائد کی آمدن ہوتی ہے۔

چھانگا مانگا جنگل میں حکومت نے مختلف سکیمیں شروع کی ہیں سیر یکلچر ڈیپارٹمنٹ نے جاپانی شہتوت لگائے ہیں یہ ریشم کے کیڑے پالنے کے لیے پتے حاصل کرنے کا منصوبہ ہے یہ جاپانی شہتوت موسم بہار میں بہت جلد پھل دینا شروع کر دیتے ہیں علاوہ ازیں یہاں پر بانس بھی بغرض تحقیق کاشت کیا گیا ہے یہاں پاپلر ورکنگ سرکل کے تحت وسیع پیمانے پر پاپلر کی کاشت کی گئی ہے اس وقت تقریباً دو ایکڑ پر بیڑی پتا موجود ہے کچھ رقبہ پر السی اور سونف بھی کاشت کی گئی ہے۔ یہاں تقریباً تمام قسم کے درختوں کی نرسری لگائی گئی ہے جہاں سے لوگوں کو کم قیمت پر قلمیں اور پودے فراہم کیے جاتے ہیں۔

جنگل کا کل رقبہ بارہ ہزار پانچ سو دس ایکڑ پر مشتمل ہے ایک سال کے دوران تقریباً پانچ، چھ سو ایکڑ درختوں کی کٹائی کی جاتی ہے کٹائی کے بعد لکڑی کو ڈپو میں لایا جاتا ہے۔ تقریباً بیس سال کے بعد پہلے حصے پر دوبارہ کٹائی کی باری آتی ہے کٹائی والا رقبہ خالی ہونے کے بعد اس پر دوبارہ

پودے لگا دیئے جاتے ہیں پہلے پہل جب پودے لگائے جاتے ہیں تو ان کا درمیانی فاصلہ بہت کم رکھا جاتا ہے پھر ہر پانچ سال کے بعد اس میں ناکارہ اور کمزور درختوں کو کاٹ کر ان کا درمیانی فاصلہ بڑھایا جاتا ہے۔ یہ سارا کام ایک باقاعدہ منصوبہ کے تحت جاری رہتا ہے۔

لکڑی کو خشک کرنے کے لیے یہاں ایک پلانٹ نصب کیا گیا ہے جہاں لکڑی کو ایک خاص درجہ تک حرارت دے کر پکایا جاتا ہے پھر اس لکڑی میں کوئی دراڑ وغیرہ نہیں بن سکتی۔ اسے سیزن کرنا کہتے ہیں اور اس طرح لکڑی بہت مضبوط ہو جاتی ہے ہر ماہ کی یکم اور پندرہ تاریخ کو لکڑی کی نیلامی ہوتی ہے۔

انتظامی لحاظ سے جنگل کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جنہیں بلاک کا نام دیا گیا ہے ہر بلاک کا انچارج فارسٹر بلاک افسر ہوتا ہے اور اس کے ساتھ کوئی چار یا پانچ فاریسٹ گارڈ ہوتے ہیں۔ درختوں کو لگانے، کانٹ چھانٹ کرنے اور پانی دینے کے لیے بیلدار ہوتے ہیں ان سب کی رہائش کے لیے ہر بلاک میں کالونیاں ہوتی ہیں ڈی ایف او صاحب کے دفتر کے عملہ کے لیے ایک الگ کالونی ہے۔ ملازمین کے لیے ایک فاریسٹ ڈسپنسری بھی موجود ہے۔

چھانگا مانگا کا جنگل نہ صرف لکڑی کی فراہمی کا ایک بہترین ذریعہ ہے بلکہ یہ ایک بہترین سیرگاہ کی حیثیت سے پورے ملک میں بے پناہ شہرت کا حامل ہے مہتابی جھیل اور پارک اس کی اصل وجہ شہرت ہیں ہر سال لاکھوں کی تعداد میں یہاں لوگ سیر کرنے آتے ہیں جن میں غیر ملکی سیاح بھی ہوتے ہیں جنگل میں سیاحوں کے لیے موٹل اور ریسٹ ہاؤسز بھی موجود ہے فورسٹار ہوٹل کے برابر فاریسٹ لاج بھی بنایا گیا ہے فاریسٹ لاج کے نزدیک کوئی آبادی نہیں یہاں خالصتاً جنگل کا ماحول پیدا کیا گیا ہے۔

فاریسٹ لاج سے ملحقہ کھیلنے کے لیے گراؤنڈ، سرسبز و شاداب پھولوں کی کیاریاں لمحات کو پرسکون اور خوشگوار بناتی ہیں ہوٹل اور ریسٹ ہاؤسز کے اردگرد بھی گھاس کے خوبصورت پلاٹ کثرت سے ہیں۔

اس جنگل کے درمیان سے ایک نہر گزرتی ہے جسے ''مین برانچ لوئر'' کہتے ہیں جنگل کو بھی اسی نہر کا پانی سیراب کرتا ہے اسی نہر کے کنارے 1962ء میں ایک مہتابی جھیل بنائی گئی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے جھیل کی شکل چاند جیسی بنائی گئی ہے اس نہر کا پانی جھیل میں ڈالا جاتا ہے لیکن ہنگامی

صورتحال کے لیے ایک ٹیوب ویل بھی لگایا گیا ہے جھیل کی سیر کرنے والوں کے لیے دو چیزیں از حد دلچسپی کا باعث ہیں ایک تو جھیل پر جھولا نما پل اور دوسرا جھیل کے درمیان پانی میں کھڑا دومنزلہ مہتاب محل، کناروں پر سدابہار درخت ہیں جن کی شاخیں جھک کر جھیل کے پانی کو چھوتی ہیں اور حسین منظر پیش کرتی ہیں جھیل کے سبزی مائل پانی پر تیرتی ہوئی سفید بطخیں اور بھلی لگتی ہیں جھیل میں چپو اور موٹر والی کشتیاں سیاحوں کے لیے مزید تفریح مہیا کرتی ہیں جھیل کے پاس کار پارکنگ اور چائے خانے، بچوں کے کھیلنے کے لیے جھولے بھی موجود ہیں جھیل کے پاس ایک خوبصورت مسجد بھی بنائی گئی ہے چھ سات کے قریب لاگ ہٹ بھی تعمیر کیے گئے ہیں چھوٹی ٹرام (ریل گاڑی) جنگل کی سیر میں مددگار ثابت ہوتی ہے سڑک کے کنارے نہر اور ٹرام لائن کے ساتھ ساتھ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے سفیدے اور پاپلر کے درخت ایک سیدھ میں کھڑے سیر کرنے والوں کا استقبال کرتے ہیں جھیل کے کنارے ایک خوبصورت تیراکی کا تالاب بھی ہے۔

محکمہ تحفظ جنگلی حیات نے بھی جنگل کو خوبصورت بنانے میں بھرپور حصہ لیا ہے جھیل کے قریب ٹرام لائن کے ساتھ ایک مرکز نسل کشی بنایا گیا ہے جس میں ہرن، نیل گائے، چنکارہ، اڑیال، پاڑہ، ہرن وغیرہ موجود ہیں۔ انہیں بالکل جنگلی ماحول فراہم کیا گیا ہے مرکز نسل کشی تقریباً 15 ایکڑ رقبے پر محیط ہے محکمہ تحفظ جنگلی حیات نے تقریباً دوسو کے قریب فیزنٹ (جنگلی مرغ) پال کر جنگل میں آزاد کیے تا کہ پاکستان میں فیزنٹ کی نسل کو بڑھایا جا سکے اس وقت جنگل میں ایک اندازے کے مطابق چودہ یا پندرہ نیل گائے موجود ہیں علاوہ ازیں خوگوش، تیتر، تلیئر اور بٹیر وغیرہ بھی پائے جاتے ہیں تلیئر مارچ اپریل میں ایشیائے کوچک سے چھانگا مانگا آتے ہیں یہ مہمان پرندے ہیں کافی تعداد میں مور بھی موجود ہیں یہاں دو تین قسم کے باز بھی پائے جاتے ہیں۔ 1975-76 کے سیلاب کی وجہ سے بہت بڑی تعداد میں جنگلی سؤر بھارت سے پاکستان میں داخل ہوئے اور اس جنگل کو اپنی پناہ گاہ بنالیا یہ جنگل میں ٹولیوں کی شکل میں پھرتے نظر آتے ہیں اور اردگرد کی فصلوں کو بہت نقصان پہنچاتے ہیں ان سوروں کو تلف کرنے کے لیے محکمہ تحفظ جنگلی حیات اور محکمہ زراعت پنجاب کو اپنی کاروائیاں جلد از جلد عمل میں لانی چاہئیں۔

ملک میں سوئی گیس کی فراہمی سے قبل چھانگا مانگا ایندھن کی ضرورت پوری کرنے کا بڑا ذریعہ تھا 1960ء میں اس جنگل کو قومی پارک کا درجہ دے کر اسے سیاحوں کے لیے کھول دیا گیا اس

مقصد کے لیے یہاں کچھ تبدیلیاں اوراضافے بھی ہوئے۔

جنگل کے نام کی نسبت سے بتایا جاتا ہے کہ 18ویں صدی میں دو بھائی چھانگا مانگا اس جنگل میں رہتے تھے برطانوی حکومت انہیں ڈاکو قرار دیتی تھی تاہم عام لوگوں میں ان کی بہت قدر تھی وہ امیروں کولوٹ کر مال غریبوں میں تقسیم کر دیتے تھے وہ سامراجی حکومت کے خلاف کاروائیوں میں بھی شامل رہے مقامی لوگ انہیں ہیرو کی طرح خیال کرتے تھے یہی نہیں یہ لوگ ان کے متعلق لوک گیت بھی گاتے تھے کہتے ہیں کہ انہیں میں سے ایک بھائی نے غریبوں کے لیے ایک گاؤں بسایا تھا اوراس کا نام مانگا منڈی رکھا تھا۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ چھانگا مانگا کا کل رقبہ 39-12510 ایکڑ ہےاس میں رکھ شاہ اور موجو کی کا رقبہ 1671 ایکڑ ہے۔ 1921 میں یہاں منی ایچر ریل یا چھوٹی ٹرام چلائی گئی تھی۔اس کی پٹری 24انچ چوڑی ہے مستقل پٹری کی چوڑائی ساڑھے سولہ میل اور عارضی پٹری چار میل ہے اسے چلانے کے لیے ڈیزل اور بھاپ دونوں انجنوں سے چلایا جاتا ہے یہ 25بوگیاں کھینچ سکتے ہیں جن پر بیک وقت 35 ٹن لکڑی لادی جاسکتی ہے اس ریل کا مقصد لکڑی کی بار برداری تھا آج کل اسے سیاحوں کو جنگل کی سیر کرانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔جنگل کی خوبصورتی میں اضافہ کرنے والی مہتابی جھیل تقریباً70 ستر سال کے لیے بنائی گئی تھی چھانگا مانگا میں سالانہ ایک لاکھ سے زائد ملکی وغیر ملکی سیاح یہاں آتے ہیں۔جنگل کی سیر کے دوران ایک چیز جو خاص طور پر محسوس کی جاسکتی ہے کہ یہاں لکڑی کا بے انتہا استعمال کیا گیا ہے پکی،عمارتیں،شلسٹرز اور دیگر اشیاءلکڑی سے بنی ہیں جس سے جنگل کا حسن متاثر ہونے کے بجائے اس میں اضافہ ہوا ہے۔

بے پناہ آبادی، گاڑیوں کے دھوئیں، کارخانوں کی زہر اگلتی چمنیوں نے فضائی ماحول کو بہت آلودہ کر دیا ہے جس سے کرہ ارض کے گرد لپٹی ہوئی جھلی (اوزون) میں سوراخ ہو گئے ہیں یہ انسانی جسم کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے اس فضائی جھلی سے سورج کی کرنیں چھن کر آتی ہیں اگر سورج کی کرنیں براہ راست انسان پر پڑیں تو کینسر جیسی موذی بیماری کا خطرہ بڑھ جاتا ہے پوری دنیا فضائی جھلی کے سوراخوں کو پر کرنے کی فکر میں ہے جس کا حل صرف صاف ستھرہ ماحول ہے ہمیں چاہیے کہ ماحول کو صاف ستھرہ رکھیں زیادہ سے زیادہ سبزہ زار درخت لگائیں کسی بھی ملک کا 26فی صد رقبہ جنگلات پر مشتمل ہونا بے حد ضروری ہے جبکہ پاکستان میں اس وقت صرف پانچ فیصد رقبہ

پر جنگلات ہیں درخت دفاع میں بھی خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔اور جنگلی حیات کو بھی تحفظ ملتا ہے پاکستان کے ہر فرد کو کم از کم ایک سال میں ایک درخت ضرور لگانا چاہیے درخت لگانے سے درخت کی حفاظت کرنا زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

چھانگا مانگا کا اعلان بطور ریزرو جنگل بذریعہ نوٹیفیکشن نمبر 115 مورخہ 6 مارچ 1979 زیر دفعہ 34 ایکٹ جنگل 1878 میں عمل میں آیا۔نہری پانی کی سہولت مہیا ہونے کے بعد 1886 میں باقاعدہ نہری ذخیرہ بنانے کے پروگرام پر عمل شروع کیا گیا ہے 1886 تا 1888ء تک صرف شیشم لگائی گئی جس کا مقصد صرف ایندھن حاصل کرنا تھا۔

مقامی لوگ توت کے پتوں سے ہر سال تقریباً 2500 اونس ریشم کے کیڑوں کے انڈے پالتے ہیں جس سے تقریباً چار ہزار من خام ریشم حاصل ہوتا ہے۔

○

فاریسٹ پارک، گٹ والا (فیصل آباد)

فاریسٹ پارک گٹ والا شیخوپورہ روڈ فیصل آباد پر واقع ہے۔ جس کا فاصلہ فیصل آباد شہر سے تقریباً 17 کلومیٹر ہے۔ پارک کا کل رقبہ 131 ایکڑ پر مشتمل ہے۔ گٹ والا پارک میں 154 ایکڑ پر وسیع وعریض لان بنائے گئے ہیں جس میں بچوں کی تفریح کے لیے جھولے وغیرہ لگائے گئے ہیں۔ پارک میں بچوں کی دلچسپی کے لیے مختلف قسموں کے جنگلی جانور اور پرندے رکھے گئے ہیں۔ جنگلی جانوروں میں نیل گائے، کالا ہرن، چنکارہ ہرن، پاڑہ ہرن، مغلاں شیپ اور پرندوں میں کامن مور سفید مور، بلیک شولڈر وغیرہ ہیں۔ خاص طور پر بچوں کی تفریح کے لیے پارک ہیں ایک بندر گھر بھی بنایا گیا ہے۔ جن کی شرارتوں سے بچے اور بڑے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بچوں کی تفریح کے لیے پارک کے اندر ایک خوبصورت جھیل بنائی گئی ہے جس میں بچوں اور بڑوں کو سیر کروانے کے لیے کشتیوں کا انتظام کیا گیا ہے پارک کے درمیان میں سے ایک نہر گزرتی ہے جس میں گرمیوں کے موسم میں لوگ اس میں اکثر نہاتے ہیں۔ اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔

پارک میں ایک بہت ہی خوبصورت مگر مچھ فارم قائم کیا گیا ہے جو کہ پاکستان میں واحد مگر مچھ فارم ہے۔ جس میں مگر مچھوں کی افزائش نسل کامیابی کے ساتھ ہو رہی ہے۔ جو کہ لوگوں کی دلچسپی کا باعث ہے۔ پارک عوام کی تفریح، حیاتیاتی تحقیق و تعلیم کے لیے اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

گٹ والا پارک میں لوگوں کے خورد و نوش کے لیے تین کنٹین بنائی گئیں ہیں جن پر ہر وقت مشروبات کھانے کی اشیاء مل سکتی ہیں۔ شام کے وقت تفریح کرنے والے کے لیے پارک میں لائٹنگ کا بہترین انتظام کیا گیا ہے۔

○

گھنٹہ گھر، فیصل آباد

فیصل آباد نے بار کے جنگل سے ایک شہر بننے کا سفر بڑی تیزی سے طے کیا ہے پارچہ بافی، شکر سازی، بناسپتی گھی، صابن سازی اور خوردنی تیل کے کارخانے بڑی تعداد میں یہاں پائے جاتے ہیں فیصل آباد، آبادی کے اعتبار سے پاکستان کا تیرا بڑا شہر بن چکا ہے۔

اس شہر کی ایک نمایاں خصوصیت شہر کے آٹھ مرکزی بازاروں کے بیچ موجود گھنٹہ گھر ہے یہ گھنٹہ گھر کلاک چہار سمت ہے یہ گھنٹہ گھر، ملکہ وکٹوریہ کی یاد میں چناب کے باشندگاں نے 1903-05 کے عرصہ میں تعمیر کروایا اس گھنٹہ گھر کا سنگ بنیاد اس وقت کے گورنر پنجاب سر چارلس نے 14 نومبر 1903 کو رکھا جبکہ اس کا افتتاح 13 دسمبر 1905 کو مشیر خزانہ پنجاب سر لوئس ٹوپر نے کیا گھنٹہ گھر کے چاروں حصوں پر جلی حروف میں انگلش اور ہندی زبان میں اس کی مختصر تاریخ رقم ہے۔

اس کی تعمیر میں سرخ و سفید پتھر استعمال کیا گیا ہے اس ٹاور پر سفید پتھر کی زمین والے چار بڑے بڑے گھڑیال نصب ہیں جن پر رومن ہندسوں میں ایک تا بارہ تک اعداد درج ہیں۔ ان پر سیاہ رنگ کے پتھر سے ترشی ہوئی سوئیاں رینگتی رہتی ہیں ہندسوں اور سوئیوں کی جسامت اتنی ہے کہ ہر بازار کے خاتمہ پر باآسانی وقت دیکھا جا سکتا ہے۔

○

اسلام آباد: خطۂ پوٹھوہار

پاکستان کا دارالسلطنت ہے انتہائی پرفضاء اور جدید نہر ہے صدر محمد ایوب خان کے دور حکومت 1958ء میں اس نئے اور جدید شہر کا قیام عمل میں لایا گیا اقوام متحدہ کے سابق سیکرٹری جنرل اوتھانٹ نے اسے ایشیا کا برازیل کہا تھا۔ مارگلہ کی پہاڑیوں کے دامن میں آباد یہ شہر عظیم الشان ثقافتی طرز تعمیر کا مرکز ہے۔ یہاں پر موجود غیر ملکی سفارت خانوں کی عمارات ان کے اپنے اپنے طرز تعمیر کی علامت ہیں اور اس طرح یہاں پر عالمی سطح پر طرز تعمیر کے ثقافتی شاہکار کی امین عمارات موجود ہیں۔ فیصل مسجد اسلامی وثقافتی طرز کا بہترین نمونہ ہے یہاں پر دامن کوہ، راول ڈیم، اسلام آباد ائیر پورٹ، قائد اعظم یونیورسٹی اور انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی قابل دید مقامات میں شمار ہوتے ہیں۔

سی ڈی اے نرسری

اسلام آباد پارک ایریا روڈ پر واقع ہے یہ خوبصورت اور آرائشی پودوں کی سب سے بڑی نرسری ہے اور اس کا رقبہ 141652 مربع میٹر ہے اس میں مخصوص نوعیت کے 129 درخت ہیں اس نرسری میں انگلینڈ، یورپ، ایشیاء اور امریکہ سے منگوا کر ایسے پودے جمع کیئے گئے ہیں جو کم قامت اور بلند قامت، رنگارنگ جھاڑیوں، بیلوں، پھولوں اور سبزہ زاروں کی بے مثال سینکڑوں اقسام پر مشتمل ہیں اس میں چھ سو سے زائد گلاب کے پھولوں کی اقسام اپنی بہار دکھاتے ہیں یہ نرسری سالانہ دس لاکھ سے زیادہ پودوں کی آبیاری اور پیوند کاری کرتی ہے۔ سی ڈی اے کی یہ نرسری اسلام آباد کے لیے امتیاز وافتخار کا درجہ رکھتی ہے یہ پودوں کی شناخت اور دریافت کا ایک ذریعہ بھی ہے امید ہے کہ یہ پاکستان میں پھولوں کی سب سے بڑی نرسری بن جائے گی جیسا کہ یورپ کے بعض چھوٹے ممالک دنیا میں پھول برآمد کرنے والے ممالک بن گئے ہیں۔

اس پارک کا نقشہ جاپان کے ایک ماہر مسٹر ٹاباٹا نے بنایا ہے ارجنٹینا پارک .جی 6، پولی کلینک اور جنرل پوسٹ آفس کے درمیان ہے اس پارک کے خاموش نقوش سیاحوں کو دعوت نظارہ دے رہے ہیں۔ فوارے، چاروں طرف گھومنے والا روشنی کا مینارہ، چہل قدمی کے لیے روشیں، نشیبی باغیچہ اور ابھری ہوئی راھد اریاں اور خوبصورت سجے ہوئے درختوں کی قطار میں چاروں طرف داخلے کے لیے دروازے موجود ہیں۔ یہ پارک حکومت پاکستان اور حکومت ارجنٹائن کی باہمی دوستی کی یادگار ہے اس پارک کے درمیان یادگاری ستون اور اس پر کندہ عبارت دونوں ممالک کی خیر سگالی کے جذبے کا اظہار کرتی ہے۔

مغلیہ طرز کا باغ

پاکستان سیکرٹریٹ اور گورنمنٹ ہوسٹل کے اندرونی بیرونی باغوں کو مغلیہ طرز پر تعمیر کیا گیا ہے اونچے چنار کی قطاریں اور رواں شفاف نہریں جو فواروں سے سیراب ہوتی ہیں بڑا ہی حسین منظر پیش کرتی ہیں اسی میں مغلیہ طرز کے جدید انداز آرائش باغبانی کو شامل کیا گیا ہے اس طرح یہ سیاحوں کے لیے ایک دلکش نظارہ ہے۔

دامن کوہ

اسلام آباد کی یہ پر کشش جگہ مارگلہ پہاڑیوں کی بلند چوٹی کے راستے میں ہے اور محل وقوع کے لحاظ سے دامن کوہ کہلاتی ہے یہاں تک جانے کے لیے ایک کشادہ سڑک تعمیر کی گئی ہے تاکہ یہاں سے لوگ آسانی کے ساتھ مارگلہ کی چوٹی تک بلکہ اس سے آگے ''وادی غریبان'' تک پہنچ سکیں۔ شہر کے لیے ڈاکسیڈیس کے تیار کردہ خاکوں کی صراحت یوں کی جاتی ہے کہ اسلام آباد ایک ایسا شاندار شہر ہے جس میں شہر کے مرکز کو یکتائے زمانہ کہا جا سکے۔

خیابان اقبال کے اندرونی حصے ساتویں ایونیو سے چار کلومیٹر کے فاصلے پر دامن کوہ کے نام سے نظارہ گاہ بنائی گئی ہے سی ڈی اے نے سخت خاردار اور گنجان جھاڑیوں کو صاف کر کے یہاں کار پارکنگ کے لیے دو مقامات تیار کیئے ہیں یہاں تک پہنچنے کے لیے ہر موسم میں قابل استعمال سڑک بن چکی ہے جسے مزید توسیع دے کر پیر سوہاوا ٹورسٹ ہٹ تک پہنچا دیا گیا ہے مختلف نشیبی علاقوں کی طرف پیدل چلنے والوں کے لیے راستے میں بھی بنائے گئے ہیں ان میں دو چبوترے جنوب

مغربی سمت میں جھجے کی طرح باہر نکلے ہوئے ہیں اس ویو پوائنٹ سے بیک نگاہ قائداعظم یونیورسٹی سے گرانڈ ٹرنک روڈ تک اس کے پیچھے گولڑہ کے ساتھ پورے دارالحکومت کا منظر دکھائی دیتا ہے یہاں ایک کینٹین بھی ہے پینے کا صاف پانی اور دوسری سہولتیں بھی یہاں بہم پہنچائی جا رہی ہیں بچوں کے لیے کھیل کود کے میدان بھی ہیں درحقیقت یہ اسلام آباد کی مقبول عام تفریح گاہ ہے۔

ہل ٹاپ ریسٹ ہاؤس

اس ریسٹ ہاؤس کو اسلام آباد کی کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی نے مکمل کیا ہے یہ روال جھیل کے جنوب میں ہے۔ جہاں سے راول جھیل کے مناظر بڑے ہی بھلے لگتے ہیں یہ ایک پرسکون جگہ بھی ہے۔ یہ ریسٹ ہاؤس اپنے حسین ماحول کی وجہ سے بڑا دیدہ زیب ہے جہاں جنگلی پرندے اور بعض جنگلی جانور بھی پائے جاتے ہیں اور بندروں کے غول اکثر نظر آتے ہیں۔ یہ ریسٹ ہاؤس پختہ سڑک کے عین درمیان واقع ہے اس ریسٹ ہاؤس سے عظیم جامع فیصل کے بلند مینار، راول ڈیم اور اسلام آباد کے علاوہ اگر رات کو ابر نہ ہو تو مری کی روشنیاں عجیب روح پرور نظارہ پیش کرتی ہیں۔

سہاوا ریسٹ ہاؤس

مارگلہ کی پہاڑیاں اسلام آباد کے محل وقوع پر حاوی نظر آتی ہیں شجرکاری کی مہم کو اس پہاڑی علاقے میں کامیاب کرنے کے یلیے یہاں جیپ کا راستہ تعمیر کیا گیا ہے یہ راستہ سیکٹر ایف 16 اور ایف 7 کے آخری شمالی کنارے سے نکل کر اوپر چڑھتا ہے یہاں ایک پہاڑی پکنک اسپاٹ بھی ہے جس میں ایک چھوٹا سا ریسٹ ہاؤس بھی شامل ہے جو یہاں سے 35 کلومیٹر کے فاصلے پر گھنے جنگل کے اندر ہے یہاں سے اسلام آباد اور روال جھیل کے خوشنما مناظر دکھائی دیتے ہیں اس کی اونچائی سطح سمندر سے تقریباً 1372 میٹر ہے سڑک پر آگے جا کر پیر سوھاوہ گلی کے مقام پر ایک اور ٹورریسٹ ہٹ تعمیر کی گئی ہے یہاں بھی سیاحوں کے لیے تمام سہولیات فراہم کی گئی ہیں۔

رٹا ہوٹر

مارگلہ کے زیریں علاقے میں اور نور پور سے کچھ فاصلے پر رٹا ہوٹر ایک قدیم گاؤں تھا یہاں

محکمۂ جنگلات نے ایک خوبصورت باغ تعمیر کروایا ہے اس باغ میں میٹھے پانی اور گندھک کے چشمے ہیں یہاں سیر وتفریح کے لیے روشیں اور ویو پوائنٹ بھی بنائے گئے ہیں باغ کے ایک حصے میں جنگلی پرندوں کا چڑیا گھر واقع ہے۔ جس میں مور، ہدہد، اور چکور وغیرہ مختلف اقسام کے پرندے رکھے گئے ہیں اور انہیں وہی فطری ماحول بھی فراہم کیا گیا ہے۔

گلستان فاطمہ

سیکٹر 6 میں ایک پارک محترمہ جناح کے نام پر بنایا گیا ہے جسے یہاں کا خوبصورت فوارہ ماحول کو سحر انگیز کر دیتا ہے۔

چڑیا گھر، مرغزار، مارگلہ کی چوٹیاں: پیر سہاوا روڈ مرغزار اور پیر کوہ جیسے بے حد حسین علاقوں تک جاتی ہے یہ تفریح گاہیں انتہائی اعلیٰ اور دلکش ہیں اور دنیا بھر کے سیاحوں کو دعوت نگاہ دیتی ہیں عالمی اسلامی کانفرنس کے بعد ان تفریح گاہوں میں کچھ اور خوبیوں کا اضافہ کیا گیا ہے ان میں مرغزار روڈ پر واقع دامن کوہ کی تفریح گاہ انتہائی مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔

اسلام آباد، کو سیاحت کا شہر کہنا بے جا نہ ہوگا چونکہ اس کے صرف ایک چڑیا گھر کو دیکھنے والوں کی تعداد کا یہ عالم ہے کہ وہاں روزانہ ہزاروں افراد محض تفریح کے لیے آتے ہیں اور جانوروں سے دل بہلاتے ہیں اور کچھ یہی حال دامن کوہ آنے والوں کا بھی ہے سی ڈی اے انتظامیہ کے تحت چڑیا گھر کی سیر کے لیے کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ اس چڑیا گھر میں تقریباً بارہ سو سے زائد اقسام کے جانور موجود ہیں ان میں چینی بطخیں، آسٹریلوی تاج والے کبوتر، شیرازی اور ولندیزی کبوتروں کے علاوہ دیسی پرندے بھی ہیں۔ سرخاب، عقاب، باز، شکرے اور الو بھی پرورش پا رہے ہیں بھانت بھانت کے جانور دنیا بھر کے ملکوں سے حاصل کئے گئے ہیں پرندوں اور چرندوں کے علاوہ ان میں درندے بھی لائے گئے ہیں اس چڑیا گھر کو سی ڈی اے کی جانب سے برابر توسیع دی جا رہی ہے اور فنی اعتبار سے اسے زیادہ سے زیادہ جاذب نگاہ بنانے کے علاوہ نیچرل سائنس کے مطابق بنانے کے لیے پاکستان سائنس فاؤنڈیشن کے تعاون سے نصف دائرہ نما میوزیم آف نیچرل سائنس تعمیر کیا گیا ہے اس میوزیم میں کراچی کے ساحل سے ملنے والا وہیل مچھلی کا ڈھانچہ اور ہاتھی کا ڈھانچہ رکھا گیا ہے یہاں سیاحوں کے لیے مرغزار تک آنے جانے کے لیے راولپنڈی صدر سے بس سروس کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ اسلام آباد کی سڑکیں اور تمام علاقے

ہریالی اور شادابی کا منہ بولتا شاہکار ہیں پہاڑوں کے آس پاس اوپر نیچے یہ بل کھاتی اور لہراتی ہوئی سڑکیں جاذب نگاہ بھی ہیں اور تپتے ہوئے جسم و جاں کے لیے سکون کا مژدہ بھی مرکزی سڑک پیر سہاوہ روڈ پچھتر لاکھ روپے سے تیار کی گئی ہے۔

مارگلہ جو اسلام آباد کے سر پر ایک خوشنما تاج ہے جنوب کی سمت میں مسلسل اونچی ہوتی چٹانوں کا سلسلہ ہے جس میں اونچی نیچی وادیاں چشمے اور ندی نالے ہیں وہ 33000 ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا ہے اور 3000 کی بلندی سے 5000 فٹ کی بلندی تک جاتا ہے۔

مارگلہ پہاڑیوں کے دامن میں سیکٹر ای سیون میں پرانے گاؤں ڈھوک جیون میں ایک ہزار سال برگد کا درخت اب بھی موجود ہے جو بہت ہی گھنا اور پھیلا ہوا ہے اس کو بھی بدھ دور کے آثار میں سمجھا جاتا ہے اسلام آباد میں متعین، چین، جاپان، تھائی لینڈ، فلپائن سری لنکا اور دوسرے کئی ممالک کے بدھ سفارتکار اس درخت کو مقدس سمجھتے ہیں اور اس کے نیچے اپنی مذہبی رسومات ادا کرتے اور دعائیں مانگتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ یہاں دعائیں قبول ہوتی ہیں۔

مرغزار سے جو سڑک دامن کوہ کو جاتی ہے وہ قدرتی مناظر سے مالا مال ہے ہر سمت چیڑ کوھو، کتھا، پکتیا، املتاس، کچنار، ہاڑی اور جنگلی اناروں کے گھنے درخت اور جھاڑیاں ہیں۔1960ء سے پہلے یہ پہاڑ ویران تھا۔اس کے بعد سی ڈی اے کی محنت سے اس پر منصوبہ بندی کے تحت شجرکاری کی گئی اور اب عالم یہ کہ اس مقام پر درجہ حرارت کم ہو جانے کی وجہ سے موسم سرما میں برف باری بھی ہوتی ہے۔

مارگلہ پہاڑی کی چوٹی دیگر پہاڑوں کی طرح بلند مگر مکمل طور پر سبز ہے۔یہ ٹکڑا سوات کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے موڑ مڑتے ہی چڑھائی کے بعد اسلام آباد کا شہر ایک کتاب کی طرح دکھائی دیتا ہے سب سے پہلی نگاہ اسلام آباد کے ماتھے کے جھومر یعنی عظیم شاہ فیصل مسجد پر پڑتی ہے اس جگہ سے عظیم روحانی پیشوا پیر مہر علی شاہ گولڑ شریف کا مزار بھی دکھائی دیتا ہے اس لیے اس کا نام گولڑہ شریف پوائنٹ رکھا گیا ہے۔

دامن کوہ پر چار ویو پوائنٹ ہیں ان میں سے شاہ فیصل مسجد ویو پوائنٹ، ایوان صدر ویو پوائنٹ شاہ عبداللطیف بری امام ویو پوائنٹ شامل ہیں حکومت پاکستان نے سیاحت کو فروغ دینے اور اس صنعت کی ترقی و خوشحالی کے تحت یہ فیصلہ کیا ہے کہ مارگلہ کی پہاڑیوں کو جو اسلام آباد کو قدرت نے بہترین عطیہ دیا ہے اس کو مثالی تفریحی مقام بنایا جائے۔نیشنل پارک باغات پکنک

اسپاٹ، چیئر لفٹ میوزیم، نئی نئی سڑکیں۔ پہاڑی پیدل اور اور گھڑ سواروں کے لیے پگڈنڈیاں بنانے کا پروگرام شامل ہیں۔

شکر پڑیاں

یوں تو اسلام آباد اپنے دامن میں سینکڑوں خوبصورت جگہوں کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ اسلام آباد شہر کی سب سے خوبصورت اور دلچسپ تفریح گاہ شکر پڑیاں ہلز ہے اس پر فضا مقام پر غیر ملکی شخصیات اور سربراہان مملکت نے اپنے ہاتھوں سے پودے لگائے ہیں جس میں سے اب بہت سے درختوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں جو دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات کا باعث ہیں۔

لیاقت میموریل ہال/ باغ

یہ ہال پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کی یاد میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس میں ایک بہت بڑا اڈیٹوریم اور لائبریری ہے یہاں تصاویری نمائشیں غیر ملکی ثقافتی شوز اور ڈرامے وغیرہ منعقد کیے جاتے ہیں کھیلوں کی سہولت کے لیے ایک ابتدائی باغ اور ہال کے نزدیک بچوں کا پارک بھی کھیلنے کے لیے موجود ہیں۔

راولپنڈی پبلک پارک اور کرکٹ سٹیڈیم

راولپنڈی پبلک پارک، اسلام آباد کے نزدیک مری روڈ پر واقع ہے یہ پارک 1991ء میں عوام کے لیے کھولا گیا یہاں بچوں کے کھیلنے کے لیے پلے لینڈ سرسبز باغات فوارے اور پھولوں کی نرسریاں اس باغ کی منفرد خصوصیات ہیں اس پارک کے بالمقابل 1992 میں ایک کرکٹ اسٹیڈیم بھی تعمیر کیا گیا۔ 1992ء کے منعقدہ ورلڈ کپ کرکٹ کے چند میچ بھی اس اسٹیڈیم میں کھیلے گئے یہ اسٹیڈیم اپنی تمام تر جدید سہولیات کے ساتھ لیس ہے۔

روز اینڈ جاسمین گارڈن

جاسمین گارڈن 20360 اسکوائر میٹر رقبے پر گلاب کے پھولوں کی وجہ سے اپنی منفرد پہچان رکھتا ہے اس باغ میں گلاب کی 250 مختلف اقسام پائی جاتی ہیں یہاں پر پھولوں کی اکثر نمائشیں

منعقد کی جاتی ہیں خاص طور پر موسم بہار کی پھولوں کی نمائش لوگ دور دور سے دیکھنے کے لیے یہاں آتے ہیں۔

اسلام آباد سپورٹس کمپلیکس

چینی ماہرین کی نگرانی میں تیار کئے گئے اسلام آباد سپورٹس کمپلیکس میں لیاقت جمنازیم انڈور گیمز اور جناح سٹیڈیم آؤٹ ڈور گیمز کھیلنے کے لیے تیار ہوئے یہ شاہراہ کشمیر کے قریب آبپارہ کے پاس واقع ہیں۔اس کمپلیکس میں قومی اور بین الاقوامی نوعیت کی کھیلوں کی سرگرمیاں باقاعدگی سے منعقد کی جاتی ہیں۔

راول جھیل

8.8 اسکوائر کلومیٹر رقبے پر پھیلی ہوئی روال جھیل انسانی ہاتوں سے تراشا گیا ایک عمدہ شاہکار ہے یہاں پر واقع جھیل/ باغ، کشتی رانی، مچھلی پکڑنے اور سیر و تفریح کے لیے نہایت ہی دلفریب جگہ ہے۔

خان پور جھیل ڈیم

اسلام سے 48 کلومیٹر کے فاصلے پر ٹیکسلا ہری پور روڈ پر واقع ہے یہ بے مثال جگہ ایک روزہ پکنک ٹور، کشتی رانی، اور موسم سرما میں کثیر تعداد میں جمع ہونے والے خوبصورت اور دلکش ہجرت کرنے والے پرندوں کو دیکھنے کا مناسب مقام ہے۔

پاکستان میوزیم آف نیچرل ہسٹری

گارڈن ایونیو میں نیشنل پارک کے بالکل قریب ہے یہ عجائب گھر پاکستان کی قدیم انسانی تاریخ علم الارض اور وائلڈ لائف کے حوالے سے وسیع تر معلومات بہم فراہم کرتا ہے یہاں طالب علموں خاص طور پر بچوں کی دلچسپی کی حامل اشیاء کی نمائش کی جاتی ہے یہ 9 بجے دن سے لے کر شام 4 بجے عوام کے لیے کھلا رہتا ہے۔اس میں داخلے کا کوئی ٹکٹ نہیں لینا پڑتا اور جمعہ کو بند رہتا ہے۔

ٹانڈا ڈیم

یہ چھوٹا سا ڈیم راولپنڈی کے جنوب مغربی حصے سے تقریباً 35 کلومیٹر کے فاصلے پر دھمیال روڈ کے قریب واقع ہے۔ یہ ڈیم یک روزہ ٹور پروگرام کے لیے بہترین ماحول فراہم کرتا ہے۔

راولپنڈی گولف کلب

ایوب نیشنل پارک کے قریب واقع راولپنڈی گولف کورس 1926 میں تعمیر ہوا اور پاکستان کے سب سے پرانے گولف کلب میں شمار کیا جاتا ہے۔ 2 نومبر 1885ء میں اس کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ پہلے پہل یہاں 9 ہول کورس کی سہولت میسر تھی۔ بعدازاں اس میں وقتاً فوقتاً کچھ تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ اب یہاں اس کو 27 ہول کورس میں بدل دیا گیا ہے۔ پاکستان کے صدر اس کلب کے اہم اراکین میں شمار ہوتے ہیں۔ دونوں جڑواں شہروں راولپنڈی اور اسلام آباد سے اس گولف کو اس کلب کا خوبصورت نظارہ بیک وقت کیا جاسکتا ہے گولف کے بڑے قومی ٹورنامنٹس یہاں باقاعدگی سے منعقد کیے جاتے ہیں۔

اسلام آباد میوزیم

پاکستان کے حوالے سے یہ عجائب گھر تفصیلی تاریخ کو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے پاکستان کا شمار دنیا کی چند نایاب ترین تہذیبوں میں ہوتا ہے تمام چیزوں اور اشیاء کو بڑی وضاحت اور ترتیب کے ساتھ یہاں پر سجایا گیا ہے (دلچسپ انداز میں) یہاں پر لاکھوں سال قبل کے فاسلز اور انسانی ڈھانچے جو ہمیں اس دور کی یاد دلاتے ہیں کو بھی محفوظ کیا ہے اس کے ساتھ ساتھ یہاں پر دریائے سندھ کی قدیم تہذیب، گندھارا تہذیب، گندھارا آرٹ، اسلامی ریاستوں کا وجود مغلیہ دور کے آرٹ اور کرافٹ کے بے پناہ نمونے یہاں پر رکھے گئے ہیں۔

یہ عجائب گھر، گارڈن ایونیو میں عوام وخواص کے لیے جمعرات سے منگل تک صبح ساڑھے نو سے شام ساڑھے چار بجے تک کھلا رہتا ہے۔ بدھ کو میوزیم بند ہوتا ہے جبکہ ہر جمعہ کو دوپہر ساڑھے بارہ بجے سے لے کے دو بجے تک کے لیے بند رہتا ہے۔

○

شاہ فیصل مسجد، اسلام آباد

وفاقی دارالحکومت اسلام آباد کی عظیم الشان فیصل مسجد مارگلہ کی پہاڑیوں کے دامن میں واقع یہ شاہکار مسجد اسلام آباد کا امتیازی نشان بن چکی ہے اہرام کی شکل کی اس مسجد کا اپنے پس منظر میں ابھرتی پہاڑیوں اور ملحقہ وادیوں کے حسن سے عجیب رابطہ پیدا کیا گیا ہے۔

منفرد تعمیراتی حسن کی حامل اس خوبصورت مسجد کی تعمیر کا منصوبہ بہت عرصہ قبل بنایا گیا تھا۔ عزت مآب حضرت شاہ فیصل شہید کو بھی ان کے دورہ پاکستان کے دوران اس مجوزہ مسجد کے متعلق بتایا گیا تو انہوں نے خانہ خدا کی اپنے ذاتی خرچ سے تعمیر کرنے کی حامی بھری۔

سب سے پہلے 1969ء میں دنیا کے اعلیٰ ماہرین تعمیرات کی یونین نے حکومت سعودی عرب کے ایک نمائندے سمیت جیوری کے ایک پینل کی تشکیل کی مسجد کے ڈیزائن کا مقابلہ صرف اسلامی ممالک کے نقشہ سازوں کے درمیان ہوا چنانچہ اسلامی ملک کے ماہرین تعمیرات میں سے ترکی کے وحدت ولو کے کا ڈیزائن متفقہ طور پر منتخب ہوا۔ اور انہی کی زیر نگرانی مسجد کی تعمیر کے کام کا آغاز ہوا اس کی تعمیر کا ٹھیکہ پاکستانی فرم ''نیشنل کنسٹرکشن کمپنی'' کو دیا گیا۔

مسجد قدیم و جدید کا حسین امتزاج، ماضی و حال کا لاجواب سنگم، فن تعمیر کا بے مثال نمونہ اور ذوق جمال کا نادر اظہار ہونے کے ساتھ ساتھ دنیا کی سب سے بڑی مسجد ہونے کا بھی شرف رکھتی ہے۔

مسجد کا کام دو مراحل میں مکمل کیا گیا ہے اس کی خشت اول 12 اکتوبر 1976ء کو شاہ خالد بن عبدالعزیز کے ہاتھوں رکھی گئی۔ مسجد 146 ایکڑ مربع پر محیط ہے اس کی تعمیر میں بے شمار تعمیری اور تکنیکی خوبیاں موجود ہیں۔ مسجد کے ہال میں جو بغیر کسی سہارے کے بنایا گیا ہے صرف چار بڑے بڑے لوہے اور کنکریٹ کے شہتیروں پر پوری چھت کو سہارا دیا گیا ہے جو باہر سے دیکھنے پر بڑے کھلے معلوم ہوتے ہیں۔

ہال میں خواتین کے نماز پڑھنے کے لیے خاصی بڑی گیلری بھی بنائی گئی ہے اس گیلری میں مغلیہ طرز کی جالیاں لگائی گئی ہیں۔ گیلری کے شاندار دروازے پر خط کوفی میں ''جنت ماں کے قدموں تلے ہے'' کے علاوہ اور بھی آیات لکھی گئی ہیں ہال میں دس ہزار سے زائد برآمدوں میں چوبیس ہزار اور میدانوں میں بھی ہزارہا افراد بیک وقت نماز ادا کر سکتے ہیں اس گنجائش کو مزید بڑھایا بھی جا سکتا ہے یوں تو یہ مسجد اپنی کشادگی کے لحاظ سے بھی اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ مسجد میں روشنی کا بڑا عمدہ انتظام ہے دور سے دیکھنے پر مسجد روشنی کا پہاڑ لگتی ہے۔

ہال میں تقریباً ساڑھے چھ ٹن وزنی فانوس کے علاوہ دیگر چھوٹی لائٹیں بھی لگائی گئی ہیں ہر لائٹ کے ساتھ آواز پہنچانے کے لیے دو چھوٹے چھوٹے سپیکر بھی نصب کیے گئے ہیں اس کے علاوہ بھی آواز پہنچانے کے لیے سپیکر لگے ہوئے ہیں۔ وعظ کرنے اور اذان دینے کے لیے ایک اونچا پلیٹ فارم بنایا گیا ہے یہاں حسن قرات وغیرہ کے مقابلے بھی منعقد کروائے جاتے ہیں۔

ہال کے چوبی اور ایلومنیم کی کھڑکیاں اور دروازے بھی بڑی مہارت سے بنائے گئے ہیں مسجد کے حسن کو بڑھانے کے لیے طرح طرح کے رنگین شہتیروں، عمدہ ٹیلوں اور نفیس ترین شیشوں سے مرصع کیا گیا ہے مسجد کی شکل کی ایک خوبی خیمے سے مشابہت بھی ہے کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب سے پہلے نماز خیمے میں ہی ادا فرمائی تھی چنانچہ یہ شکل اس واقعہ کو مدنظر رکھ کر دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

مسجد میں اعتکاف کے لیے حجرے بھی بنائے گئے ہیں وضو کے لیے اعلیٰ پائے کی ٹوٹیاں اور اس کے علاوہ غسل خانے بھی بنائے گئے ہیں ساتھ ہی ساتھ مسجد کے 285 فٹ اونچے چار مینار اس کی رونق اور حسن کو دوبالا کرتے ہیں۔

میناروں کے 193 فٹ بلندی پر مشاہداتی گیلریاں بھی بنائی گئی ہیں جہاں سیڑھیوں کے علاوہ لفٹ کا بھی بندوبست ہے مینار پر لگے سونے کے ہلال سے ان کا حسن اور بھی نکھر جاتا ہے۔

مسجد کی ظاہری شان و شوکت اور حسن و خوبی کے ساتھ ہی اس کی پائیداری پر بھی خصوصی توجہ مرکوز کی گئی ہے زمین کی تبدیلیوں، زلزلوں اور دیگر ممکنہ حادثات سے بچاؤ کے لیے جدید سائنسی اصولوں اور اعلیٰ تکنیکی و تحقیقی مہارتیں بھی اپنائی گئی ہیں نمازیوں کی سہولت کے لیے یہاں سینکڑوں گاڑیاں اور ہزاروں موٹر سائیکلوں و سائیکلوں کے لیے بھی سٹینڈ بنائے گئے ہیں۔

اس کے علاوہ اسلامی ریسرچ سینٹر، میوزیم، لائبریری، پرنٹنگ پریس، کیفے ٹیریا، انتظامی

دفاتر اور انتظامیہ کی رہائش گاہوں کے علاوہ دیگر عمارتیں بھی اس کے حصے میں شامل ہیں مسجد کے خوبصورت سبزہ زار نقشی در و دیوار فوارے، راہ داریاں، برقی قمقے، سونے کے چاند، میدان اور دالان دودھ جیسے فرش اور جدید سڑکیں سب مل کر دیکھنے والے کو مسحور کر دیتے ہیں۔

مسجد کا اندورنی سامان اندرون اور بیرون ملک سے حاصل کیا گیا 800 سے زائد کارکنوں کی شب و روز محنت جو انہوں نے دس برس سے زائد عرصہ میں کی ہے یہ شاہکار عالم اسی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی بھی شاہ فیصل مسجد کے ساتھ منسلک ہے یہاں ہزاروں کی تعداد میں بیرون ممالک سے لڑکے اور لڑکیاں اسلامی تعلیمات کے حصول کے لیے کھچے چلے آتے ہیں اس یونیورسٹی کی اپنی ایک منفرد خصوصیت ہے اس کا معیار تعلیم پوری اسلامی امہ میں جانا پہچانا جاتا ہے یہاں سے فارغ التحصیل طلبہ کی ایک کثیر تعداد پوری دنیا میں اسلام کے فروغ اور تبلیغ کا باعث ہے اندازاً مسجد پر 50 کروڑ روپے سے زائد یا اس کے لگ بھگ روپیہ خرچ ہوا زیادہ رقم حکومت سعودیہ نے فراہم کی تاہم پاکستان نے بھی خلوص و محبت کے پھولوں کے ساتھ اپنی طرف سے خدا کے گھر کے لیے خرچ کیا ہے۔

پاکستان میں جہاں بادشاہی مسجد، داتا گنج بخش، بھونگ مسجد، اور مسجد طوبیٰ جیسی بے شمار خوبصورت اور بڑی بڑی مسجدیں موجود ہیں وہاں یہ مسجد ان میں ایک خوبصورت اضافہ ہے جس پر نہ صرف پاکستان بلکہ تمام دنیا کو ناز ہے دعا ہے کہ مسجد اپنے اصل مقاصد اتحاد و یکجہتی اخوت و مساوات ہمدردی و بھائی چارہ اور اطاعت کے جذبے تمام مسلمان دنیا میں اجاگر کرے اور یہ عظیم مسجد تمام عالم اسلام کے اتحاد کا نشان ثابت ہو۔

○

راول جھیل، اسلام آباد

راول جھیل اسلام آباد میں مارگلہ کی پہاڑیوں کے وسط میں واقع خوبصورت تفریحی مقام ہے۔ خاص طور پر غروب آفتاب کا منظر دیکھنے کے لیے ہر روز بیشمار لوگ یہاں جمع ہوتے ہیں۔ راول جھیل سردیوں میں مہاجر پرندوں کے لیے پر کشش جگہ ہے۔ راول جھیل پر ڈیم بھی بنایا گیا ہے جہاں سے راولپنڈی اور اسلام آباد کو پانی مہیا کیا جاتا ہے۔

پاکستان میں بیشمار تفریحی مقامات ہیں جو تازگی کا احساس دلاتے ہیں اور انسان ان کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر تمام تر تھکاوٹ اور پریشانیاں بھولنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ایک ایسا ہی تفریحی مقام راول جھیل ہے۔ یہ ایک بڑی مصنوعی جھیل ہے جو اسلام آباد کے قریب مارگلہ کی پہاڑیوں میں واقع ہے۔ راول جھیل 8.8 مربع کلومیٹر کے علاقے پر محیط ہے۔ جھیل کے ساتھ ایک خوبصورت پارک بنایا گیا ہے۔ جس میں خوبصورت پھولدار پودے اور درخت لگائے گئے ہیں جو نہایت خوبصورت منظر پیش کرتے ہیں۔ باغ کو سیر و تفریح کے لیے بہترین جگہ تصور کیا جاتا ہے جہاں پر ہر روز ہزاروں لوگ سیر و تفریح کے لیے آتے ہیں۔ یہاں پر بہت سے لوگ مچھلیوں کا شکار اور کشتی رانی بھی کرتے ہیں۔ باغ میں بنائے گئے چبوترے نما حصے سے روال جھیل کا خوبصورت نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ جھیل کے مغرب میں اسلام آباد کلب بنایا گیا ہے جو کھیلوں کی مختلف سہولیات فراہم کرتا ہے۔ راول جھیل پر ایک ڈیم بھی بنایا گیا ہے جہاں سے راولپنڈی اور اسلام آباد کو پانی فراہم کیا جاتا ہے۔ راول جھیل کے پانی کو آبپاشی کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس ڈیم کی بلندی 133.5 فٹ ہے اور پانی جمع کرنے کی آخری حد 47 ہزار 500 ایکڑ فٹ ہے۔ ڈیم سے دو کم لمبائی والی نہریں بھی نکالی گئی ہیں۔ پانی کا یہ ذخیرہ موسم سرما میں مہاجر پرندوں کے لیے بہترین جگہ ہے۔ اس کے علاوہ مقامی جانوروں میں لومڑی، سیہ، جنگلی بلی، گیدڑ اور ابابیل قابل ذکر ہیں جو ارد گرد کے علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ راول ڈیم سے تقریباً پانچ سو ایکڑ زرعی

اراضی سیراب کی جاتی ہے۔اس کے علاوہ جھیل سے راولپنڈی کو یومیہ 19.5 ملین گیلن اور اسلام آباد کو 2.5 ملین گیلن پینے کا صاف پانی فراہم کیا جاتا ہے۔

راول جھیل کے مقام پر غروب آفتاب کا منظر بہت دلکش ہوتا ہے جس کو دیکھنے کے لیے بہت سے لوگ یہاں آتے ہیں۔ سیاحوں کی سہولت کے لیے پاکستان ٹورزم ڈویلپمنٹ کارپوریشن کی طرف سے ایک ریسٹورنٹ بھی بنایا گیا ہے۔ حال ہی میں کیپٹل اتھارٹی کی طرف سے جھیل کے قریب ہی تعمیراتی کام کا آغاز کیا گیا ہے جس میں ایک سیرگاہ بنائی جائے گی جس میں اوپن ایئر ہال، کشتی رانی کے لیے مخصوص جگہ اور ہرے بھرے گھاس کے میدان بنائے جائیں گے۔ان ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل سے یہ جگہ مزید خوبصورت اور پرلطف ہو جائے گی۔

راول جھیل کے گرد درخت اور جنگلات بہت پرسکون اور رومانوی احساس دلاتے ہیں۔

تحریر: ابصار قدیر

○

فاطمہ جناح پارک، اسلام آباد

خوبصورت پارک، سڑکوں کے کنارے، جاگنگ ٹریک اس بات کی علامت ہیں کہ دنیا کے انتہائی ترقی یافتہ ملکوں نے صحت کی راہ پر چل کر ترقی کی منزل کو پایا۔

وفاقی دارالحکومت اسلام آباد میں واقع تفریحی مقام فاطمہ جناح پارک کا سنگ بنیاد 8 جنوری 1992ء کو سابق وزیراعظم میاں نواز شریف نے رکھا تھا یہ پارک ایف 9 سیکٹر پر پھیلا ہوا ہے اس کے چار مین دروازے ہیں اس کے ایک جانب انتہائی پوش رہائشی علاقہ ایف 8 جبکہ دوسری جانب ایئرفورس کا علاقہ ای 9 تیسری جانب ایف 10 اور چوتھی طرف متوسط رہائشی علاقہ جی 10 واقع ہے اسے ایشیا کا عظیم اور حسین پارک ہونے کا اعزاز حاصل ہے یہاں ہر سیکٹر کے لیے الگ دروازہ ہے یہ وسیع وعریض پارک تقریباً 3 سال میں تعمیر ہوا۔ اس کا افتتاح ترکی کے صدر سلمان ڈیمرل نے 16 مارچ 1995ء کو کیا۔ اس وجہ سے اس پارک کو پاک ترک دوستی کا لازوال نشان بھی کہا جاتا ہے۔ پہلے اس پارک کا نام کیپٹل پارک تھا بعدازاں اس کا نام فاطمہ جناح پارک رکھ دیا گیا اسے F-9 پارک کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اسے عوام کی تفریح کے لیے روزانہ 16 گھنٹے تک کھلا رکھا جاتا ہے اس کا نظم ونسق کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے ہاتھ میں ہے۔ اس میں مختلف جاگنگ ٹریکس بھی بنائے گئے ہیں اور چہل قدمی کے لیے کئی راستے بھی موجود ہیں ہری بھری گھاس، سرسبز وشاداب ماحول میں موجود یہ پارک ایک صحت مند تفریح کا ذریعہ ہے سرشام ہی ہر طرف سے لوگ اس میں داخل ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں اسلام آباد اور راولپنڈی کے لوگ یہاں واک کرنے آتے ہیں جن میں بیوروکریٹس، ڈپلومیٹ اور ہر طرح کے لوگ شامل ہیں تہوار کے دن تو اس پارک کی شان ہی کچھ اور ہوتی ہے کئی لوک فنکار یہاں اپنے فن کا مظاہرہ بھی کر چکے ہیں بڑے بڑے اجتماعات کے لیے بھی اس پارک کو استعمال کیا جاتا ہے کئی سیاسی اور مذہبی جماعتیں بھی اس پارک میں اپنے اجتماعات کر چکی ہیں۔ وفاقی دارالحکومت میں تبلیغی جماعت کا اجتماع ہر سال اس پارک کے قریب

منعقد ہوتا ہے غیر سرکاری تنظیمیں بھی اپنی سرگرمیوں کے انعقاد کے لیے اسے اپنے لیے موزوں قرار دیتی ہیں۔ ناموراور مقتدر شخصیات یہاں باقاعدگی سے سیر کے لیے آتی ہیں۔

باپردہ خواتین کی ایک بہت بڑی تعداد بھی روزانہ ادھر واک کرنے آتی ہے پہلے اس پارک میں کوئی پارکنگ فیس وغیرہ بھی رکھی گئی تھی۔ لیکن موجودہ حکومت نے پارکنگ فیس مقرر کردی ہے صبح وشام واک، جاگنگ جبکہ گیارہ سے چار بجے مختلف سکولوں کے ٹرپس اس پارک میں تفریح کے لیے آتے ہیں۔ نماز کی ادائیگی کے لیے مختلف مقامات کو مختص کیا گیا ہے لیکن باقاعدہ مسجد کی تعمیر نہیں کی گئی جس کی کمی شدت سے محسوس کی جاتی ہے حالانکہ اتنے وسیع وعریض پارک میں مسجد کا ہونا بے حد ضروری ہے۔

مارگلہ کی حسین وجمیل پہاڑیوں کے وسط میں واقع یہ جدید طرز کا منفرد پارک اسلام آباد کے باسیوں کو ہر طرح کی تفریح مہیا کرتا ہے یہ ایک قومی شاہکار ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی برادری میں بھی اس کا اپنا مقام ہے پارک کے وسط میں اقوام متحدہ کا سلوگن نصب ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ اسے بین الاقوامی پارک کا درجہ حاصل ہے پارک میں کھڑے ہوکر مارگلہ کی پہاڑیوں، فیصل مسجد اور پورے دارالحکومت کا واضح نظارہ کیا جاسکتا ہے۔

ایف 10 کے دروازے سے داخل ہوں تو سنگ مرمر سے تعمیر کردہ ایک مربع نما چوکھٹ نظر آتی ہے جس کو بارہ دری کہا جاتا ہے اس چوکھٹ سے دائیں جانب موڑ میں مہنگی تفریح کے لیے ہارٹ شارٹ کلب نظر آئے گا۔ جس میں سوئمنگ پول، باڈی بلڈنگ کلب، بچوں کا پلے لینڈ، کھانے پینے کی شاپس وغیرہ موجود ہیں۔

اسلام آباد کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے تفریحی پارکوں میں صرف فاطمہ جناح پارک ہی ایسی جگہ ہے جہاں سے کچھ کھانے پینے کی اشیاء مل سکتی ہیں۔ لیکن یہاں اشیاء کے نرخ آسمان سے باتیں کرتے ہیں حالانکہ سی ڈی اے انتظامیہ نے اسے عوام کی سہولت کے لیے کھولا ہے۔

یہ پارک رقبے کے اعتبار سے دنیا کے بڑے پارکوں میں سے ایک ہے اتنا بڑا رقبہ بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ اس پارک کا فوری حل طلب مسئلہ یہ ہے کہ اس میں بچوں کے کھیل کود کے لیے کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں ہے۔ فاطمہ جناح پارک، بے پناہ خوبیوں اور چند خامیوں کے باوجود ایک ایسی پرفضاء جگہ ہے جہاں انسان بہرحال سکون محسوس کرتا ہے۔

○

سملی ڈیم، اسلام آباد

مری ہلز اور اس کے گردونواح کے علاقوں جو عرف عام میں ''گلیات'' پکارے جاتے ہیں پر ہونے والی برف باری اور بارش صرف ان کے حسن و خوبصورتی میں اضافہ کا باعث ہی نہیں بنتی بلکہ ان سے لاکھوں افراد کو پینے اور وسیع رقبے کو آبپاشی کے لیے پانی جیسی انمول نعمت بھی حاصل ہوتی ہے مری اور اس کے بالمقابل واقع گلہڑا گلی کی پہاڑیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان پر ہونے والی برفباری اور بارش ڈھلوان کے ایک جانب دریائے جہلم اور اس کی وادیوں کو پانی فراہم کرتی ہے تو دوسری جانب راولپنڈی اسلام آباد اور ان سے ملحقہ علاقے اس سے فیض یاب ہوتے ہیں۔

مری سے دریائے سواں اور گلہڑا گلی سے کھاد نالہ ان پانیوں کو لے کر نشیب کی جانب اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں۔ راستے میں سینکڑوں چھوٹے چھوٹے برساتی نالوں اور چشموں کا پانی ان میں شامل ہو جاتا ہے لگ بھگ پچاس کلومیٹر کا پر پیچ راستہ طے کرنے کے بعد آزادی کے مقام پر کھاد نالہ، دریائے سواں سے مل جاتا ہے جو کچھ فاصلے کے بعد ایک چھوٹی سی پیالہ نما وادی میں آنکلتا ہے جہاں کوئی بیس بائیس سال پہلے سملی نام کا ایک چھوٹا سا گاؤں آباد تھا جو سو سے ڈیڑھ سو مکانات پر مشتمل تھا۔

وفاقی دارالحکومت کی تعمیر کے وقت پانی کی فراہمی کے لیے جو منصوبے بنائے گئے تھے وہ بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے رفتہ رفتہ کم پڑنے لگے تو پانی کی کسی بڑی ذخیرہ گاہ کی تلاش شروع ہوئی چنانچہ ارضیاتی اور جغرافیائی سروے کے بعد قرعۂ فال اس علاقے کے نام نکلا جہاں سملی گاؤں آباد تھا۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ تین اطراف بلند و بالا پہاڑ تھے جن کے عین نشیب میں آبادی تھی اگر اس گاؤں کو خالی کرا لیا جاتا تو یہ پیالہ نما وادی قدرتی جھیل بن سکتی تھی چنانچہ سملی کے مکینوں کو پرانی آبادی کے سامنے پہاڑی پر بھارہ کہو کو پتریاٹہ اور مری سے ملانے والی سڑک کے کنارے متبادل جگہ دے کر گاؤں خالی کرا لیا گیا اور یہاں پانی کی اس ذخیرہ

گاہ کی بنیاد رکھی گئی جسے اب ''سملی ڈیم'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

سملی، اسلام آباد کے شمال مشرق میں لگ بھگ چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقعہ ہے دریائے سواں پر واقع یہ ڈیم مکمل قدرتی ڈیم ہے اوراس میں پانی کی آمد مکمل طور پر بارشوں سے مشروط ہے کھاد نالہ اور دریائے سواں کے علاوہ منگل، جندر یلا، چنیوٹ، کلالئی، کلاں، بساند بھانہ اور ملحقہ چھوٹے چھوٹے علاقوں سے بھی درجنوں نالوں اور چشموں کا پانی براہ راست اسی جھیل میں آ کر گرتا ہے جو 10 کلومیٹر رقبہ پر پھیلی ہوئی ہے۔ ستمبر 1982ء میں مکمل ہونے والے اس ڈیم کی عمر کا اندازہ 63 برس ہے یعنی دوسرے لفظوں میں اسلام آباد کے شہری 2045ء تک سملی کے پانی سے استفادہ کر سکیں گے۔

سملی ڈیم کی جھیل 265 فٹ گہری ہے اور اس میں 25 لاکھ 80 ہزار کیوبک گز پانی ذخیرہ کرنے کی گنجائش ہے۔ 44.5 کیوسک گنجائش کی 6 فٹ چوڑی سرنگ کے ذریعے پانی دو جدید ترین فلٹریشن اور پیوری فیکیشن پلانٹس میں پہنچایا جاتا ہے جو 48 انچ قطر کی 120 میٹر طویل دو پائپ لائنوں پر متعدد پمپنگ اسٹیشن قائم کیے گئے ہیں جن کے باعث صاف پانی کی فراہمی میں کوئی تعطل پیدا نہیں ہوتا۔

جھیل میں گنجائش سے زیادہ پانی آ جانے کی صورت میں اس کے اخراج کے لیے 1010 فٹ طویل اسپل وے بنایا گیا ہے جو سطح زمین 250 فٹ ہے اس کے تین دروازے ہیں جبکہ بلندی پر اس کی موٹائی 30 فٹ ہے اس اسپل وے سے 4500 کیوسک پانی خارج ہوسکتا ہے حال ہی میں اسپل وے کے گیٹ مزید 20 فٹ بلند کر دیئے گئے ہیں جس کی وجہ سے ڈیم میں پانی کی مقدار 28 ہزار 50 ایکڑ فٹ سے بڑھ کر 38 ہزار ایکڑ فٹ ہوگئی ہے پہلے یہاں سے 2 کروڑ 40 لاکھ گیلن پانی روزانہ فراہم کیا جاتا تھا جبکہ توسیع سے یہ تقریباً دگنی ہوگئی۔

اسلام آباد کی 5 لاکھ 25 ہزار کی آبادی کو اوسطاً گیلن فی شخص کے حساب سے 8 کروڑ 25 لاکھ گیلن پانی درکار ہے سی ڈی اے گیارہ مختلف ذرائع سے یہ پانی فراہم کرتا ہے جن میں کورنگ واٹر ورکس، سملی واٹر ورکس، سید پور واٹر ورکس، نور پور واٹر ورکس اور نیشنل پارک پرانے گولف کورس، نئے گولف کورس اور مختلف سیکٹروں میں نصب 143 ٹیوب ویل شامل ہیں جن میں سے کئی ایک خشک یا خراب ہو چکے ہیں۔ سملی ڈیم کو ان تمام ذرائع پر اس لیے فوقیت حاصل ہے کیونکہ یہاں سے اسلام آباد کی پانی کی نصف ضروریات پوری ہوتی ہیں اور روزانہ 4 کروڑ 20 لاکھ گیلن پانی 48 انچ

کی دو پائپ لائنوں کے ذریعے یہاں پہنچتا ہے چونکہ اسلام آباد راولپنڈی سمیت پوری وادی پوٹھوہار کو ان دنوں بارشوں کی کمی کا سامنا ہے اس لیے اس بارانی ڈیم سے اسلام آباد کو پانی کی فراہمی نمایاں طور پر کم ہوگئی ہے سی ڈی اے کے مطابق اس وقت سملی صرف 2 کروڑ گیلن پانی روزانہ فراہم کررہا ہے جس سے اسلام آباد فی الوقت سنگین صورتحال سے دوچار ہے۔

سملی ڈیم کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ کوئی کمرشل منصوبہ نہیں، یہ اپنا خرچہ اسلام آباد کو پانی کی فراہمی کے عوض پورا کرلیتا ہے۔ سملی کی جھیل میں چلانے کے لیے دو کشتیاں بھی موجود ہیں۔

اسلام آباد کو پانی فراہم کرنے کے علاوہ سملی ڈیم بعض سیاست دانوں کا میزبان بھی رہا ہے جھیل کنارے بنے ہوئے عالی شان ریسٹ ہاؤس میں کئی سیاست دان اپنے ایام اسیری بسر کر چکے ہیں اُن میں آصف زرداری اور سابق وزیراعظم آزاد کشمیر ممتاز راٹھور بھی شامل ہیں۔ بے نظیر بھٹو خود بھی دوبارہ اس ریسٹ ہاؤس کی میزبانی کا لطف اٹھا چکی ہیں۔ اس ریسٹ ہاؤس کے بارے میں بعض دیگر کہانیاں بھی زبان زد عام ہیں سملی ڈیم کی تعمیر میں ایم سی پی سابق میکنائزڈ کنسٹرکشن آف پاکستان عکاظ اور مصطفیٰ کمپنی نے مشترکہ طور پر حصہ لیا۔

ذوالفقار ارشد گیلانی، اعزاز حسین شاہ، شمیم انوار خان

اشاعت خاص ایڈیشن روزنامہ ''خبریں'' لاہور

5 جولائی 1999ء

○

مرگلہ ہلز نیشنل پارک، اسلام آباد

مرگلہ ہلز نیشنل پارک، پاکستان کے ان چند پارکس میں شامل ہے جہاں آنے والے سیاحوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ راولپنڈی اسلام آباد سے بالکل متصل ہے۔ وادی پوٹھوہار میں واقع مرگلہ پہاڑیاں ایک عرصہ دراز سے نایاب و نادر پودوں، درختوں جڑی بوٹیوں مختلف اقسام کے جنگلی جانوروں اور پرندوں کا مسکن ہیں اس پورے علاقے کو نیشنل پارک کا درجہ دینے کی ضرورت یوں محسوس کی گئی کہ اس علاقے سے بالکل متصل اسلام آباد جیسے بڑے شہر کے آباد ہونے کی وجہ سے یہاں کے قدرتی ماحول اور جنگلی حیات کو بہت سے خطرات لاحق ہو گئے تھے بڑے پیمانے پر درختوں کی کٹائی کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا تعمیراتی مقاصد کے لیے پہاڑوں کو توڑا جا رہا تھا یہاں پائے جانے والے جنگلی جانور شکاریوں کے ہاتھوں رفتہ رفتہ ختم ہو رہے تھے مرگلہ پہاڑیوں کے حیاتیاتی نظام کو محفوظ اور قائم و دائم رکھنے کے لیے اپریل 1980 میں اس علاقے کو "مرگلہ نیشنل پارک" قرار دے دیا گیا اس علاقے یعنی نیشنل پارک میں جا بجا پانی کے چشمے اور آبشار ہیں۔ ان چشموں اور آبشاروں کا پانی اسی نیشنل پارک سے گذرنے والی کورنگ ندی میں شامل ہوتا ہے جو بالآخر سون میں شامل ہو جاتی ہے اسلام آباد شہر بھی مرگلہ ہلز نیشنل پارک کا حصہ ہے۔ مرگلہ ہلز نیشنل پارک، ماحولیات سے دلچسپی رکھنے والے سیاحوں کے لیے ایک نہایت ہی خوبصورت جگہ ہے۔

○

ایوب نیشنل پارک، راولپنڈی

جیسا کہ ملتان کو مزارات لاہور کو باغات اور کراچی کو روشنیوں اور رنگ و نور کا شہر کہا جاتا ہے اسی طرح راولپنڈی اور اسلام آباد ''جڑواں شہروں'' کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ اسلام آباد کی ترتیب سے بنی ہوئی عمارات اور پہاڑیاں اپنی طرف کھینچتی ہیں تو راولپنڈی کے پارکوں کا اپنا ایک حسن ہے انہی میں سے ایک ''ایوب نیشنل پارک'' ہے جسے بلاشبہ پاکستان کے خوبصورت پارکوں میں شمار کیا جاتا ہے آپ بچے ہیں بڑے یا بوڑھے اس جگہ آ کر بور نہیں ہوں گے یہ راولپنڈی کے باسیوں کا دعویٰ ہے وہ کہتے ہیں کہ اس پارک میں تمام تر قدرتی خوبصورتیاں پہاڑ، جنگل، جھیل، میدان اور جنگلی حیات یعنی وہ سب کچھ موجود ہیں جسے آپ دیکھنا چاہتے ہیں خصوصاً جمعہ اور اتوار کو یہاں سینکڑوں افراد سیر کے لیے آتے ہیں ماحول اس قدر صاف ستھرا اور اتنا اچھا رکھا گیا ہے کہ یہ ملک کا بہترین پارک لگتا ہے۔ پارک میں داخل ہوتے ہی ایک خوبصورت تاثر پیدا ہوتا ہے جوں جوں صاف راستوں پر چہل قدمی کرتے ہوئے آپ آگے بڑھتے ہیں آپ کو تازگی اور فرحت کا احساس ہونے لگتا ہے سڑکوں پر چونے کے پتھر کے پاؤڈر سے نشان لگائے گئے ہیں یہ نشان آپ کی رہنمائی کرتے ہیں پارک کے بائیں حصے میں جائیں تو پہاڑی کی چوٹی ہے یہاں پر مرد اور خواتین جاگنگ کرتے نظر آتے ہیں اس جگہ اکثر خاموشی کا راج ہوتا ہے اس لیے اسے آرام کے خواہش مند افراد کا پسندیدہ مقام بھی کہا جا سکتا ہے اس پہاڑی کے قریب بھی میدانی علاقہ ہے جہاں پر شرارتی بچے پرندوں سے کھیلتے ہوئے بہت بھلے لگتے ہیں بچوں کی کوشش ہوتی ہے کہ بھاگ کر سب سے پہلے اس جگہ پر پہنچ جائیں جب وہ اپنی توتلی زبان میں ان پرندوں سے گفتگو کی کوشش کرتے ہیں تو بچوں کے ساتھ ساتھ ان کے والدین کے چہروں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے ایوب نیشنل پارک میں بچوں کی پسند کی بہت سی چیزیں ہیں نوجوان بھی ٹولیوں کی شکل میں یہاں آتے ہیں اور اکثر فوک گیت گنگناتے دکھائی دیتے ہیں نزدیک ہی ایک جھیل ہے جس میں تیرتی

سفید بطخیں دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے کہ تفریح کے موڈ میں ہوں جب بلند قامت درختوں کی شاخوں میں سے گزر کر سورج کی کرنیں پانی پر پڑتی ہیں تو یہ منظر بہت دلکش لگتا ہے۔

ایوب پارک میں پرندوں اور جانوروں کی مختلف اقسام پائی جاتی ہیں چیتے، بندر، ریچھ، ہاتھی اور دوسری بہت سی پیاری پیاری چیزیں آپ کی تفریح کے لیے یہاں موجود ہیں۔ زیبرا اور ایک کالا بھارتی بندر لوگوں کی توجہ کا خصوصی مرکز ہوتا ہے شیر کی غراہٹ تو بچوں کا دل دہلا دیتی ہے لیکن گھبرائیے نہیں یہ اصلی نہیں اس کا مجسمہ ہے جو پاکستان کے معروف مصور مجسمہ ساز ایس ایم خالد نے بنایا ہے یہاں کی ایک خاص شے یعنی ''پیپسی جنگل کنگڈم'' ہے اس میں ریموٹ کنٹرول جھولے، بڑی بڑی کشتیاں، تالاب ہیں کے پاس بھی ہر وقت نوجوانوں کا بہت رش ہوتا ہے۔
ایوب پارک میں سیر کے لیے آنے والوں کا کہنا ہے کہ یہ ایک منفرد جگہ ہے اور ہمیں یقین ہے کہ آپ وہاں جا کر دن بھر کی تھکاوٹ اور پریشانیوں سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں پارک کا پرسکون ماحول آپ کی تخلیقی صلاحیتوں کو بڑھاتا ہے شاید اس لیے طلبہ اور لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہر وقت ایوب پارک میں نظر آتی ہے پارک میں جا کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کو مشورہ دے رہا ہو کہ اپنی مصروف زندگی میں سے تفریح کے لیے وقت ضرور نکالیئے اور اپنے محسوسات کو خوشگوار بنانے کے لیے اس مقام پر کچھ وقت ضرور گزاریئے۔

اگر آپ کو کبھی راولپنڈی جانے کا اتفاق ہو تو ایوب نیشنل پارک ضرور دیکھئے اس کے بغیر راولپنڈی کی سیر ادھوری رہ جائے گی۔

ہفت روزہ ''فیملی میگزین'' لاہور

○

چھتر پارک، راولپنڈی

وفاقی دارالحکومت اسلام آباد کے شمال میں 20 کلومیٹر کے فاصلے پر چھتر کی سحر انگیز بستی دعوت نظارہ دیتی ہے اسلام آباد کے پہلو میں شاہراہ کشمیر پر رواں دواں ندی کے کنارے دلنشین وادی چھتر وسیع وعریض رقبے پر پھیلی ہوئی ہے ماضی میں چھتر کی شہرت گل وگلزار سدا بہار اشجار و لوکاٹ کے باغات پر انحصار کرتی تھی لیکن ماضی قریب میں چھتر کی انوکھی وادی کو تفریحی مرکز کی حیثیت سے شاہراہ ترقی پر گامزن کر کے اسے بانکپن کے جداگانہ نکھار سے ہمکنار کر دیا گیا ہے۔ روانی اور ندی میں پانی کی فراوانی نے چھتر کی افادیت کہیں زیادہ اجاگر کر دی ہے معلق پل 80 فٹ اونچی آبشار، جدید پارک، خوبصورت جھولے، ہرن اور کہیں موروں کی چہکار، ریستوران، سوئمنگ پول کی سہولت دستیاب ہے چھتر کا چھوٹا سا بازار سدا بہار اشجار نے چھتر کا حسن دوبالا کر دیا ہے یہی وہ مقام ہے جہاں سے مری کی حدود کا آغاز ہوتا ہے۔

چھتر سے آگے 5 کلومیٹر کے فاصلے پر وادی سالگراں میں شاہراہ کشمیر پر ایک صدی قبل پختہ اور تراشیدہ پتھر کا شاہکار تاریخی پل تعمیر کیا گیا تھا۔ عہد حاضر میں پنجاب ٹورازم نے کار پارکنگ اور کشادہ لان کے ساتھ خوبصورت ریستوران کا اضافہ کیا ہے سالگراں کی دلفریب وادی کبھی کبھی مرغان چمن اور چرند پرند کی نغمہ سرائی سے معمور ہوتی ہے۔ مرغزاروں اور وسیع وعریض سبزہ زاروں کے دامن میں قدیم زمانے کی پن چکی عہد رفتہ کی یادگار علامت ہے اس سے آگے تریٹ اور نند کوٹ کی خوبصورت بستیاں بھی قابل دید ہیں یہاں کی آب و ہوا تریٹ کے حسن میں اضافہ کا سبب ہے۔

○

تربیلا ڈیم

تقسیم ہند کے نتیجہ میں پاکستان میں جو عظیم تعمیرات ہوئی ہیں ان میں اسلام آباد کا شہر، شاہراہ قراقرم، شاہین وغوری میزائل کا کامیاب تجربہ اور تربیلا ڈیم کو نمایاں اہمیت حاصل ہے تربیلا ڈیم، نہ صرف پاکستان کے تمام ڈیموں میں بلکہ مٹی کی بھرائی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا ڈیم ہے اور عالمگیر شہرت کا مالک ہے جس کو دنیا کے ممتاز ترین آبی انجینئروں، ممتاز سربراہان مملکت مشاہیر عالم اور مالیات کے ماہروں اور سیاحوں نے ہزاروں کی تعداد میں دیکھا اور جس کی تعمیر کے فنی کمالات کا جائزہ لے کر پاکستانی قوم کی تخلیقی صلاحیت اور کامیاب منصوبہ بندی کی تعریف کی ہے تربیلا ڈیم کی جھیل جو بجلی پیدا کرنے والے ٹربائن سے نکل کر پانی کے آبشاروں میں قوس قزح بننے والے مناظر اور بند کی دیواروں کی پرشکوہ بلندی اور مسحور کن دیوار جو ایسا نظارہ پیش کرتی ہے جو جنت نگاہ نظارہ پیش کرتی ہے۔ پرسکون نیلے پانی کی جھیل جو 32 میل طویل ہے سمندر کا شہزادہ معلوم ہوتی ہے اور سیاحوں کو اتنے دلکش نظارے پیش کرتی ہے جو روح کو سکون اور قلب کو سرور پہنچاتے ہیں۔

تربیلا کالونی کی خوبصورت بلند ہوتی ہوئی سڑک سے گذر کر جو چھوٹے سے پہاڑ کے دامن کے ساتھ چلتی ہوئی ڈیم کی جگہ پر پہنچتی ہے اور یکا یک ڈیم کا پورا نظارہ اس طرح سامنے آجاتا ہے جیسے بند آنکھوں کے کھلنے پر رات کے سناٹے میں نیلا آسمان نظر آجائے۔ پاکستان کی سیاحت تربیلا ڈیم کا نظارہ کیے بغیر ہرگز مکمل نہیں ہوسکتی۔ فنی اعتبار سے یہ ڈیم پاکستان کے کھیتوں میں پانی کی فراہمی اور اس ڈیم کے بجلی گھروں سے وافر مقدر میں بجلی فراہم کرنے کے لیے بنایا گیا تھا جب تقسیم ہند کے نتیجے میں ہند اور پاکستان میں پانی کی تقسیم کا تنازعہ پیدا ہوا تو 19 ستمبر 1960ء کو ایک معاہدہ ہوا اسی کے تحت پاکستان کو دریائے راوی، ستلج اور بیاس کے پانی سے دست کش ہونا پڑا۔ جبکہ دریائے سندھ جہلم اور چناب کے پانی سے ہندوستان کا حق آبپاشی ختم ہوگیا اس کو ''سندھ

طاس'' کا منصوبہ کہتے ہیں جو پاکستان کے وسیع زرعی علاقے کو محروم شدہ دریاؤں کے پانی کا بدل فراہم کر سکے جس میں سے ایک منگلا ڈیم ہے جو جہلم کے پانی کو یکجا کرنے کے لیے بنا دیا گیا ہے پاکستان کا کل زیر آب زرعی رقبہ 198 ملین ایکڑ ہے۔ جس میں سے ایک سو تیس ملین ایکڑ کو پانی فراہم کرنے کے لیے منگلا ڈیم اور تربیلا ڈیم بنائے گئے ہیں اتنے عظیم منصوبے کے تعمیری اخراجات عالمی بنک کی جزوی امداد سے اور پاکستان کے اپنے وسائل سے مکمل کیے گئے ہیں تربیلا ڈیم اس مقام پر تعمیر کیا گیا ہے جہاں دریائے سندھ 700 میل پہاڑی سفر طے کرنے کے بعد تربیلا کے میدانی علاقے میں داخل ہوتا ہے دریائے سندھ تقریباً دو ہزار میل لمبا اور دنیا کے بڑے دریاؤں میں شامل ہے اسی لیے پاکستان میں اس کو ''اباسین'' یعنی دریاؤں کا باپ کہتے ہیں سندھ میں اسے ''مہران'' کہتے ہیں اس کے معنی مہر و وفا پھیلانے والا ہے اور اس کا نام انگریزی میں قدیم تہذیبوں کے حوالے سے انڈس کہا جاتا ہے۔ جس سے انڈیا کا لفظ بنا ہے یہ دریا دنیا کی دس بڑی چوٹیوں میں سے سات میں سے گزرتا ہے اور دنیا کے سات بڑے برفانی تودوں کو عبور کرتا ہے اور ان سب کا پانی سمیٹ لاتا ہے یہ تین لاکھ 72 ہزار مربع رقبہ کے علاقے پر پھیلا ہوا ہے جب اس کی تعمیر کے منصوبہ کا آغاز ہوا تو اس ڈیم کے رقبہ پر آباد ایک لاکھ انسانوں کو اپنے گاؤں اور مکانات چھوڑ کر نقل مکانی کرنی پڑی جس کا ان کو معاوضہ دیا گیا تربیلا ڈیم کی تعمیر کا کام دنیا کی مشہور انجینئرنگ کمپنیوں پاکستان، فرانس، اٹلی، جرمنی اور سوئس کمپنیوں کے اشتراک سے انجام پایا۔ 1953ء سے 1976ء تک دن رات 20 ہزار کارکنوں نے کام کر کے اپنے خون پسینے کی محنت سے یہ منصوبہ مکمل کیا۔ اس کی تعمیر میں 143 افراد جاں بحق ہوئے جن میں 6 غیر ملکی ماہرین بھی شامل ہیں ان کی قربانی ہمیشہ کے لیے تربیلا ڈیم کے فیضان میں شامل ہو گئی ہے دنیا کی ایسی تمام دیوہیکل مشینیں جو بند سازی اور آبی بجلی گھروں کی تعمیر کے لیے ضروری تھیں وہ سب فراہم کی گئیں دریا کا رخ موڑنے کا عمل مشکل ترین کام تھا جو بالآخر انجام پا گیا تربیلا ڈیم دو ہزار 700 چالیس میٹر رقبے پر انتہائی پرشکوہ انداز میں بنایا گیا ہے اس کی اونچائی 148 میٹر ہے جبکہ مینار پاکستان کی اونچائی 63 میٹر ہے اس بند پر 105 ملین کیوبک میٹریل استعمال ہوا ہے۔ تربیلا ڈیم کا مرکزی بند 9 ہزار فٹ لمبا ہے اور دریا کی تہہ سے 485 فٹ اونچا ہے اس بند کی تعمیر میں انجینئرنگ کی جو جدید ترین ٹیکنالوجی استعمال کی گئی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یہ ڈیم اپنے اندر 3 ہزار آلات لیئے ہوئے ہے جو پانی کی مقدار اور ذخیرہ آب کا وزن بتاتے ہیں اور حرکت ارضی کو اپنے اندر جذب

کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور 17 سکیل کی قوت کا زلزلہ بھی اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ ڈیم کے آلات اس کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں۔ اسپل ویز کی تعمیر پر چالیس ملین کیوبک میٹر کھدائی کی گئی اور آٹھ لاکھ کیوبک میٹر کنکریٹ اور 3600 ملین ٹن لوہا 16 دروازوں پر خرچ ہوا دریا کے کنارے کے دائیں طرف بڑی بڑی چار سرنگیں بھی کھودی گئیں ہر سرنگ کی لمبائی نصف میل اور چوڑائی 43 فٹ ہے سرنگ نمبر 1 اور نمبر 2 پاور ہاؤس کو پانی فراہم کرتی ہے۔ سرنگ نمبر 3 اور 4 آب پاشی اور بجلی کے لیے ہیں جو چٹانیں کاٹ کر بنائی گئی ہیں یہ سرنگیں بہت بڑی ہیں ان کا ڈایا میٹر 11 سے 14 میٹر تک ہے تقریباً ایک لاکھ دس ہزار ٹن فولادان سرنگوں میں استعمال کیا گیا ہے ایک اعشاریہ تین ملین کیوبک میٹر کنکریٹ استعمال میں لائی گئی ہے اور 8 لاکھ 40 ہزار کیوبک میٹر چٹانوں میں کھدائی کی گئی ہے پاور ہاؤس کے پہلے مرحلے میں 175 میگاواٹ کی 4 ٹربائنیں کام کر رہی ہیں جو کل 700 میگاواٹ بجلی فراہم کرتی ہیں دوسری سرنگ کو بھی بجلی گھر سے ملا دیا گیا ہے اس پر بھی اب 4 ٹربائین گیارہ سو میگاواٹ بجلی پیدا کر رہی ہے دو مزید ٹربائنیں بھی 1985 سے یہاں اپنا کام کر رہی ہیں اس طرح ایک ہزار نو سو چوبیس میگاواٹ بجلی فراہم کرنے کا انتظام ہے جو پاکستان کی بجلی کی گھریلو اور صنعتی ضروریات کا نصف سے زائد حصہ پورا کر رہی ہے سروس سپل وے کے سات دروازے ہیں جن کا طول 85 اور عرض 50 ہے ان سے 392 فٹ کی بلندی سے 6 لاکھ 50 ہزار کیوسک پانی گزرنے کی گنجائش ہے یہ منصوبہ ہمیں 168 ملین ایکڑ پانی فراہم کرتا ہے اس ڈیم میں گیارہ اعشاریہ تین ملین پانی ذخیرہ کرنے کی گنجائش ہے جس میں فی الحال 9،4 ملین ایکڑ فٹ ہر سال آب پاشی اور بجلی کی پیداوار کے لیے استعمال ہو رہا ہے دریا کا پیندا دو سو ملین کیوبک یارڈ ہے جو عظیم دیوار چین جتنا ہے بجلی اور پانی کی فراہمی کا اتنا بڑا بند دنیا کی تاریخ میں بے مثال ہے۔

تربیلا ڈیم اسلام آباد سے پچاس میل کے فاصلے پر پشاور جانے والی سڑک پر لارنس پور سے ایک الگ سڑک کے ذریعے پہنچا جا سکتا ہے۔

تربیلا ڈیم شاہراہ قراقرم کی طرح پاکستان کا دوسرا بڑا عجوبہ ہے جو پاکستان کی زرعی اور صنعتی ترقیوں کا سب سے بڑا سرچشمہ ثابت ہو چکا ہے اور جس پر پاکستان جتنا فخر کرے کم ہے۔

ہماری دعا ہے کہ پاکستان کی معیشت کو تیز رفتاری ترقی پر گامزن کرنے والے یہ بند سدا قائم رہیں ایک سیاح کی نظر سے ہر پاکستانی کا فرض ہے کہ وہ اپنے ملک کی عظمت کے علمبردار اس

بند کی مادی خوبیوں اور حسن قدرت کے اس حسین نظارے کو اپنی آنکھوں سے ضرور دیکھے۔

تربیلا ڈیم پر کل اخراجات کا اندازہ پندرہ ارب روپے ہے جس میں ایک لاکھ افراد کی نقل مکانی کا معاوضہ بھی شامل ہے۔

تربیلا ڈیم سے دس ملین ایکڑ فٹ پانی آب پاشی زراعت کے لیے لیا جاسکتا ہے ایک اندازے کے مطابق گندم کی فصل کو کم وبیش جتنا پانی چاہیے اس سے تربیلا ڈیم سے فراہم کردہ پانی سے دو کروڑ ا ایکڑ گندم اگائی جاسکتی ہے اور اگر یہی پانی ٹیوب ویل کے ذریعے فراہم کیا جائے تو اخراجات کا اوسط 200 روپے فی ایکڑ ہوتا ہے اس طرح تربیلا ڈیم ہر سال دو ارب روپے کا پانی فراہم کر رہا ہے پانی کے علاوہ اس ڈیم کے بجلی گھروں سے 600 بلین یونٹ بجلی حاصل کی جاتی ہے جو 50 پیسے فی یونٹ کے حساب سے 150 کروڑ روپے سالانہ قیمت کی بنتی ہے اس طرح پانی اور بجلی کی فراہمی سے تربیلا ڈیم اب تک اپنی کل قیمت حاصل کر چکا ہے اور اگر اس بند کی عمر 75 سال قرار دی جائے تو آئندہ وصول ہونے والی بے شمار دولت مفت ہی حاصل ہوگی۔

اس وقت ہم بجلی کی مجموعی ضرورت سے کم بجلی پیدا کر رہے ہیں اس کی کمی دور کرنے کے لیے کالا باغ ڈیم کا منصوبہ بنایا گیا ہے جو تربیلا ڈیم کے خارج شدہ پانی کو اپنے یہاں جمع کرے گا اور ایک ہزار 6 سو میگاواٹ بجلی پیدا کر سکے گا۔

○

کلر کہار

چکوال سے سرگودھا جانے والی سڑک پر 26 کلومیٹر کے فاصلے پر خوبصورت وادی واقع ہے جنرل کنگھم (برطانوی عہد کے نامور ماہر آثار قدیمہ) کے بقول کلر کہار کا پرانا نام شاہ کار تھا۔ ابوظفر ندوی اپنی کتاب تاریخ سندھ میں رقم طراز ہے کہ محمد بن قاسم 712ء۔714ء سے شکست کے بعد راجہ داہر مارا گیا اور اس کی موت کے بعد اس کے بیٹے جے سنگھ نے ملتان کے مضافات میں محمد بن قاسم سے جنگ کی اور شکست کھائی وہ وہاں سے سیدھا کشمیر کی راجدھانی پہنچا اور پناہ کی درخواست کی۔ کشمیر دربار نے اس کی درخواست قبول کرتے ہوئے اسے کشمیر میں رہنے کی اجازت دے دی اور گذارہ کے لیے کشمیر کی جنوبی سرحد پر جاگیر عطاء کی جس کا صدر مقام کلر کہار تھا اس جاگیر کے انتظام وانصرام کے لیے اس نے حمیم بن سامہ شامی کو اپنا مختار کار بنا کر بھیجا۔ حمیم بن شامہ نے کلر کہار کو اپنا انتظامی مرکز بنا کر اس جاگیر کا انتظام چلایا۔ اس زمانے میں ضلع چکوال ریاست کشمیر کا حصہ تھا اور کوہستان نمک، کشمیر اور ملتان میں حد فاضل تھا۔ حمیم بن سامہ شامی نے اس کی سرحد پر چنار کے درخت لگائے اور کلر کہار میں مساجد اور حویلیاں تعمیر کروائیں۔

کلر کہار کے بارے میں ظہیر الدین بابر توزک بابری میں لکھتا ہے کہ کلر کہار پہنچنے کے پہلے مرحلے میں بھیرہ پہنچا۔ ملک ہست نے میری اطاعت قبول کرنے سے کی وجہ سے بھی اور اس لیے بھی کہ یہ علاقہ بھیرہ خوشاب چناب اور چنیوٹ پر مشتمل ہے نماز ظہر کے وقت کلاہ کنار میں جا پہنچے جس کے قریب ایک بڑا سا تالاب ہے۔ تالاب تقریباً تین میل کے رقبے میں پھیلا ہوا ہے جو بارش کے پانی سے عموماً بھرا رہتا ہے اس تالاب کے نزدیک ایک مرغزار بھی ہے اور دامن کوہ میں ایک چشمہ بھی پھوٹتا ہے یہ جگہ اور اس کا ماحول مجھے بہت پسند آیا اس لیے میں نے یہاں ایک باغ لگوایا اور اس کا نام باغ صفا رکھا۔

کلر کہار سطح سمندر سے تقریباً چار ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے ابتدائی نام شاہکار اور کلاہ کنار بھی بتایا جاتا ہے ضلع خوشاب ضلع چکوال، پنڈ دادنخان، اور تلہ گنگ کی سڑکوں کا مرکز ہے ضلع خوشاب سے 75 کلومیٹر، چکوال سے 35 کلومیٹر، چواء سیدن شاہ سے 28 کلومیٹر سون سکیسر سے 25 کلومیٹر یعنی وادی کہون، دھنی و نہار کا مرکزی علاقہ ہے کوہستان نمک، دریائے جہلم سے شروع ہوتا ہے اور دریائے سندھ پر کالا باغ تک جاتا ہے کھیوڑہ کے مقام پر اس سے نمک نکالا جاتا ہے۔

حضرت بابا فرید مسعود گنج شکر (593ھ، 611ھ) کا بھی اس علاقے سے گذر ہوا جو سیر و سیاحت، تزکیہ نفس و تبلیغ اسلام کے سلسلے میں آئے اور بعدازاں اجودھن چلے گئے تھے۔ حضرت سخی سلطان باہو 1102ء--1038ء چلہ کشی کے لیے کلر کہار کی اس پہاڑی پر آئے تھے پہاڑی سے ملحقہ مشرقی جانب چھوٹی سی کوٹھری یہاں اب بھی موجود ہے جس میں آپ نے چلہ کشی کی تھی۔

اونچی پہاڑی پر ایک مزار سخی آہو باہو بھی ہے یہ حضرت غوث عبدالقادر جیلانی کے دونوں پوتوں کا بتایا جاتا ہے جو تبلیغ دین کے سلسلے میں اس علاقے میں آئے تھے اور کٹاس نامی قصبہ میں ہندوؤں کے ہاتھوں 544ھ میں شہید ہوئے۔ کٹاس 19 کلومیٹر مشرقی جانب چواء سیدن شاہ کے قریب واقع ہے۔ محکمۂ اوقاف کی سنگ مرمر کی تختی پر عبارت کندہ ہے شہیدان بغدادی الحسنی و حسینی شہادت حضرت سید محمد یعقوب عرف فیض عالم حضرت سید محمد اسحاق عرف نور عالم ابن حضرت نور انوار سر المد پیر سید عبدالرزاق۔"

مزار آہو باہو پر خوبصورت ترین پرندہ مور ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں اور صبح و شام حاضری دیتے ہیں۔ موروں کا رقص دیدنی ہوتا ہے ان موروں کو سرکاری تحفظ بھی حاصل ہے یعنی کوئی بھی موروں کو نہیں پکڑتا وادی کلر کہار کو وادی طاؤس بھی کہا جاتا ہے جہاں آج بھی موروں کا راج ہے ملکانہ اور سونی کے باغات میں اب موروں نے ہجرت شروع کر دی ہے کیونکہ آئے دن سیاحوں کا رش لگا رہتا ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں مغلیہ دور کا پہلا باغ صفاء جو بابر نے 1529 میں یہاں لگوایا تھا بندوبست اراضی میں اس باغ کو سرکاری باغ بھی کہا گیا ہے اس کا رقبہ 111 کنال 5 مرلے ہے جس میں خوبانی، انار، لوکاٹ، کیلا آلوچہ شہتوت اور ناشپاتی کے پھلدار درخت موجود ہیں۔

یہاں تخت بابری جو بھاری چٹان تراش کر بنایا گیا تھا بابر نے اپنی فوج کو اس تخت پر کھڑے ہو کر خطاب کیا تھا یہ تخت اپنی اصلی حالت میں پولیس ریسٹ ہاؤس سے مشرقی جانب موجود ہے تخت کے ساتھ سیڑھیاں بھی ہیں جس پر چڑھ پر اردگرد کی خوبصورت وادی کا بخوبی نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ پوٹھوہار کے باسیوں کی واحد تفریح گاہ قدیم جھیل ہے جس کے کنارے اب حکومت پنجاب نے خوبصورت ٹورسٹ لاج اور ریسورنٹ تعمیر کیا ہے سینک بار، واٹر سپورٹس کی دلچسپ تفریح بھی ہے۔

خالص پہاڑی گلاب کا عرق بھی کشید کیا جاتا ہے جڑی بوٹیوں کو کشید کر کے جو عرق بھی تیار کیا جاتا ہے جو پیٹ کی بیماریوں کے لیے بے حد مفید ہے۔

باغات میں خوبصورت ریسٹ ہاؤس بھی تعمیر کئے گئے ہیں ضلع کونسل، ائیر فورس، محکمہ جنگلات اور پولیس کے دیدہ زیب ریسٹ ہاؤسز نے پہاڑی حصوں کی خوبصورتی میں اضافہ کیا ہے۔ روشنی کے شاعر سید مصطفیٰ زیدی مرحوم جب 1961 میں ڈپٹی کمشنر جہلم تھے تو ریسٹ ہاؤس کے مین گیٹ پر ''نشیمن'' کندہ کرایا تھا جو مرحوم کی شاعرانہ صلاحیتوں کی یاد دلاتا ہے۔

سابقہ فوجیوں کے علاج کے لیے 1973ء میں فوجی فاؤنڈیشن ہسپتال کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا جس کا 1975ء میں افتتاح ہوا۔ علاقے بھر کے فوجیوں کے لیے علاج گاہ کے ساتھ خوبصورت بلڈنگ اور سیرگاہ بھی ہے۔ پی اے ایف کی رہائشی کالونی بھی ہے اس سب تحصیل میں تمام بنیادی سہولتیں میسر ہیں۔ سیاحوں کی رہنمائی کے لیے ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی سابق ڈپٹی کمشنر چکوال نے یہاں سنگ مرمر کی تختیاں بھی نصب کرائی تھیں۔

کلر کہار فوجی اور دفاعی نقطۂ نگاہ سے بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے زیادہ تر افراد پاک فوج میں ملازمت کرتے ہیں۔ ملک کے مختلف حصوں سے آنے والے سیاح حضرات بہار کے موسم میں کئی کئی دن یہاں قیام کرتے ہیں تعطیلات کے دوران بھی یہاں کافی رونق اور گہما گہمی ہوتی ہے۔

کلر کہار ایک بے نظیر پہاڑی خطہ ہے جو حساس دلوں کے لیے تسکین بھی ہے اس کے مناظر تصویروں کی طرح خوبصورت ہیں جبکہ جھیل کے شفاف پانی میں پہاڑوں کا عکس صاف دکھائی دیتا ہے۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ قدرتی ٹھنڈے میٹھے چشمے، لوکاٹ اور جنگلی جڑی بوٹیوں کی خوشبوؤں کی دھرتی میں اصلی گلاب کا عرق، قلاقند اور چوعرقہ کی تیاری علاقائی پروڈکشن ہے گلاب کا عرق ملک کے دوردراز علاقوں کو سپلائی کیا جاتا ہے۔

موٹروے کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر وطن عزیز کے دوردراز کے شہروں سے فوٹوگرافی کے شائقین بھی بڑی تعداد میں یہاں کا رخ کرتے ہیں۔ بیرونی سیاحوں کے طے شدہ پروگرام کے مطابق سال بھر آمدورفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے تاریخی نقطۂ نگاہ سے بھی یہ قدیمی گذرگاہ ہے۔

قلعہ سرقند قلعہ ملوٹ اور کٹاس راج مرکزی قصبہ ہے مختلف پہاڑوں کی رنگ۔ برنگی قیمتی مٹی و معدنیات قدرتی نعمتوں کی عکاس ہے۔ کلر کہار، واقعتاً خوبصورت نظاروں سے بھرپور قدرت کا ایک انمول شاہکار ہے۔

حکومت پنجاب، مستقبل قریب میں یہاں ایک عجائب گھر کے قیام کے منصوبے پر بھی عمل درآمد کر رہی ہے جس میں اس علاقے کی تاریخ، تہذیب وثقافت اور روایتی اشیاء کے بیش قیمت نادر نمونے اور تصاویر آویزاں کی جائیں گی۔

○

کان نمک کھیوڑہ

پاکستان کو قدرت نے بیش بہا نعمتوں سے مالا مال کیا ہے جہاں جھیلیں، دریا، پہاڑ، زرخیز میدان، وسیع صحرا، کھلا سمندر اور متنوع موسم اس کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں وہاں زیرزمین معدنیات کی دولت اس کی قدر وقیمت میں اضافے کا باعث ہے قدرتی گیس، تیل، کوئلہ، لوہا، کرومائیٹ جپسم، گندھک اور نمک کے معدنی ذخائر کی اس قدر مقدار موجود ہے کہ اگر انہیں کسی منظم انداز اور جدید سائنسی آلات سے حاصل کیا جائے تو یہ ملک دولت مند ملکوں کی فہرست میں شامل ہو جائے میانوالی کوہاٹ وغیرہ سے بھی خوردنی نمک نکالا جارہا ہے تاہم کھیوڑہ کی کانیں سب سے پرانی اور پیداوار کے اعتبار سے پہلے نمبر پر ہیں یہاں سے حاصل ہونے والا نمک نہ صرف ملکی ضروریات پورا کررہا ہے بلکہ اس کی بیرون ملک برآمدگی سے زرمبادلہ بھی کمایا جارہا ہے نمک کی دوائی اور غذائی اہمیت مسلمہ ہے لیکن اس سے بے شمار صنعتیں بھی منسلک ہیں جن میں کپڑا رنگنے، چمڑہ صاف کرنے کاسٹک سوڈے کی تیاری وغیرہ کی صنعتیں شامل ہیں۔ کھیوڑہ، راولپنڈی سے 120 کلومیٹر چکوال سے 30 کلومیٹر اور پنڈ دادنخان سے پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے یوں تو یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے لیکن نمک کی کانوں کی وجہ سے خصوصی اہمیت اور شہرت کا حامل ہے سکولوں کالجوں کے طلبہ کے علاوہ سیاحوں کی بڑی تعداد ہر سال یہاں کی سیر کو آتے ہیں اور اس انمول خزانے اور کانوں کی بھول بھلیوں سے محظوظ ہوتے ہیں۔

کھیوڑہ کے پہاڑی علاقے میں سڑکوں کے علاوہ ریل کی سہولت بھی موجود ہے رہائشی علاقے میں انگریزی طرز تعمیر کی عمارات زیادہ دیکھنے کو ملتی ہیں کیونکہ برطانوی عہد میں نمک کی نکاسی کو زیادہ بہتر انداز میں اور منظم پیمانے پر شروع کیا گیا تھا گو لوگ صدیوں سے یہاں سے نمک نکال رہے ہیں اور کھیوڑہ کے باسیوں کے ذریعہ معاش نمک کی فروخت ہی تھا کھیوڑہ کے قرب و جوار میں بھی لوگ مختلف جگہوں سے نمک نکالتے چلے آرہے ہیں اس وقت بھی خوشاب وغیرہ میں

پندرہ کمپنیاں نجی شعبے میں نمک نکالنے میں مصروف ہیں چند سال پیشتر نجی شعبے میں نمک کی نکاسی پر ایکسائز ڈیوٹی عائد تھی لیکن نجکاری پروگرام کے تحت یہ ڈیوٹی اب ختم ہو چکی ہے۔

1876ء میں انگریز حکومت نے کان کن افراد کو اردگرد سے جمع کر کے کھیوڑہ میں لا بسایا اور کھیوڑہ کے علاوہ باقی ساری کانوں سے نمک کی نکاسی کا کام بند کر دیا گیا تھا جسے اب پاکستان منرل ڈوپلیمنٹ کارپوریشن نے دوبارہ شروع کیا ہے انگریز دور میں یہاں کافی کام ہوا اور علاقے کی فلاح و بہبود کی طرف بھی خصوصی توجہ دی گئی۔ چک نظام جہلم کے مقام پر 1886ء میں ایک ریلوے پل تعمیر کر کے علاقے کو ملکوال سے ریل کے ذریعے ملا دیا گیا اس سے کاریگروں کو گاڑیوں کے ذریعے نمک کی باربرداری کی صعوبتوں سے چھٹکارا مل گیا۔ ریل گاڑی کی آمد کھیوڑہ کے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی اس لیے 1890ء تک یہاں کا نمک پورے برصغیر میں پھیل گیا تھا۔ انگریزوں نے جہاں علاقے کی معدنی دولت سے فائدہ اٹھایا وہیں اس کی بہتری کے لیے بھی خاصا کام کیا کان کنوں کی حفاظت اور مزدوروں کے تحفظ کے لیے متعدد اقدامات کیے گئے۔ کھیوڑہ شہر میں داخل ہوں تو عین سامنے نمک کے پہاڑ خوش آمدید کہتے ہیں ایک جانب رہائشی علاقہ ہے جہاں سکول کالج پوسٹ آفس ریسٹ ہاؤس اور پاکستان معدنیاتی ترقیاتی کارپوریشن پی ایم ڈی سی کے دفاتر ہیں کھیوڑہ کا بڑا بازار گول بازار ہے یہاں ایک گرجا گھر کے علاوہ انگریزی دور کی عمارتیں ہیں بازار کے قریب ایک پہاڑی پر چھوٹا سا مندر ہے جسے ہنومان مندر کہتے ہیں بازار سے ضروریات زندگی کی تمام اشیاء باآسانی خریدی جا سکتی ہیں مائننگ یا کان کنی کے علاقے میں داخل ہوں تو استقبالیہ سے ٹکٹ اور داخلہ پاس حاصل کرنے پڑتے ہیں سیاحوں کی رہنمائی کے لیے ایک گائیڈ بھی ہمراہ ہوتا ہے سب سے پہلے ورکنگ ایریا آتا ہے یہاں بہت سے پائپ اور کام کرتی مشینیں نظر آتی ہیں ان پائپوں کے ذریعے کانوں کے اندر جمع ہونے والا پانی نکالا جاتا ہے جسے ایک ملٹی نیشنل کمپنی مفت ہی حاصل کرتی ہے کانوں سے حاصل ہونے والا یہ نمکین پانی دراصل کئی کیمیائی اجزا سے پر ہوتا ہے اس پانی کو برائن سلوشن کہتے ہیں جس سے کپڑے دھونے والے سوڈے سمیت متعدد کیمیائی اشیاء تیار کی جاتی ہیں اس کمپنی نے کھیوڑہ میں باقاعدہ ایک یارڈ بنا رکھا ہے یہاں سے یہ محلول کمپنی کے کارخانوں میں پہنچتا ہے جس سے مزید محلول تیار کر کے بہت مہنگے داموں فروخت کیا جاتا ہے یہ کمپنی نمک کی بھی سب سے بڑی خریدار ہے جو کھیوڑہ کا تین چوتھائی کے لگ بھگ نمک خرید لیتی ہے جبکہ سالانہ دو سے تین ٹن پانی بغیر کسی قیمت کے حاصل کر کے بے

انتہا دولت کماتی ہے۔

کھیوڑہ کی کانوں کے متعلق خیال ہے کہ یہ صدیوں سے انسانی ضروریات پوری کر رہی ہیں ان کی دریافت کے متعلق مشہور ہے کہ سکندر اعظم جب اس علاقے میں پہنچا تو اس نے پہاڑوں میں ڈیرہ جمالیا تو ایک عجیب چیز دیکھنے کو ملی کہ گھوڑے یہاں پتھر شوق سے کھاتے دیکھے گئے ہیں جس سے پتہ چلا کہ یہ پتھر دراصل نمک ہے چنانچہ آج تک یہاں سے نمک کی نکاسی کا سلسلہ جاری وساری ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہاں اتنا نمک موجود ہے جسے ایک ہزار سال بھی نکالا جائے تو کمی نہیں آئے گی اندازہ ہے کہ ان کانوں میں 1500 فٹ کی گہرائی تک نمک موجود ہے۔

برصغیر میں مغلیہ دور سے قبل ہی کوہستان نمک کی دریافت ہو چکی تھی اس کا تذکرہ آئین اکبری میں بھی ملتا ہے دریائے جہلم کے دائیں کنارے سے مغرب میں کوہ سلیمان تک پھیلے ہوئے پاکستان کے وسیع ذخائر دنیا کے بڑے ذخیروں میں شامل ہوتے ہیں نمک کی یہ کانیں وار چھا، ضلع خوشاب، کالا باغ، ضلع میانوالی، اور بہادر خیل، ضلع کوہاٹ تک کے طویل رقبے پر محیط ہیں اس طرح کچھ علاقے ایسے بھی ہیں جہاں سے نمک کم نکالا جا رہا ہے جبکہ بعض جگہوں پر ابھی نکاسی شروع ہی نہیں ہوئی ان تمام علاقوں میں نمک کی کل مقدار اندازاً 534 ملین ٹن سے زائد ہے تاہم ان سب ذخائر سے کھیوڑہ کی اہمیت بہت زیادہ ہے کیونکہ یہاں سے حاصل ہونے والا نمک 98 فیصد خالص ہے رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑی اور پیداوار کے اعتبار سے دنیا میں دوسرے نمبر پر ہے۔

کانوں سے نمک بڑے سائنسی انداز سے نکالا جاتا ہے جس میں مہارت کے ساتھ تکنیک کو بروئے کار لایا جاتا ہے نمک کی نکاسی کے لیے ایسا نہیں کہ پہاڑ کے اندر گئے اور نمک کوٹ کوٹ کر نکالتے گئے بلکہ اس طرح نہ صرف کان بے کار ہو سکتی ہے بلکہ کان کنوں کی زندگی بھی غیر محفوظ ہو گی اس لیے کانوں میں کام کے لیے مختلف منزلیں ہیں چار منزلیں زمین کی طرح سے اوپر اور گیارہ منزلیں اس سطح سے نیچے ہیں گویا کان میں بیک وقت 16 مقامات پر نمک کی نکاسی کی جاتی ہے ہر سرنگ سے 50,40 فٹ نمک نکالنے کے بعد اتنا نمک چھوڑ دیا جاتا ہے جو پہاڑ میں ستونوں کا کام کرتے ہیں یوں پورے پہاڑ میں نمک نکالنے کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے سرنگوں پر سرنگیں اور ستونوں پر ستون ہیں یوں ہر کان خاص محفوظ ہو چکی ہے سیاحوں کو پوری کانوں کی سیر کی اجازت نہیں سیر کے لیے 2.5 میل کا رقبہ مختص ہے۔ سیر کے لیے تقریباً 80 ہال

کرے جو نمک نکالنے سے وجود میں آچکے ہیں جب کہ راھداریوں کے اردگرد کہیں کہیں پانی کے تالاب ہیں ان کی تعداد 60,70 کے لگ بھگ ہے یہ تالاب 35 سے 80 فٹ تک گہرے ہیں پہاڑ سے رس رس کر اندر آنے والے پانی سے وجود میں آنے والے یہ تالاب دیکھنے میں تو خاصے ہیبت ناک ہیں لیکن ان میں گرنے والا ڈوبتا نہیں کیونکہ نمک کے مسلسل گھلاؤں سے ان میں حل پذیری ناممکن ہو چکی ہے اور اگر کوئی شخص خدانخواستہ اس میں گر جائے تو اسے تگ و دو سے بچایا جاسکتا ہے ٹورسٹ ایریا کے آخر میں سب سے بڑا تالاب ہے جس کی لمبائی 220 فٹ چوڑائی 70 فٹ اور گہرائی 80 فٹ ہے اسے بحرالکاہل کا نام دیا گیا ہے یہی نمکین پانی پائپوں کے ذریعے باہر نکالا جاتا ہے جو مختلف صنعتوں کے لیے اکسیر کی حیثیت رکھتا ہے کانوں سے نمک نکالنے کا کان کن نسل در نسل سے کرتے چلے آرہے ہیں کان کن وارثت میں اپنی اولاد کے لیے زمین جائیداد نہیں بلکہ ایک پاس بک چھوڑتے ہیں جس کے پاس یہ سرکاری کتاب موجود ہو وہی یہاں کام کرنے کا حق رکھتا ہے اسے حکومت کی جانب سے بجلی پانی گیس اور تمام تر طبی سہولتیں حاصل ہوتی ہیں اور وہ سرکاری ملازم تصور ہوتا ہے اس وقت یہاں 685 سے زائد افراد رجسٹرڈ کان کن ہیں اور کانوں میں کام کا اختیار انہیں کو حاصل ہے یہ کان کن اپنی مرضی اور صوابدید پر ایک معاون مزدور رکھ سکتے ہیں اور اس کا تعلق ضروری نہیں کہ کھیوڑہ ہی سے ہو رجسٹرڈ کان کنوں سے متعلق یہ شکایت بھی سننے میں آتی ہے کہ وہ معاون مزدوروں کا استحصال کرتے ہیں اور اپنی پاس بک کی بدولت دوہرا مفاد حاصل کرتے ہیں ان مزدوروں کو نمک تراشی کے تین روپے فی من کے حساب سے مزدوری دی جاتی ہے ایک مزدور روزانہ اوسطاً ایک بوگی 40 من نمک کاٹنے کی اہلیت رکھتا ہے یوں اس قدر مشکل اور جان جوکھوں کے بعد اس کے حصے میں 120 روپے آتے ہیں نمک کاٹنے کے لیے ہتھوڑے استعمال نہیں کیے جاتے بلکہ پتھر کے اندر ہمبر پوائنٹ یا برمانما سلاخ سے سوراخ کیا جاتا ہے جب سوراخ چار سوفٹ سے زیادہ گہرا ہو جائے تو اس میں بارود بھر دیا جاتا ہے اور پھر بہت احتیاط سے بارود کو آگ دکھائی جاتی ہے جس کے بعد پتھر کے ان بڑے بڑے سخت ٹکڑوں کو مزید کاٹ کر چھوٹا کیا جاتا ہے نمک کو کان سے باہر لانے کے لیے گراؤنڈ لیول پر برقی ریل گاڑی موجود ہے جب کہ زیرزمین کانوں میں اور بالائی منزلوں میں نمک کاٹ کاٹ کر گدھوں کے ذریعے ایک جگہ جمع کر لیا جاتا ہے جہاں سے لفٹ کے ذریعے اسے اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر لایا جاتا ہے یہ خاصا پرانا نظام ہے اس لیے اس پر وقت زیادہ صرف ہوتا ہے اور کام کی رفتار سست

رہتی ہے اوراس سائنسی دور میں اس قدر فرسودہ نظام پر عمل یقیناً صحت مند رجحان نہیں 1872ء میں انگریز حکومت نے جو طریقے رائج کیے یا اصول بنائے وہ کسی نہ کسی صورت میں آج بھی یہاں موجود ہیں مثلاً انگریز نے ایک پابندی کھیوڑہ کے رہنے والوں پر یہ عائد کی وہ نمک خرید کر استعمال کریں چنانچہ یہ روایت اب تک بھی قائم ہے اور کان کن نمک کی فراوانی ہونے کے باوجود نمک لینے کسی دوکان کا رخ کرتے ہیں جانے یہ پابندی کس منطق کے تحت عائد کی گئی کھیوڑہ کی کانیں خاص محفوظ تصور کی جاتی ہیں اندرونی نظام کو بھی بڑی حد تک محفوظ بنایا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں سیاحوں کی آمد پر پابندی نہیں تاہم غیر ملکی سیاحوں کو پہلے ہیڈ آفس سے خصوصی اجازت لینا پڑتی ہے۔

یوں تو مزدوران کانوں میں 24 گھنٹے کام کرتے ہیں جس کے لیے تین شفٹیں بنائی گئی ہیں تاہم سیاحت کے لیے صبح دس بجے سے ڈھائی بجے تک کا وقت مقرر ہے اس طرح جمعہ کو چھٹی کی وجہ سے کانوں کی سیر نہیں کرائی جاتی سیاحوں کی معلومات میں کچھ اضافے کے لیے ایک گائیڈ ہمراہ ہوتا ہے جو ڈیڑھ گھنٹہ کی سیر میں 3500 فٹ تک لوگوں کو گھماتا ہے اور کان کے متعلق معلومات فراہم کرتا ہے کان کی سیر کے لیے معمولی ٹکٹ بھی رکھا گیا ہے سیر کے لیے کان میں داخل ہوں تو خود کو ایک لمبی سی سرنگ میں موجود پائیں گے جو مسلسل نیچے ہی نیچے چلی جاتی ہے سر پر بلبوں کی ایک لمبی قطار مدہم روشنی بکھیرتی ہے یہاں احتیاط سے چلنا پڑتا ہے اور گائیڈ بار بار متنبہ کرتا ہے کہ بجلی کی تاروں کو ہاتھ مت لگائیں کیونکہ تاریں ننگی ہیں ان کی مدد سے نمک لانے والی ٹرام چلتی ہے سرنگ کا اختتام ایک کشارہ راستے پر ہوتا ہے یہ محفوظ راہداری ہے چھت کو سہارا دینے کے لیے لکڑی کی ڈاٹ سے کام لیا گیا ہے جبکہ راستہ کچا ہے وسط میں ٹرام کی پٹڑی ہے یہ دورویہ ہے اور اس پر چلنے سے بھی منع کیا جاتا ہے قدیم کوئلے کے انجن کی یادگار بھی چھتوں پر دھوائیں کی صورت میں موجود ہے۔ روزانہ سینکڑوں سیاح کان نمک کی سیر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یکم فروری 1992ء کو یہاں فلم زباٹا کی شوٹنگ بھی ہوئی تھی۔ کان میں تازہ ہوا کی آمدورفت کا بھی بندوبست ہے یہاں ہر وقت 17.50 فیصد آکسیجن موجود رہتی ہے بارش کا پانی انہیں ہوا کے سوراخوں سے اندر آتا ہے کانوں سے روزانہ 27 ہزار ٹن کے حساب سے نمک نکالا جاتا ہے۔

○

اچھالی جھیل

وادی سون شمال وسطی پنجاب کا ایک تاریخی علاقہ ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انسانی ارتقاء کے چند مراحل کا آغاز یہاں ہی ہوا اچالی اور دھدادو گاؤں کے درمیان کوہستان نمک کی اونچی نیچی پہاڑیوں کی بکل میں الگ تین جھیلیں اچالی، کھبکی اور جھلر واقع ہیں جو اچالی کمپلیکس کے نام سے معروف ہیں۔ سائبیریا سے ہجرت کر کے آنے والے مہمان پرندے قراقرم اور ہندو کش کے اوپر سے پرواز کر کے (گرین روٹ) سے موسم سرما گذارنے کے لیے یہاں آتے ہیں۔

جھیلوں میں پانی کی مقدار اور جھیلوں کا رقبہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے علاقے میں بارش کم ہو تو جھیل کا رقبہ خطرناک حد تک کم ہو جاتا ہے اور لوگ وہاں کھیتی باڑی شروع کر دیتے ہیں جھیلوں کے آس پاس کے علاقے میں بھی کھیتی باڑی ہوتی ہے کسی زمانے میں یہاں جنگلی کیکر ہوا کرتے تھے مگر اب انہیں کاٹ کر اراضی کو قابل کاشت بنالیا گیا ہے اور اب یہاں سفیدہ یا پاپولر نظر آتے ہیں۔

کوہستان نمک سے پہاڑی نالے بارشوں کا پانی جھیلوں میں لاتے ہیں اور ایک چھوٹا سا چشمہ انہیں سیراب کرتا ہے علاقے میں 300 ملی میٹر سے 800 ملی میٹر بارش ریکارڈ کی گئی ہے خشک موسم میں جھیلوں کی گہرائی آدھ میٹر سے بھی کم رہ جاتی ہے جبکہ برسات میں یہاں زیادہ سے زیادہ 6 میٹر تک پانی ہوتا ہے جھیلوں کا پانی قدرتی طور پر کھارا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ یہ جلد کی کئی بیماریوں کے لیے شافی ہے۔

وائلڈ لائف اپیل پر سب سے پہلے 1966ء میں اچھالی کمپلیکس کو جنگلی حیات کے لیے محفوظ قرار دیا گیا۔ 1976ء میں جب پاکستان نے رامسر کنونشن میں شمولیت اختیار کی تو ہجرت کر کے آنے والے نایاب پرندوں کی آماجگاہ ہونے کی وجہ سے اچالی کمپلیکس کو رامسر بین الاقوامی آبگاہ کا درجہ دے دیا گیا۔ یوں اچالی کمپلیکس پنجاب کی قدرتی جھیلوں میں سے پہلی آبگاہ ہے جسے

رامسر آب گاہ کا درجہ اور بین الاقوامی شہرت ملی اور یہ رامسر سائٹس نمبر 818 ہے رامسر آب گاہوں میں شامل پنجاب کے دیگر آبی ذخائر قدرتی نہیں بلکہ دریا پر بیراج بننے کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آئے ہیں۔ رامسر آب گاہ کا درجہ ملنے کے بعد اچھالی کمپلیکس میں متعدد تحقیقاتی منصوبے شروع کیے جاچکے ہیں۔

شمال سے ہجرت کر کے آنے والے مہمان پرندوں میں سب سے اہم سفید سر والی خوبصورت بطخیں ہیں جو دنیا میں ختم ہونے کو ہیں اس کے علاوہ لم ڈھینگ سارس، چتکبرا فار، سفید آنکھ والی مرغابی خاکستری رنگ کے گدوہ اور شاہی عقاب بھی اس علاقے میں پائے جاتے ہیں پرندوں کے علاوہ مچھلیوں میں مچھلیاں بھی پائی جاتی ہیں لیکن 1982ء میں ان مچھلیوں میں فارس مچھلیاں خاص طور پر Carp Tilpia چھوڑ دی گئی ہیں اور تجارتی بنیادوں پر ماہی گیری ہو رہی ہے۔ مچھلیوں کے اردگرد کوہستان نمک کے پہاڑ عام طور پر ننگے ہیں کہیں کہیں پھلائی، سنتھا، کرگدہ اور ٹپائی وغیرہ کے درخت ملتے ہیں جنہیں کاٹ کاٹ کر لوگ جلانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

اچھالی اور دھدرد دیہاتوں کے لوگوں کی یہ خواہش ہے کہ اچھالی کمپلیکس کو ترقی دے کر سیاحتی مقام بنا دیا جائے تا کہ علاقے میں ترقی ہو اور یہاں کے لوگوں کو اس سے فائدہ حاصل ہو اسکول بنیں اور سڑکیں تعمیر ہوں جیسا کہ کوہستان نمک کی دوسری قدرتی جھیل کلر کہار کو فروغ دینے کے لیے منصوبے فروغ دیئے گئے۔

تحریر: ایس اے جے شیرازی

NCS جریدہ۔ اکتوبر، نومبر، دسمبر 2000ء

○

چن جی نیشنل پارک، چکوال

اپنی نوعیت کے لحاظ سے پاکستان کا سب سے منفرد نیشنل پارک چن جی نیشنل پارک ہے۔6000ہیکٹرز سے زائد رقبے پر پھیلا ہوا چن جی نیشنل پارک ضلع چکوال میں تلہ گنگ سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر سلسلۂ کوہ نمک کے بالکل درمیان میں واقع ہے یہ پورا علاقہ خشک اور بنجر پہاڑیوں پر مشتمل ہے اسے جولائی 1987ء میں نیشنل پارک کا درجہ دیا گیا اس سلسلۂ کوہ کو نیشنل پارک قرار دینے کا مقصد یہ تھا کہ یہاں کے پہاڑوں میں انسانی ارتقاء کی پوری رکاز یعنی Fossils یا منگوارہ کی شکل میں موجود ہے اسے محفوظ کیا جانا چاہیے۔ ارضیاتی تحقیق کے لحاظ سے ان رکاز کی غیر معمولی اہمیت ہے۔ چن جی نیشنل پارک کے پہاڑوں میں زمانہ ماقبل تاریخ کے انسان کے متحجر ڈھانچوں کے علاوہ انسانوں کے ارتقائی ادوار، بن مانس، اور ایپ بندر کے متحجر ڈھانچے موجود ہیں اس دور میں جو دیگر جانور زرافہ گینڈے وغیرہ اور نباتات پائی جاتی تھیں ان کے بھی رکاز دستیاب ہوئے ہیں۔ چن جی نیشنل پارک تک پہنچنا کچھ زیادہ مشکل کام نہیں ہے دنیا بھر میں جتنے بھی نیشنل پارکس ہیں ان میں سے چن جی نیشنل پارک بلاشبہ منفرد ترین ہے۔

NCS جریدہ

○

تونسہ بیراج

تونسہ بیراج بنیادی طور پر آبپاشی کے لیے بنایا گیا ہے بیراج کی اوپر کی جانب پانچ عدد مٹی کے بند ہوئے ہیں ان بندوں کی وجہ سے 16,576 ایکڑ رقبے میں پانی کا ذخیرہ جمع ہوگیا ہے جس میں مختلف اقسام کی آبی حیات آباد ہو چکی ہے صرف 1987ء کے موسم سرما میں تونسہ بیراج پر 24,000 مختلف اقسام کے پرندے شمار کیے گئے تھے۔

دریاؤں پر بیراج بننے کے نتیجے میں قائم ہونے والے سب ہی آبی ذخائر کم و بیش ایک جیسے ہی ہیں ان میں پانی کی گہرائی کا دارومدار دریا میں پانی کی مقدار پر ہوتا ہے دریائے سندھ جب کنارے کنارے بہتا ہے تو تونسہ کے آبی ذخیرے میں 5 میٹر تک پانی ہوتا ہے موسم سرما میں یہ پانی ایک میٹر سے بھی کم ہو جاتا ہے۔

تونسہ بیراج کے اردگرد کی زمین زرخیز ہے اور یہاں کپاس، گندم اور گنا وغیرہ کاشت ہوتا ہے دریائے سندھ کے کنارے خودرو جھاڑیوں میں پلچھی کی تعداد زیادہ ہے اگرچہ زیرکاشت رقبے پر درختوں کی نئی نسلیں متعارف ہو چکی ہیں۔

رامسر آب گاہ کا درجہ حاصل ہونے کے بعد تونسہ بیراج آبی حیات پر تحقیق کا اہم مراکز بن چکا ہے 1983ء سے لے کر اب تک باقاعدگی سے پرندوں کے شمار کے علاوہ ''ڈولفن منصوبے'' پر محکمہ ماہی پروری پنجاب اور زوویوجیکل سروے کے مشترکہ کام قابل قدر ہے۔ ہجرت کر کے آنے والے بگلوں کے لیے تحقیقی سینٹر کے تونسہ بیراج پر قیام کی تجویز بھی زیرغور ہے اور محکمہ جنگلی حیات پنجاب میں جنگلی حیات کے لیے یہاں مصنوعی گھونسلے بنانے پر بھی غور ہو رہا ہے تا کہ مہمان آبی پرندوں کو زیادہ محفوظ اور پرسکون ماحول میسر آسکے اور ان کی آبادی میں خاطر خواہ اضافہ ہو۔

پنجاب میں واقع رسول قادر آباد، چشمہ بیراج، اور السلام ہیڈ ورکس کی طرح تونسہ بیراج رامسر آب گاہ میں بھی بڑے پیمانے پر ماہی پروری کا آغاز ہو چکا ہے جس سے ہر سال کروڑوں روپے حاصل کیے جا رہے ہیں۔ چولستانی ہرن Hog Deer ابھی تک اس علاقے میں موجود ہے۔

تونسہ بیراج کا رامسر سائٹ نمبر 817 ہے۔

○

نمل جھیل، میانوالی

راولپنڈی میانوالی روڈ پر میانوالی شہر سے تقریباً 30 کلومیٹر کے فاصلے پر پہاڑیوں کے دامن میں ایک نہایت ہی خوبصورت جھیل ہے جسے نمل جھیل کہتے ہیں یہ جھیل فرنگی عہد میں 1913ء میں بنائی گئی۔ جھیل سے پہلے بھی یہاں کی زمین بے حد زرخیز اور سرسبز تھی۔ لوگ یہاں پر کاشتکاری کیا کرتے تھے۔ اس وقت اس علاقہ میں کنوؤں کی تعداد لگ بھگ سو کے قریب تھی۔ یہ علاقہ جو وادی نمل کے نام سے جانا جاتا ہے کئی صدیوں سے آباد چلا آ رہا ہے اس حقیقت کا پتہ جھیل کے کنارے واقع قدیم قبرستان سے بھی ملتا ہے اس سلسلے میں ایک دلچسپ روایت بھی مشہور ہے فرنگی عہد سے قبل جب پنجاب پر سکھوں کی حکومت تھی اس علاقے کا فرمانارا راجہ سرکپ ہوا کرتا تھا جو اپنے وقت کا عیاش اور سخت گیر حاکم تھا کہا جاتا ہے کہ ان پہاڑیوں پر اس نے اپنی ایک محل نما حویلی بنا رکھی تھی جس میں وہ جوا کھیلا کرتا تھا۔ اس کی یہ شرط تھی کہ جو کوئی اسے شکست دے گا وہ اسے اس علاقے کا حکمران بنا دے گا لیکن جو اس سے بازی ہار جائے گا اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ چنانچہ اس نے اس دوران سینکڑوں لوگوں کے سر قلم کیے بالآخر سیالکوٹ کے راجہ نے یہ معرکہ سر کر لیا۔ اس نے راجہ سرکپ کو ہرا کر بازی جیت لی۔ اور اس کے نتیجے میں راجہ سرکپ نے اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی اس سے کر دی اور یوں وہ اس تمام علاقے کا مالک وخود مختار ٹھہرا۔

نمل جھیل 1200 ایکڑ پر مشتمل وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی ہے اس کی گہرائی تقریباً 20 بیس فٹ ہے پہاڑوں سے آبی چشموں اور برساتی نالہ کے ذریعے آنے والا پانی جب یہاں پہنچتا ہے تو نمل کے کشادہ بازوا سے اپنے دامن میں سمیٹ لیتے ہیں جھیل کا یہ پانی میانوالی شہر اور اس سے ملحقہ دیہات کو سیراب کرتا ہے اس مقصد کے لیے پہاڑوں کے درمیان ایک چھوٹا سا ڈیم تعمیر کیا گیا ہے جب جھیل کا پانی ڈیم کے آہنی دروازوں میں سے ہوتا ہوا دوسری طرف نالے میں آبشار کی صورت میں گرتا ہے تو اس سے خوفناک آواز پیدا ہوتی ہے۔ کنارے پر اللہ کے ایک برگزیدہ بندے

حضرت حافظ جی کا مزار ہے 6-7 شعبان کو حافظ جی کا عرس ہوتا ہے سالانہ عرس کے علاوہ ماہ محرم کی ساتویں اور آٹھویں تاریخوں کو بھی دور دراز سے لوگ جوق در جوق یہاں آتے ہیں اور اس مزار پر حاضری دیتے ہیں اس موقع پر یہاں میلے کا سا سماں ہوتا ہے عقیدت مندوں کی غیر معمولی تعداد کے پیش نظر یہاں پر عارضی دکانیں بن جاتی ہیں مزار سے ملحقہ ایک مسجد بھی ہے جس میں آج بھی قال اللہ اور قال الرسول کی صدائے دلنشین سنائی دیتی ہے 1984ء سے مزار کا انتظام محکمہ اوقاف نے سنبھال رکھا ہے۔

مزار حافظ کے قریب ایک ریسٹ ہاؤس بھی بنایا گیا ہے جو دو کمروں لان اور خوبصورت صحن پر مشتمل ہے یہاں سے جھیل کا منظر آنکھوں کو بھلا لگتا ہے۔

مزار کی جانب آبادی خانقاہ حافظ جی کے نام سے موسوم ہے جبکہ دوسری طرف کی آبادی نمل گاؤں کے نام سے موسوم ہے یہ لوگ کشتیوں کے ذریعے اس جھیل کو عبور کرتے ہیں۔ کشتیوں کے علاوہ ان لوگوں کے لیے کوئی ذریعہ آمدروفت نہیں ہے۔

نمل جھیل میں ایک فش فارم بھی بنایا گیا ہے جس کا باقاعدہ ٹھیکہ دیا جاتا ہے اس کا انتظام ضلع کونسل میانوالی کے سپرد ہے یہاں مچھلیوں کا قابل ذکر ذخیرہ موجود ہے لوگ یہاں پر مچھلیاں پکڑتے ہیں۔

مچھلی کے علاوہ جھیل میں مرغابیوں کا شکار بھی ہوتا ہے سابق صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مرحوم، سابق گورنر مغربی پاکستان نواب امیر محمد خان مرحوم اور دیگر اعلیٰ شخصیات یہاں شکار کرنے اور تفریح کی غرض سے آتی رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میانوالی، خوشاب، تلہ گنگ، چکوال اور دیگر ملحقہ شہروں کے لیے یہ جھیل ایک خوبصورت اور بے مثال تفریحی مقام کا درجہ رکھتی ہے ہر جمعہ کو یہاں پر لوگ اپنے اہل خانہ کے ساتھ پکنک منانے اور ان قدرتی اور حسین مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے یہاں کھچے چلے آتے ہیں۔ متذکرہ بارانی علاقوں، خشک اور بے مزہ ماحول میں رہنے والوں کے لیے نمل جھیل سے بہتر کوئی تفریحی مقام نہیں ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ اس جھیل کے انتظام و انصرام سے متعلقہ محکمہ کے ارباب بست کشاد اسے مزید خوبصورت حسین اور دلکش بنانے کے لیے خصوصی توجہ دیں تاکہ یہاں آنے والے لوگوں کو کسی تکلیف، الجھن اور پریشانی وغیرہ کا سامنا نہ کرنا پڑے اور وہ بھرپور طریقے سے ان مناظر سے لطف اندوز ہوں۔

ہفتہ روزہ ''پاک جمہوریت'' ۔ تحریر: الیس انور خان

○

فورٹ منرو، ڈیرہ غازی خان

ملتان اور اس کا نواح سخت گرمی کے حوالے سے ملک بھر میں مشہور ہیں جون جولائی کے مہینوں میں یہاں کے باسی 50 ڈگری درجہ حرارت سے لطف اندوز ہوتے ہیں یہاں پڑنے والی اس قدر شدید گرمی نہ صرف ملک بھر میں بلکہ دنیا بھر میں لذیذ اور خوش ذائقہ آموں کی فراہمی کا سبب بنتی ہے پنجاب کے پرفضا مقام مری سے 700 کلومیٹر دوری پر ہونے کی وجہ سے یہاں بسنے والے گرمیوں میں ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکوں کا تصور بھی نہیں کر سکتے پرفضا اور سرد مقامات پر جانا پاکستان میں ہر شخص کے بس کا روگ نہیں اس لیے یہاں کے باسی صرف مری کے قصے سن کر ہی دل بہلاتے ہیں یہاں رہنے والوں کی اکثریت کو یہ علم ہی نہیں کہ ان کے قریب ہی صرف سوا سو کلومیٹر کے فاصلے پر ایک دوسرا مری موجود ہے مری کی بلندی جتنا بلند فورٹ منرو سہولتوں اور رونق کے اعتبار سے مری کا مقابلہ نہیں کر سکتا لیکن حُسن و دلکشی اور قدرتی نظاروں میں وہ کسی سے کم نہیں فورٹ منرو جانا اس کے قریب بسنے والوں کی استطاعت میں ہے اور آسان بھی لیکن افسوس کہ لوگ ابھی تک اس تفریحی مقام کے بارے میں مکمل معلومات نہیں رکھتے فورٹ منرو جو تاریخ میں بھی ایک مقام رکھتا ہے آج بھی کسی ایسے مہربان کا منتظر ہے جو آکر اس کی حالت سنوارے اور اسے جنوبی پنجاب کے لیے مری بنا دے۔ اس خوبصورت مقام تک پہنچنے کے لیے ڈیرہ غازی خان سے لورالائی کی طرف سفر کرنا پڑتا ہے اور راستے میں مشہور قصبہ سخی سرور آتا ہے خشک اور سلیٹی رنگ پہاڑوں کی قدرتی تراش خراش اس قدر جاذب نظر ہے کہ دیکھنے والوں کا خدا پر ایمان مزید پختہ ہو جاتا ہے۔

ڈیرہ غازی سے ساٹھ کلومیٹر پر واقع یہ پرفضا مقام اپنے اندر خوبصورتی کے سمندر سموئے ہوئے ہے۔ پہاڑوں کے درمیان سے گذرتے ہوئے ندی نالے جنہیں یہاں رودکوہیاں کہا جاتا

ہے اپنی طغانیوں کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔ بارش کے دنوں میں یہاں سے گزرنے والا پانی اس قدر تیز ہوتا ہے کہ سامنے آنے والی ہر چیز بہا لیے جاتا ہے ان رودکوہیوں کا لاکھوں کیوسک پانی منصوبہ بندی نہ ہونے کی وجہ سے ضائع ہو جاتا ہے اور یہ قدرتی وسیلہ کسی مصرف میں نہیں لایا جارہا ہے سردار فاروق احمد لغاری کی دورصدارت میں فورٹ منرو کی تعمیر و ترقی کے ساتھ ساتھ رودکوہیوں کے پانی کو استعمال میں لانے کے لیے چھوٹے چھوٹے ڈیموں کے کئی منصوبے بنے لیکن عملی طور پر کچھ نہ ہوا۔

فورٹ منرو جانے والا راستہ سیاحوں کو ہمیشہ اپنی یاد دلاتا رہتا ہے پہاڑوں کے گرد بل کھاتی اور چڑھتی چڑھاتی سڑک دیکھنے والوں کے لیے دلفریب منظر پیش کرتی ہے سڑک پر رینگنے اور گھوں گھوں کی آوازیں نکالتے ٹرک دور سے کھلونا محسوس ہوتے ہیں۔ جب کوئی ٹرک ہارن بجاتا ہے تو اس کی آواز کافی دیر تک پہاڑوں میں گونجتی رہتی ہے ان پتھریلے پہاڑوں پر سفر کرتے ہوئے کئی ایسے خطرناک موڑ بھی آتے ہیں کہ جہاں سے گزرتے ہوئے نئے آنے والے آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور زبان پر اللہ اللہ کا ورد ہوتا ہے لیکن جب ڈیرہ غازی خان سے پرخطر راستہ طے کر کے لوگ یہاں پہنچتے ہیں تو انہیں خوشگوار موسم کے سوا کوئی سہولت نصیب نہیں ہوتی یہاں چند سرکاری ریسٹ ہاؤس ہیں جو صرف خواص کے لیے کھلتے ہیں اور عوام انہیں باہر باہر سے دیکھتے ہیں کچھ وڈیروں، سرداروں اور تمن داروں نے بھی یہاں گھر بنا رکھے ہیں۔

منرو نامی انگریز کے نام پر یہاں تعمیر ہونے والے ملبے کے اب نشان باقی ہیں دفاعی مقاصد کے لیے تعمیر ہونے والے مضبوط قلعوں کا مٹ جانا یقیناً ہمارے لمحہ فکریہ ہے۔ فورٹ منرو کے مقام پر ایک خوبصورت جھیل بھی ہے جسے ڈیمس جھیل کہا جاتا ہے اس جھیل کے کنارے پنجاب ٹورازم کا ہوٹل ہے یہ جھیل سیاحوں کے لیے دلکش نظارہ پیش کرتی ہے۔ پاکستان یوتھ ہوسٹل ایسوسی ایشن اور پاکستان ٹورازم ڈویلپمنٹ کارپوریشن والوں کو یہاں اپنے یوتھ ہوسٹل اور ہوٹل موٹل کے قیام عمل میں لانا چاہیے جو یہاں سیر و سیاحت کے فروغ میں ایک اہم قدم ہوگا۔

فورٹ منرو میں سب سے زیادہ رونق 14 اگست کو ہوتی ہے جشن آزادی کے موقع پر یہاں ایک میلہ لگتا ہے جس میں لوگ دور دور سے شریک ہوتے ہیں اور رش اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ سڑک کئی کئی گھنٹے بلاک ہو جاتی ہے قبائلی علاقہ ہونے کی وجہ سے اسلحہ یہاں ہر طرف عام ہے

دکانوں پر بندوقوں کی گولیوں اس طرح بکتی ہیں جیسے ہمارے ہاں ٹافیاں، کسی کے پاس اور کچھ ہو نہ ہو بندوق ضرور ہوتی ہے نوجوان ہر طرف کندھوں پر بندوقیں سجائے پھرتے ہیں۔فورٹ منرو میں ایک اور قابل ذکر چیز یہاں کا پیالہ ہے پہاڑوں سے پانی بوندوں کی شکل میں ایک پتھر پر گرتا ہے اور سالوں کے اس تسلسل نے پتھر کو پیالے کی شکل دے دی ہے پہاڑوں میں موجود اس پیالے کولوگ بڑے اشتیاق سے دیکھتے اور خوش ہوتے ہیں۔

فورٹ منرو ہی ایک مارکیٹ بھی موجود ہے جو صرف گرمیوں کے سیزن میں ہی آباد ہوتی ہے مارکیٹ کی پکی دکانیں موسم میں سج جاتی ہیں اور موسم ختم ہونے پر اجڑ جاتی ہے فورٹ منرو سے تھوڑے فاصلے اہم مقام رکنی ہے جو سمگل شدہ اشیاء کی خرید وفروخت کے لیے بے حد مشہور ہے۔

رکنی صوبہ بلوچستان میں واقعہ ہے فورٹ منرو آنے والوں کی اکثریت رکنی کا چکر لگاتی ہے۔

روزنامہ ''نوائے وقت'' سنڈے میگزین۔27اکتوبر2000ء

تحریر:علی بخاری

○

لال سوہانرا نیشنل پارک، بہاولپور

لال سوہانرا نیشنل پارک، صوبہ پنجاب کے ضلع بہاولپور میں 32 کلومیٹر شمال میں واقع ہے اس کا رقبہ 1 لاکھ 24 ہزار 480 ہیکٹرز پر مشتمل ہے اسے Blosphese کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں مقامی آبادی بھی ہیں صحرائی اور میدانی علاقے بھی ہیں۔ گھنے جنگل اور بنجر علاقے بھی۔ نہریں بھی ہے اور بے آب و گیاہ ویرانے بھی۔ اسے محفوظ علاقے کے ساتھ مقامی آبادی کے مربوط ہونے کے باعث Blosphase کہا جاتا ہے۔

لال سوہانرا نیشنل پارک کو کالے ہرن کے تحفظ کے لیے قائم کیا گیا تھا جو اس علاقے سے ناپید ہو چکے تھے ورلڈ وائلڈ فنڈ فار نیچر (سابقہ ورلڈ وائلڈ لائف فنڈ) کی اپیل کے جواب میں امریکہ سے جنگلی حیات کے حامیوں نے دس کالے ہرنوں کو ان کے اصل مسکن چولستان کے صحرائی علاقے میں بھیجا۔

یہ حقیقت بھی دلچسپی کا باعث ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکی فضائیہ کا ایک افسر بہاولپور سے سیاہ ہرنوں کا تحفہ امریکہ لے گیا تھا اور اب وہاں ان کی تعداد پچاس ہزار سے زائد ہو چکی ہے جبکہ پاکستان میں اندھا دھند شکار کے باعث اس کی نسل ختم ہو گئی ہے دراصل امریکہ سے کالے ہرنوں کا تحفہ امریکی فضائیہ کے افسر کو دیئے گئے تحفے کی واپسی تھی۔ ورلڈ وائنڈ فنڈ کی ایک اور اپیل کے جواب میں ہالینڈ نے بچوں کو اپنا جیب خرچ چندے میں دے کر 12 فٹ بلند اور 70 کلومیٹر طویل تار کی جالیاں تحفے میں دیں تا کہ کالے ہرن کی قیمتی اور نایاب نسل کی مزید افزائش کے لیے لال سوہانرا نیشنل پارک میں حفاظتی جنگلے بنائے جا سکیں۔ چنانچہ اس عطیے سے 18 کلومیٹر، 9 کلومیٹر اور 8 کلومیٹر کے رقبے کے چار بڑے انکلورژ بنائے گئے۔ ان محفوظ باڑوں میں کالے ہرن کی تعداد اپریل 1996ء میں 325 کے لگ بھگ تھی سیاہ ہرن کی افزائش نسل گھنے جنگل میں ممکن نہ تھی اس طرح شکاری ان کو ہرگز نہ چھوڑتے۔ حالانکہ انکلورژ میں بھی وہ شکاریوں کی دست برد

سے محفوظ نہیں ہیں لیکن اس طرح پھر بھی ان کی حفاظت اور دیکھ بھال نسبتاً آسان ہو گئی ہے۔

سیاہ ہرن کو ان وسیع و عریض انکلورز میں چنکارا Gazell اور نیل گائے کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ اس پارک میں جنگلی حیات کی اقسام میں کالے ہرن کے علاوہ سیہہ، بھیڑیا، لومڑی، صحرائی لومڑی، گورپٹ، مشک بلاؤ، سرمئی نیولا، قراقال بلی، صحرائی بلی، جنگل سور، کلغی والا خار پشت، بڑے خرگوش، کالا تیتر، بھورا تیتر، کونک، بڑا الو، چتی دار چھوٹا الو، کچھوے، چتی سانپ، سنگھاڑا اور کھگا مچھلی شامل ہیں۔

لال سوہانرا نیشنل پارک میں داخل ہوں تو ایک پختہ سڑک دور تک بل کھاتی چلی گئی ہے تھوڑے فاصلے پر بہاول نہر ایک ہیڈ ریگولیٹر کی مدد سے کئی شاخوں میں تقسیم ہوتی ہے جس کے بائیں جانب چلڈرن پارک ہے جہاں جھولوں اور سبزہ زار کے علاوہ مختلف حیوانوں کے جنگلے ہیں جن میں ہندوستان نسل کے گینڈے، چنکارا، مختلف پرندے، اور بندر وغیرہ رکھے گئے ہیں۔

○

لال سوہانرا جھیل، بہاولپور

تقریباً پانچ ہزار ایکڑ پر پھیلی ہوئی لال سوھانرا جھیل، جو لال سوھانرا ٹورازم اور وائلڈ لائف پروجیکٹ کا حصہ ہے ایک دلدلی علاقہ کا منظر پیش کرتی ہے یہ جھیل بہاول پور ڈویژن میں واقع ہے فنڈز کی کمی کی وجہ سے اس کی مناسب طور پر دیکھ بھال نہیں ہوسکی اور اب یہ جھیل خشک ہو رہی ہے اور اس کی خشک زمین پر جنگلی جھاڑیاں اگ رہی ہیں جو نہ تو سیاحوں اور نہ ہی جنگلی حیات کے لیے کشش کا باعث ہیں۔

دراصل یہ واٹر ریزرواٹر (پٹی سار اور لاڈم سار) پر مشتمل ہے جو اب بہاولپور کی ضرورت کو پورا کر رہے ہیں یہ جھیل آٹھ ہزار ایکڑ پر مشتمل ہے اور 1935ء میں تعمیر کی گئی تھی ایک واٹر ریزرواٹر 1968ء میں بند کر دیا گیا تھا جبکہ دوسرے کا رخ جھیل کی جانب موڑ دیا گیا تھا جھیل کا رقبہ اصل کے مقابلے میں دوتہائی کاٹ دیا گیا تھا۔

لال سوہانرا جھیل کا خیالی برطانوی مہم جو انراد کی سفارشات پر پیش کیا گیا تھا جو افسر وائلڈ لائف، سیاحت کے فروغ اور پارکوں کے قیام کے لیے مختلف منصوبوں پر غور کر رہے ہے انہوں نے تجویز کیا کہ پانی کے وسائل کو بہاولپور کی ضرورت پورا کرنے کے لیے کافی اور موثر ہیں۔۔لہٰذا باقی ماندہ پانی کو دوسرے مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے یعنی ایسی جھیل بنائی جائے جہاں سابق سوویت یونین سے موسم سرما کے دوران پرندے آ کر قیام کریں اور مقامی پرندوں اور مچھلیوں کی پرورش اور نشوونما کے لیے قدرتی ماحول فراہم کیا جا سکے۔ان خیالات اور مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے لال سوھانرا جھیل وجود میں آئی۔

وقت کے ساتھ ساتھ یہ جھیل ایسی جگہ بن گئی جہاں موسم سرما میں سویت یونین کے علاقے، سائبریا سے آنے والے پرندے آ کر قیام کرتے تھے۔لال سوھانرا جھیل، صوبہ سندھ میں موجود ہالیجی جھیل اور کنیھجر کی طرح ہجرت کر کے آنے والے پرندوں کے لیے محفوظ ترین اور

پسندیدہ ترین مقام بن گئی۔ جہاں دلکش، دلفریب اور حسین کنول کے پھول کھلتے ہیں۔

ماحولیات کے ایک ماہر ڈاکٹر کی تحقیق کے مطابق ''لال سوھانرا جھیل'' پرندوں کے لیے خوبصورت اور آئیڈیل جگہ تھی اور یہاں انہیں قدرتی ماحول میسر آتا تھا پرندوں کے گروہ اور جھتے یہاں بکثرت پائے جاتے تھے لیکن چند چیزوں نے آہستہ آہستہ انہیں اس جگہ سے دور کر دیا ایک تو یہاں باہر سے لوگ آ کر بے تحاشا شکار کرتے اور ایسے پرندے جو نایاب ہوتے جا رہے ہیں خاص طور پر ان کا ہدف ہوتے۔ کئی سال تک لال سوھانرا جھیل شکار کے لیے مشہور رہی کیونکہ یہاں پرندوں کی بہت سی اقسام پائی جاتی تھیں۔ جنہیں وہ با آسانی شکار کرتے اس طرح پرندوں کے بہت زیادہ شکار نے پرندوں کو کسی محفوظ مقام کی طرف مائل کر دیا۔

ماحولیاتی تنظیم اسکوپ کے صدر کے مطابق کہ جھیل کی دیکھ بھال خراب ہوتی جا رہی تھی اور پانی کے بے تحاشہ پھیلنے اور کبھی کم ہونے کے باعث جھیل کی زمین دلدل ہوگئی اس کا اثر مچھلیوں پر بھی پڑا۔ جھیل ایک طرف تو مقامی آبادی اور انتظامیہ کے لیے آمدنی کا موثر ذریعہ تھی اور دوسری طرف ہجرت کرنے والے پرندوں کے لیے خوراک کی فراہمی کا ذریعہ تھی جیسے جیسے پانی کی سطح کم ہوتی گئی جھیل کے بہت سے حصے خشک ہوتے چلے گئے پرندوں کے لیے غذا بھی کم ہوتی گئی اور شکار بھی تقریباً ختم ہوگیا کیونکہ ہجرت کر کے آنے والے پرندے دوسری سینچوریز کی طرف منتقل ہونا شروع ہو گئے۔

لال سوہانرا جھیل کے کچھ حصوں میں ابھی تک اتنا پانی موجود ہے کہ سیاح وہاں آ کر خوش ہو سکیں یا وہاں بوٹنگ کی جا سکے یعنی یہ جھیل مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی اس جھیل کو پہلے کی طرح خوبصورت بنانے کا وعدہ اور مناسب فنڈز اس کو پرندوں اور سیاحوں کے لیے پرکشش بنا سکتے ہیں۔

○

بہاول پور کا چڑیا گھر

بہاول پور کا تشخص جہاں اس کے خوبصورت محلات اور ریاستی روایات ہیں وہاں لوگوں کی تفریح کے لیے قائم چڑیا گھر بھی اس شہر کی شناخت بن گیا ہے۔ بہاولپور چڑیا گھر کا شمار ملک کے تین بڑے چڑیا گھروں میں ہوتا ہے بہاولپور کی سرزمین پر قدم رکھنے والا ہر ملکی و غیر ملکی سیاح اور تفریحی دورے پر آنے والے مختلف وفود جب تک چڑیا گھر کی سیر نہ کرلیں لطف دوبالا نہیں ہوتا۔"

1942ء میں قائم ہونے والے اس چڑیا گھر کی بنیاد نواب سر صادق محمد خان عباسی نے رکھی۔ 125 ایکڑ رقبہ پر مشتمل چڑیا گھر میں چالیس لاکھ روپے کی لاگت سے مختلف قسم کے 53 جانور اور 426 پرندے لائے گئے۔ گراسی پیلس بنانے کے علاوہ ایک ہاتھی بھی خریدا گیا جو 1994ء تک ہر آنے والے کی خصوصی توجہ کا مرکز بنا رہا اس کی طبعی موت کے بعد انتظامیہ نے ایک اور ہاتھی کا بندوبست کیا جو شائقین کی تفریح کا باعث بن رہا ہے۔

چڑیا گھر کی تعمیر گورنر جی ایم تسنیم نے کروائی وہ پرندوں اور چرندوں کا بہت شوق رکھتے تھے۔ 1955ء میں اس کی دیکھ بھال مغربی پاکستان کے حکومت کے شعبہ زراعت کے ذمہ تھی۔ 1977ء میں شعبہ نگہداشت مویشیاں نے اس کا نظم ونسق سنبھالا۔ کمشنر بہاولپور اس کے چیئرمین مقرر ہوئے۔ 1982ء میں جنگلی شعبہ حیات نے چڑیا گھر کی ذمہ داری سنبھال لی۔ اس چڑیا گھر میں جانوروں کی افزائش دیگر چڑیا گھروں سے بہتر ہو رہی ہے۔

چڑیا گھر میں 548 جانور، ہاتھی، ریچھ، گیدڑ، بندر، کالا ہرن، شیر، بارہ سنگھا، بن مانس، چیتا، بھیڑیا اور مگرمچھ موجود ہیں 1986ء میں بھارت سے سرحد پار کر کے سیالکوٹ کے راستے ایک ہاتھی داخل ہوا جسے قابو کر کے پہلے لاہور چڑیا گھر میں رکھا گیا بعدازاں اسے بہاولپور چڑیا گھر میں لایا گیا اس وقت چڑیا گھر میں ایک ہاتھی کے علاوہ 21 ببر شیر، تین ٹائیگر 6 عام بلیاں، ایک جنگلی بلا، ایک چرخ، 4 گیدڑ، 4 لومڑیاں، 3 سیاہ گوش، ایک کالا ریچھ، تین بھورے ریچھ، تین بن مانس،

ایک مادہ بندر، سات زیبرے، تین سہیہ، نیل گائے، پانچ چتیل ہرن، 21 پاڑہ ہرن، 19 چولستانی ہرن، 5 کالے ہرن، دو آسٹریلین بھیڑیں، 13 خرگوش، 29 بیل، پرندوں میں پانچ کونجیں سات بگلے ایک مرغابی، 35 عام بطخیں، 16 چینی مرغیاں، 86 نیلے مور، 13 چترا مور، چار سیاہ کندھے والے مور، دو سبز مور، عام فیزنٹ تین سبز فیزنٹ، ایک، لال جنگلی طوطے چار، 13 چینی چڑیاں، 24 کوئل، دو فاختہ، 13 سفید فاختہ، سرخ چڑیاں، 42 مور، 22 کبوتر اور سات گنی مرغیاں شامل ہیں۔

چڑیا گھر میں عجائب خانہ بھی موجود ہے جس میں تاریخی نوٹ، حنوط شدہ جانور اور تاریخی خطوط آنے والوں کی خصوصی توجہ کا مرکز بنے رہتے ہیں مچھلی گھر میں شیشے کے بڑے بڑے جار عجائب گھر کی خوبصورتی میں اضافے کا باعث ہیں۔ جب کوئی جانور یا پرندہ طبعی موت مرتا ہے تو اس کی حنوط کاری کی جاتی ہے اور جانوروں کی کھالیں بھی محفوظ کر لی جاتی ہیں اسے شیروں کی افزائش کا بڑا ادارہ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ گذشتہ دس برسوں کے دوران چڑیا گھر میں شیر کے ایک سو سے زائد بچے ہوئے ہیں جن میں سے چودہ شیر لکی ایرانی سرکس، 6 دوبئی اور ابوظہبی، 2 لاہور چڑیا گھر، دو وہاڑی اور دس شیر لال سوہانرا پاک تقریباً سولہ لاکھ میں فروخت کیے گئے۔

چڑیا گھر کی آمدن کا سب سے بڑا ذریعہ ٹکٹ ہے ایک اندازے کے مطابق چڑیا گھر میں روزانہ اوسطاً سینکڑوں کے قریب شائقین آتے ہیں۔

یہ ملک کا واحد چڑیا گھر ہے جہاں اپنا سلاٹر ہاؤس ہے جہاں انتظامیہ کی نگرانی میں صحت مند جانور ذبح کیے جاتے ہیں مختلف جانوروں کو 186 کلوگرام گوشت فراہم کیا جاتا ہے جب کوئی جانور مر جاتا ہے تو اس کا باقاعدہ پوسٹ مارٹم کیا جاتا ہے تاکہ موت کی وجہ معلوم ہو سکے جانوروں کا ہفتہ وار باقاعدہ معائنہ بھی کیا جاتا ہے تاکہ ان کی صحت مندی سے آگاہی رہے۔

○

چولستان، بہاولپور

چولستان ہماری ثقافتی اور تہذیبی روایات کا عکاس ہونے کی بدولت نہ صرف ملکی بلکہ غیر ملکی سیاحوں کے لیے بھی کشش کا باعث ہے یہاں کی روایتی زندگی کا اپنا حسن ہے جس کا تذکرہ یہاں کی لوک کہانیوں میں پایا جاتا ہے۔صحرا کا حدود اربعہ اور رہن سہن حالات اور وقت کے ساتھ تبدیل ہوتا رہا ہے۔کبھی یہاں پر پانی اور خوبصورتی بھی نظر آتی تھی۔لیکن اب ہر طرف ریت کے ذرے بکھرے نظر آتے ہیں۔چار ہزار سال قبل یہاں کبھی دریائے سرسوتی ٹھاٹھیں مارتا ہوا گزرتا تھا۔ریت اور صحرائی ماحول میں یہ دریا کبھی صحرا کی شان دکھائی دیتا تھا لیکن اس کا خشک ہو جانا صدیوں پرانی بات بن کر رہ گئی۔اس کے علاوہ تاریخی حوالوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کبھی یہاں دریائے ھاکڑہ کی لہریں بھی موجزن تھیں اور یہ سندھ اور ہند کے درمیان حد فاضل کا کام دیا کرتی تھیں یہ دریا جیسلمیر اور بیکانیر کی ریاستوں کو بھی جدا کرتا تھا اگر چہ اس دریا کا رخ تبدیل ہو گیا لیکن گم گشتہ تاریخ کے نشانات اب بھی موجود ہیں۔چولستان کے صحرا نے ہر چیز کو ویرانی میں تبدیل کر دیا ہے یہاں کے لوگ ان تبدیلیوں سے کبھی بھی متاثر نہیں ہوئے اور نہ ہی انہوں نے اپنے طرز زندگی کو تبدیل کیا بلکہ جدو جہد کو اپنا شعار بنالیا ہے انہوں نے زندگی کو اجیرن بنا دینے والی ان تبدیلیوں کے سامنے نہ تو ہتھیار ڈالے اور نہ ہی اپنی جنم بھومی کو کبھی خیر باد کہا۔چولستان کو تھل روہی اور چولستان کہا جاتا ہے یہ مشہور ریگستان جس کا رقبہ سولہ ہزار مربع کلومیٹر ہے۔بہاولپور سے تیس کلو میٹر دور ہے یہ صحرا آگے چل کر تھر کے ریگستان سے مل جاتا ہے۔

چولستان کی وجہ تسمیہ کے بارے میں مختلف روائتیں ملتی ہیں کیونکہ یہ خطۂ زمین مغرب میں تھر اور جنوب مشرق راجپوتانے کے وسیع صحرا کے درمیان واقع ہے۔کسی زمانے میں اسے چولن بھی کہا جاتا تھا۔تند؛ تیز آندھیاں ریت کے متحرک ٹیلوں کو ایک جگہ سے اڑا کر دوسری جگہ لے جاتی

تھیں۔ اکھاڑ پچھاڑ کے اس عمل کو چولن کہا جاتا ہے اور پھر یہ نام چولن سے چولستان بن گیا۔

چولستان کا کل رقبہ دس ہزار تین سو ننانوے مربع میل مشرق و مغرب کی طرف پھیلا ہوا ہے۔ بہاولپور بہاول نگر اور رحیم یار خان پر مشتمل رقبہ دو ہزار پانچ سو پچپن مربع میل ہے۔ چولستان میں پچاس ہزار سے زائد لوگ خانہ بدوش کی زندگی بسر کر رہے ہیں ان لوگوں کی زندگی چل چلاؤ کی مانند ہوتی ہے اور کبھی کسی جگہ کو اپنا مسکن نہیں بناتے۔ خواجہ غلام فرید نے چولستان کو نخرے کرنے والی جٹیوں کا مسکن کہہ کر پکارا ہے۔ یہاں کے لوگوں کو خوراک اور جانوروں کے لیے گھاس پانی کی تلاش کے لیے شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے بارش یہاں قدرت کا انمول تحفہ بن کر آتی ہے۔ لوگ پانی کی تلاش میں تھکا دینے والے لمحات سے گزرتے ہیں۔ فروری اور جولائی کے درمیان لوگ پانی کی تلاش کے لیے ٹوبوں (جوہڑوں) کا رخ کرتے ہیں۔

یہاں سے قیمتی اشیاء، زیور اور منکے بھی دریافت ہوئے ہیں جنہیں دھاگے میں پرو کر یہ لوگ اپنے گلے میں ڈال لیتے ہیں یہ زیور اور منکے چولستانی لوگوں کو بہت بھاتے ہیں۔ جو بیضوی اور تکونی شکل کے ہوتے ہیں۔ چولستانیوں کی زندگی بظاہر تھکا دینے والی ہے مگر وہ اس زندگی سے بیزار نہیں بلکہ اسے ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ بادلوں کی آمد کو اچھا شگون مانتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ ہوا ان بادلوں کو اڑا کر نہ لے جائیں۔ آندھی اور ہوا سے قافلے راستہ بھٹک جاتے ہیں۔ صحرائی بگولے بڑے خوف ناک ہوتے ہیں۔ قافلے والے ان پھیلے ہوئے خوفناک بگولوں کے قریب بھی نہیں جاتے۔ صحرائی آندھی کا منظر بڑا خوفناک ہوتا ہے یہ بگولے سرخی مائل اور بھورے رنگ کے ہوتے ہیں۔

چولستان میں آنے کے بعد انسان شور و غل کی دنیا سے کٹ جاتا ہے یہاں پر ایک گہرے سکوت کا احساس ہوتا ہے جولائی سے ستمبر تک تین مہینے بارش جاری رہتی ہے۔ وقت جیسے جیسے ان مہینوں سے دور چلا جاتا ہے صحرا کا چہرہ اسی تناسب سے اداس اور بے چین دکھائی دینے لگتا ہے بارش کے بعد خودرو پھول اور صحرائی جھاڑیاں توانا ہو کر ہر طرف پھیل جاتی ہیں۔ چولستان کی ایک اپنی ہی نرالی اور اچھوتی دنیا ہے۔ ایسی دنیا جو دل کی اجڑی ہوئی بستی کو آباد کر دیتی ہے اور روح کے سوتے ہوئے تاروں کو چھیڑ دیتی ہے۔ چولستان میں چاندنی راتوں کے نظارے بہت دیدنی ہوتے ہیں یوں لگتا ہے جیسے انسان کے چاروں طرف نور کا ایک جہان بکھرا ہو۔

غروب آفتاب کا منظر ایسے لگتا ہے جیسے صحرا آنکھیں بند کر رہا ہے۔ حضرت خواجہ غلام فرید نے اپنی زندگی کے اٹھارہ سال اس صحرا میں گزارے انہوں نے چولستان کی زندگی کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا اور لوگوں کے رہن سہن، رسم ورواج، اور احساسات نیز چولستان کے مناظر کو اپنی شاعری کے خوب صورت الفاظ میں ڈھال دیا یہاں کا حسن یہاں کے لوگوں کے دلوں کی سچائیوں اور حقیقتوں کی مانند عیاں ہے انسانوں کے علاوہ یہاں کے جانوروں اور پرندوں کا حسن بھی چولستان کی دلکشی کا باعث ہے جن میں نایاب کالا ہرن، چنکارہ، چرگ، تیتر، تلور، بھٹ تیتر، مرغابی، نیل گائے، شکرا اور خرگوش پائے جاتے ہیں۔

چولستان میں نمی کی وجہ سے نگاہ دور دور تک نظارہ کر سکتی ہے یہاں ایک مشہور قلعہ دراوڑ بھی ہے جس میں تاریخ کے بیش قیمت آثار بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

○

ڈرنگ سٹیڈیم، بہاولپور

بہاول پور، کا ڈرنگ سٹیڈیم ایک منفرد قسم کا سٹیڈیم ہے جہاں ہاکی، فٹ بال، باسکٹ بال، والی بال، اسکوائش، ٹینس، ٹیبل ٹینس، بلیئرڈ وغیرہ کے علاوہ سوئمنگ، باڈی بلڈنگ اور اتھیلٹیکس کی سہولتیں بھی موجود ہیں۔ سٹیڈیم میں تین تین ہاکی اور فٹ بال گراؤنڈز دو دو اسکوائش، ٹینس کورٹس، سوئمنگ پول اور دیسی کشتی کا اکھاڑہ بھی ہے۔ جس کے گرد ہزاروں تماشائیوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔

ہاکی اور نیٹ بال کے ٹورنامنٹ کے لیے چار دیواری والا گراؤنڈ بھی بنایا گیا ہے۔ جس کے گرد سیڑھیوں پر آٹھ دس ہزار تماشائیوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے اس میں ایک پویلین بھی بنایا گیا ہے۔

ڈرنگ سٹیڈیم، ریاست بہاولپور کے وزیر بلدیات مخدوم زادہ حسن محمود کا منصوبہ تھا جو خود بھی اول درجے کے کرکٹر تھے اور بعد میں ریاست کے وزیر اعظم بھی بنے سٹیڈیم کا سنگ بنیاد 1951ء میں اس وقت کے ریاست کے وزیر اعظم کرنل اے جے ڈرنگ نے رکھا۔ سٹیڈیم بن جانے کے بعد مخدوم زادہ حسن محمود نے کھیلوں کی ترقی کے لیے سپورٹس ڈائریکٹوریٹ بھی قائم کیا اس میں پہلے اسسٹنٹ ڈائریکٹر سید محمد حسین بنائے گئے جو ہندوستان سے ہجرت کر کے بہاولپور میں آباد ہوئے تھے۔ وہ متحدہ ہندوستان کی اس ہاکی ٹیم میں شامل تھے جس نے 1936ء کے برلن اولمپکس میں سونے کا تحفہ جیتا تھا انہوں نے کرکٹ اور فٹ بال میں بھی انڈیا کی نمائندگی کی تھی۔

امیر بہاولپور کے محلات کے نگران جنرل مارڈن نے باغبانی کے ایک ماہر بنارس خان کو محلات کے لیے پشاور سے بلایا تھا مخدوم زادہ نے بنارس خان کی خدمات سٹیڈیم کے لیے مستعار

لے کر انہیں ہیڈ مالی بنا دیا۔ انہوں نے کھیلوں کے میدان کو ہموار کر کے گھاس لگائی کرکٹ گراؤنڈ میں بین الاقوامی معیار کی پچیں بنائیں۔ نیٹ پریکٹس کے لیے علیحدہ گراؤنڈ بنایا گراؤنڈ کے اردگرد کیاریاں بنا کر ان میں رنگ برنگے پھول لگا کر اس طرح سجایا کہ دور دراز سے لوگ صرف اس سٹیڈیم کو دیکھنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ مخدوم زادہ نے بیرونی ممالک سے مختلف قسم کے درخت اور پودے لگا کر سٹیڈیم میں لگوائے۔ سوئمنگ پول کے ساتھ ایک گھنٹہ گھر بھی تعمیر کیا گیا جو پورے سٹیڈیم سے نظر آتا ہے اس کے گھنٹے کی آواز آدھے شہر میں سنائی دیتی ہے کرکٹ گراؤنڈ کے اطراف میں سیڑھیاں بنائی گئیں اور ان کے اوپر دھوپ سے بچنے کے لیے شیڈز بنائے گئے مغربی سمت دیدہ زیب پویلین تعمیر کیا گیا جس میں ڈریسنگ رومز اور دیگر تمام ضروریات کا خیال رکھا گیا ہے۔ اس گراؤنڈ پر 1952ء میں ایم سی سی نے بہاول پور کی ٹیم کے ساتھ تین روزہ میچ کھیلا سب سے پہلے ٹیسٹ کھیلنے کے لیے پاکستان کا دورہ کرنے والی ٹیم بھارت کی تھی جو 1955 میں آئی اس نے پہلا ٹیسٹ ڈھاکہ میں کھیلا اور دوسرا ٹیسٹ 15 سے 18 جنوری ڈرنگ سٹیڈیم بہاولپور میں ہوا اس طرح موجودہ پاکستان میں پہلا ٹیسٹ سنٹر ڈرنگ سٹیڈیم بہاول پور تھا یہیں حنیف محمد نے اپنی پہلی سنچری بنائی۔ حنیف محمد نے ورلڈ ریکارڈ 499 رنز بھی اس گراؤنڈ پر سکور کیئے۔ ویسٹ انڈیز کی ٹیم بھی یہاں تین روزہ میچ کھیل چکی ہے یہاں ٹرائی ٹورنامنٹ کے میچ بھی ہوتے رہتے ہیں۔ چار دیواری والے گراؤنڈ پر ہاکی اور فٹبال کے کئی آل پاکستان ٹورنامنٹس اور بین الاقوامی میچ کھیلے جا چکے ہیں۔ سب سے پہلے مخدوم زادہ کے زمانے میں آل پاکستان ہاکی ٹورنامنٹ ہوا۔ اس کے بعد 1954ء میں پاکستان اور مغربی جرمنی ہاکی ٹیسٹ میچ ہوا جو پاکستان نے 3 کے مقابلے میں 6 گول سے جیتا یہاں نیوزی لینڈ، مغربی جرمنی، آسٹریلیا، ہالینڈ، جاپان، قازقستان، پولینڈ اور کینیڈا کی ٹیمیں میچ کھیل چکی ہیں۔ پاکستان اور بھارت کی جونیئر ٹیموں کا ''ٹیسٹ میچ'' بھی یہاں ہوا۔

آغا خان گولڈ کپ ٹورنامنٹ دو مرتبہ یہاں ہو چکا ہے۔ افغان کلب یہاں دس سال آل پاکستان ہاکی ٹورنامنٹ کراتی رہی۔ فٹ بال کے دو بین الاقوامی میچ بھارت اور ایران کی ٹیموں

کے خلاف اسی گراؤنڈ میں کھیلے جا چکے ہیں۔

اس سٹیڈیم کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ 1979ء میں ٹور ڈی پاکستان سائیکل ریس کا افتتاح یہیں سے ہوا۔ بہاول پور نے ہاکی کے کئی قومی کھلاڑی پیدا کیئے ہیں جنہوں نے اس سٹیڈیم میں کھیل کر مہارت حاصل کی۔ اس سٹیڈیم میں کھلاڑیوں کی ضرورت کا ہر سامان موجود ہے صرف ہوسٹل کی کمی ہے۔

بہاول پور کے شہریوں کی یہ خواہش ہے کہ اس سٹیڈیم کا نام تبدیل کر کے کسی قومی شخصیت، کسی عظیم کھلاڑی کے نام پر یا محض بہاولپور سٹیڈیم رکھ دیا جائے۔''

روزنامہ ''جنگ'' لاہور (سپورٹس ایڈیشن)
تحریر: شبیر ثمن

○

سنٹرل لائبریری، بہاولپور

مسلمانوں حکمرانوں نے اہل علم کی خدمات حاصل کر کے علمی موضوعات پر ہزاروں کتابیں لکھوائیں اور ان کی نقلیں کروا کے دور دراز کے کتب خانوں میں رکھوائیں اس طرح لائبریری کے تصور کو عملی جامہ پہنایا موجودہ دور میں لائبریری کا دائرہ عمل، علم اور سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ بڑھتا جا رہا ہے اب نہ صرف کتابیں ہی کتب خانوں یا لائبریوں میں جمع کی جاتی ہیں بلکہ رسائل نقشہ جات خاکے مخطوطات اور گراموفون ریکارڈ، مائیکروفلم اور اس نوع کے دوسرے مواد بھی لائبریوں میں ایک خاصی ترتیب کے ساتھ موجود ہوتے ہیں۔

بہاول پور کی سرزمین میں سب سے زیادہ مشہور سنٹرل لائبریری ہے جو اپنی ہمہ گیر خصوصیات کی وجہ سے انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ مسٹر رچرڈ کرافسٹن سابق وزیراعظم بہاولپور کے رخصت ہونے پر وزارت عظمی کی کرسی خالی ہوئی جس پر نواب مشتاق احمد گورمانی کو تعینات کیا گیا۔ 22 اپریل 1947ء کو غیر معمولی گزٹ نمبرا ے جلد نمبر 83 میں باقاعدہ اس کا اعلان بھی کیا گیا جب گورمانی وزیراعظم مقرر ہوئے انہوں نے ریاست کی خوب دیکھ بھال کی اور اچھے اچھے کام کیے ایک کام بہت اچھا کیا اور وہ یہ کہ یہ عمارت سنٹرل لائبریری کو دلوادی۔

وزیراعظم نے فوری طور پر بلدیہ بہاول پور کی لائبریری کی عمارت بمعہ فرنیچر کتب و دیگر اوازمات سرکاری تحویل میں دے کر سرکاری سطح پر ایک لائبریری قائم کرنے کے احکامات صادر فرما دیے اور اس لائبریری کے تحت ریاست بہاولپور کے دیگر شہروں میں ذیلی لائبریریاں قائم کی گئیں۔ اس وقت ایک فیصلے کے تحت صادق ریڈنگ بہاولپور کی عمارت کی تبدیلی نام سنٹرل لائبریری کی توثیق کر دی گئی۔ نواب مشتاق احمد گورمانی نے اس لائبریری کے لیے اخراجات کا بجٹ باقاعدہ سرکاری خزانے سے منظور کروایا۔

1947ء سے 1958ء تک یہ لائبریری عمارت کی بالائی منزل میں کام کرتی رہی یہاں کے

پہلے لائبریرین ملک نذیر احمد صاحب تھے ان کی مسلسل جدوجہد نے اس کتب خانے کی بنیادیں مضبوط کیں اس زمانے میں لائبریری کے احاطے میں آج کل جو عمارتیں موجود ہیں وہ قطعاً نہیں تھیں مغربی سمت سرکلر روڈ تک کشادہ وسیع پلاٹ تھے چوطرفی سایہ دار درخت تھے چھ سال کی جدوجہد کے بعد 1958ء میں بلدیہ بہاولپور نے اس عمارت کو آخرکار خیرآباد کہا سابق ریاست کی علمداری کے بعد اس لائبریری نے صوبائی حکومت کی تحویل میں یعنی محکمہ تعلیم حکومت پنجاب کی تحویل میں ترقی کی منازل طے کرنا شروع کیں۔

یہ مقام علم کا سرچشمہ ہے تشنگان علم وادب کی پیاس بجھا رہی ہے قارئین اور اہل علم وفکر اس پرسکون ماحول میں یکسوئی کے ساتھ کتابوں سے استفادہ کرتے ہیں عمارت ایسی عمدہ جو گرمیوں میں اپنی اونچی چھتوں کے سائے میں سب کو ٹھنڈک بہم پہنچاتی ہے عوام اور طلبا کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی تنظیم وترتیب کے لیے تجربہ کار لائبریرین ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں ان کے تجربہ کارانہ انداز فکر نے لائبریری میں مندرجہ ذیل شعبوں کا اضافہ کیا۔

1۔ سنٹرل لائبریری شعبہ خاص، 2۔ شعبہ اطفال، 3۔ شعبہ سفری، 4۔ شعبہ دستاویزی فلم 5۔ غیر ملکی زبانوں کا تدریسی شعبہ، 6۔ مائیکرو ویو کا شعبہ، 7۔ شعبہ خواتین، 8۔ اخبارات ورسائل کا شعبہ، 9۔ سمی وبصری شعبہ، 10۔ شعبہ جلد سازی۔

اس وقت لائبریری میں چھیاسی ہزار کتابیں، لسانیات، اسلامیات، سائنسی فنون، فنون لطیفہ، تاریخ، جغرافیہ، سوانح عمریاں، معاشرتی علوم، علوم اجرام فلکی، سیاسیات اور قلمی نسخوں سے الماریاں بھری پڑی ہیں ان کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں اخبارات ورسائل بھی موجود ہیں جن میں خصوصاً آج سے ایک صدی قبل تک کے اخبارات ورسائل کے فائل قابل ستائش ہیں۔

شعبہ اطفال ریاست کے زمانے ہی میں گلستان اطفال کے نام سے یہاں موجود تھا سنٹرل لائبریری کے کھلے میدان میں پندرہ کنال اراضی اس کے لیے مختص تھی جس میں ایک کمرہ تعمیر شدہ تھا باقی کھلا میدان تھا کمرے میں بچوں کی لائبریری تھی اور کھلے میدان میں بچوں کے لیے جھولے، پھسلنے والا زینہ اور دیگر کھیل کود کے سامان موجود تھے جب عمارت فاریہ سے واپس لے لی گئی تو اس عمارت کے ایک کمرے میں بچوں کی لائبریری سمو دی گئی جہاں بچوں کی کتابیں وغیرہ پڑی رہتی تھیں یہ سلسلہ 1981ء تک چلتا رہا گورنر سوار خان جب پنجاب کے گورنر تھے اس وقت ان کی منظوری سے ایک اسکیم تیاری کی گئی جس میں یہاں کے چیف لائبریرین نے بڑا موثر کردار ادا کیا

بچوں کی لائبریری کی ایک الگ عمارت کے لیے نقشہ ہی پاس نہیں کروایا بلکہ تعمیر بھی شروع کروائی اس عمارت کا تعمیری رقبہ چھ ہزار پانچ مربع فٹ رکھا گیا۔ 1981ء سے 1983ء کے مالی سالوں میں دس لاکھ چوراسی ہزار روپیہ کی لاگت سے انتہائی دلکش عمارت تعمیراتی اسلوب کو پیش نظر رکھتے ہوئے پایہ تکمیل کو پہنچی اس وقت لائبریری میں بارہ ہزار سے زائد اردو اور انگریزی کتابیں موجود ہیں بچوں کے لیے بہت ساری کہانیاں اور معلوماتی مضامین جمع کیے گئے ہیں سینکڑوں کتابیں دلکش وضاحتی تصاویر سے مزین ہیں جن کے باعث بچوں کی دلچسپی پڑھتے وقت برقرار رہتی ہے بارہ سال کی عمر کے بچے اس لائبریری کے ممبر بن سکتے ہیں اس کے علاوہ اس شعبہ کی تنظیم کچھ اس طریقے پر سائنٹیفک انداز میں کی گئی ہے کہ یہاں صحت مند بچوں کے علاوہ معذور اور نابینا بچوں کے سیکشن بھی موجود ہیں جن سے وہ استفادہ حاصل کرتے ہیں ایک لیڈی اسسٹنٹ لائبریرین بھی بچوں کی رہنمائی کے لیے یہاں موجود رہتی ہیں اس طرح یہ شعبہ بچوں کی تعلیم و تربیت میں بہت فعال اور کارآمد کردار ادا کر رہا ہے۔

سنٹرل لائبریری بہاول پور کی عمارت کا کل رقبہ 22 ہزار نو سو مربع فٹ ہے تمام اراضی میں سے 25 بیگھے دس مرلے زمین اطراف میں رکھی گئی ہے جس میں بچوں کا پارک اور متعدد سبزہ زار بنائے گئے جگہ جگہ پھلدار درخت اور متعدد آرائش پودے لگائے گئے۔

تحریر: ڈاکٹر سید زاہد علی واسطی

''سرزمین بہاولپور''

صوبہ سندھ

کراچی

صوبہ سندھ کا مرکزی، صنعتی اور کاروباری شہر ہے پاکستان کا پہلا وفاقی دارالحکومت بنایا گیا اور آج پاکستان کا سب سے بڑا صنعتی کاروباری اور پر ہجوم شہر ہے۔ بحیرۂ عرب کے کنارے پر آباد ہے جس کی وجہ سے ساحلی تجارت کا بہت بڑا مرکز ہے تمام بڑی بڑی عالمی کاروباری تنظیموں کے یہاں ہیڈ کوارٹر ہیں اس کی آبادی 1998ء کی مردم شماری کے مطابق 92,9265 ہو گئی ہے اور اس طرح پاکستان کی کل آبادی کا یہاں 98% آباد ہے کراچی دراصل چھوٹے چھوٹے جزیروں ''بانا'' شمس پیر، کیماڑی اور منوڑہ وغیرہ کا مجموعہ ہے یہ تمام جزیرے ایک ایسی جھیل پر واقع تھے جو ایک قدرتی بندرگاہ تھی۔ 326 قبل از مسیح میں سکندر اعظم شاہ یونان کے امیر البحر فیرکس نے یہاں پر پڑاؤ کیا تھا۔ یہاں کی سٹیل مل، کراچی پورٹ، کلفٹن، مزار قائداعظم اور بیت الحکمت یونیورسٹی اس شہر کی عظمت کے نشان ہیں۔

گورنر ہاؤس

اس عمارت کو آج کل ایوان صدر کہا جاتا ہے یہ برطانوی دور میں کراچی میں تعمیر ہونے والی پہلی عمارت تھی۔ یہ عبداللہ ہارون روڈ پر ہولی ٹرنٹی چرچ کے سامنے واقع ہے یہ عمارت ایک کشادہ چہار دیواری کے وسط میں واقع ہے اس چہار دیواری میں وسیع باغات اور لان ہیں اس عمارت کو 1845ء میں سندھ کے پہلے گورنر چارلس نیپرؒ نے اپنی رہائش کے لیے تعمیر کرایا تھا۔ یہ اس کی نجی ملکیت تھی۔ 1847ء میں برطانوی حکومت نے اسے چارلس نیپئر سے 48000 روپے میں خرید کر گورنر سندھ کی سرکاری رہائش کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ بعد میں مقرر ہونے والے تمام کمشنر سندھ اس میں رہائش پذیر رہے۔ اس عمارت کی پہلی منزل کمشنر سندھ جان جیکب کے زمانے میں تعمیر ہوئی تھی۔

یہ نہایت دلکش عمارت ہے اور اب تقریباً ڈیڑھ سو برس گذر جانے کے بعد بھی اپنی اصل حالت میں موجود ہے۔ قیام پاکستان کے بعد بابائے قوم حضرت محمد علی جناح بھی اس میں بحیثیت گورنر جنرل پاکستان قیام پذیر ہے۔

ہوپ لاج

یہ برطانوی دور میں تعمیر ہونے والی یورپی طرز تعمیر کی شاہکار پہلی عمارت تھی۔ یہ عمارت آج بھی اپنے اصل خدوخال میں ایوان صدر کے قریب مولانا دین محمد وفائی روڈ پر قائم ہے اس عمارت کا سنگ بنیاد 6 ستمبر 1845ء کو چارلس نپیئر نے رکھا تھا۔ اس کی تعمیر کے بعد 24 مئی 1846ء کو گورنر سندھ چالیس نپیئر ہی نے اس کا افتتاح کیا تھا یہ عمارت سو سال سے زیادہ عرصے تک یہودیوں کی بین الاقوامی تحریک فری میسن کی سرگرمیوں کا مرکز بنی رہی۔ شہر کے تمام بااثر مسلمان ہندو، عیسائی اس کے ممبر تھے فری میسن تحریک کی یہ شاخ ثقافتی پروگرام پیش کرکے یہودیوں کے مفادات کے لیے کام کرتی تھی۔

یہ عمارت اب ڈیڑھ سو سال گزر جانے کے بعد بھی نہایت خوبصورت اور پرکشش ہے آج کل اس میں حکومت سندھ کا وائلڈ لائف ڈیپارٹمنٹ واقع ہے۔

فرئیر ہال

یہ کراچی کی سب سے پرکشش عمارت ہے جو سابق کمشنر سندھ سر ایچ بارٹلے ای فریئر کی سندھ میں خدمات کے اعتراف میں تعمیر کرائی گئی تھی۔ اس عمارت کی تعمیر کا آغاز 1863ء میں ہوا تھا۔ اس کا نقشہ شاہی انجینئر کرنل کلیر ولکس نے تیار کیا تھا۔ اس کی تعمیر میں کوٹری کے زرد پتھر کے علاوہ جنگ شاہی کا سرخ اور بھورا پتھر بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اس عمارت کی تعمیر دو سال میں مکمل ہوئی تھی۔ 10 اکتوبر 1865ء کو اس وقت کے کمشنر سندھ مسٹر سیموئیل مسفلیڈ نے اس کا افتتاح کیا تھا۔ اس عمارت کی تعمیر میں ایک لاکھ اسی ہزار روپے خرچ ہوئے تھے اس رقم میں سے 22,500 روپے عوامی چندے کے ذریعے وصول ہوئے تھے جبکہ 10 ہزار روپے حکومت نے مہیا کیے تھے اور بقیہ 1,47,500 روپے کراچی میونسپلٹی نے فراہم کیے تھے اس عمارت کی تعمیر کے بعد اسے ٹاؤن ہال کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ الیگزینڈر رائف بیلی اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ ابتداء

میں اس کے ہال کو ایک ناچ گھر کے طور پر استعمال کیا گیا تھا یہاں انگریز جوڑے موسیقی کی دھن پر ڈانس کر کے اپنا دل بہلاتے تھے۔ اس 1867ء میں جب بارٹلے فریئیر گورنر بمبئی کی حیثیت سے کراچی آیا تھا تو اس نے اس عمارت میں ایک دربار منعقد کیا تھا اس کے بعد دسمبر 1869 میں اس عمارت ہی میں ایک صنعتی نمائش بھی منعقد کی گئی تھی، جو برصغیر اور وسط ایشیا میں منعقد ہونے والی سب سے پہلی نمائش تھی اس نمائش میں برطانوی، ہندوستانی اور وسطی ایشیائی ممالک کے تاجر اور صنعت کار اپنی مصنوعات کی تشہیر کرنے اور انہیں فروخت کرنے کے لیے لائے تھے۔

اس عمارت کے اوپری دو کمروں میں 1871ء میں جنرل لائبریری اور میوزیم قائم کیے گئے تھے۔ فریئر ہال کا خوبصورت مینار زمین سے 144 فٹ اونچا ہے یہ عمارت یونانی فن تعمیر کا بے مثال نمونہ ہے یہ ڈیڑھ صدی سے کراچی کی پہچان بنی ہوئی ہے۔

سندھ اسمبلی بلڈنگ

سندھ کے بمبئی پریذیڈنسی سے علیحدگی کے بعد سندھ میں 1937ء میں پہلے عام انتخابات منعقد ہوئے اور ان انتخابات کے نتیجے میں سندھ اسمبلی وجود میں آئی مگر چونکہ اس وقت تک اسمبلی کی اپنی کوئی عمارت نہیں تھی چنانچہ سندھ اسمبلی کے اجلاس جوڈیشل کورٹ بلڈنگ، جسے اب ہائی کورٹ بلڈنگ کہتے ہیں میں منعقد ہوتے تھے جلد ہی حکومت سندھ نے سندھ اسمبلی بلڈنگ تعمیر کرانے کا فیصلہ کیا اور جوڈیشل کورٹ بلڈنگ کے سامنے ایک بڑے خالی قطعہ اراضی پر اس کی تعمیر کا آغاز کیا۔ اسمبلی بلڈنگ کی تعمیر کے بعد 04 مارچ 1942ء کو گورنر سندھ سرہاگ دو نے اس کا افتتاح کیا۔ اس عمارت کی دو منزلیں ہیں یہ چونے کے پتھر سے تعمیر کی گئی ہے اس میں نہ صرف اسمبلی کے اجلاس منعقد ہوتے ہیں بلکہ صوبائی وزراء کے دفاتر بھی واقع ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد اس عمارت کو پاکستان کی قومی اسمبلی کے طور پر بھی استعمال کیا گیا تھا اس عمارت میں 14 اگست 1947ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے قائداعظم کو بحیثیت گورنر جنرل پاکستان اختیارات منتقل کیے تھے۔

سندھ ہائی کورٹ بلڈنگ

یہ عظیم الشان خوبصورت عمارت کورٹ روڈ پرانا نام کنگس دے اور اسٹریچن روڈ پرانا کوئنس

وے کے سنگم پر واقع ہے یہ اپنے زمانے کے جدید فن تعمیر کا شاہکار ہے دہلی اور لاہور میں اس قسم کی کئی عمارتیں موجود ہیں یہ رومن طرز تعمیر کی عمارت 30 لاکھ روپے کے خرچ سے 1929ء میں تعمیر ہوئی تھی یہ جودھپور کے سرخ پتھر سے تعمیر ہوئی ہے۔ اس کی بنیاد اتنی اونچی ہے کہ اس کی ایک منزل زمین دوز ہے اس کی پہلی منزل تک پہنچنے کے لیے درجنوں سیڑھیوں پر چڑھنا پڑتا ہے۔ سندھ ہائی کورٹ پہلی منزل پر واقع ہے یہ کراچی کی تمام پرانی عمارتوں میں سب سے زیادہ پروقار ہے۔ سندھ اسمبلی کی عمارت کی تعمیر سے قبل سندھ اسمبلی کے اجلاس اسی عمارت میں منعقد ہوتے تھے اس عمارت کی تعمیر 1923ء میں شروع ہوئی تھی اور 22 نومبر 1929ء کو اس کا گورنر بمبئی سر فریڈرک نے افتتاح کیا تھا۔

کراچی میونسپل کارپوریشن کی عمارت

یہ پرشکوہ عمارت بندر روڈ پر کراچی سٹی کورٹ سے متصل واقع ہے اس میں کراچی میٹروپولیٹین کارپوریشن کا ہیڈ آفس اور اسی کے دیگر دفاتر قائم ہیں۔

اس عمارت کا نقشہ ایڈنبرا کے آرکیٹیکٹ مسٹر جیمز سی وائز نے تیار کیا تھا اس کا سنگ بنیاد 14 دسمبر 1895ء کو گورنر بمبئی لارڈ سینڈ ہرسٹ Lord Sandhust نے رکھا تھا اس کی بنیاد کا کام 1915ء میں اور اس کا ڈھانچہ 05 نومبر 1927ء کو مکمل ہوا تھا۔ اس عمارت کی تعمیر 31 دسمبر 1931ء کو مکمل ہو چکی تھی اس کو مکمل ہونے میں 32 برس لگ گئے تھے۔ جس کی وجہ فنڈ کی کم یابی تھی ویسے تو 6 جنوری 1932ء کو اس عمارت کی رسم افتتاح انجام پا چکی تھی مگر 1935ء میں جارج پنجم کی سلور جوبلی سے اسے منسوب کرنے کے لیے اس کی رسم افتتاح کا سال 1935ء قرار دیا گیا تھا۔ اس کی تعمیر پر سترہ لاکھ پچھتر ہزار روپے صرف ہوئے تھے اس کی تعمیر کے نگران بلدیہ کے ایگزیکٹو انجینئر مسٹر جہانگیر این سیٹھنا تھے فورمین علی محمد امام بخش اور کنٹریکٹر نیرو کنسٹرکشن کمپنی تھی جس کا ہیڈ آفس بمبئی میں تھا اس کی تعمیر میں جودھپوری پتھر استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا طرز تعمیر یونانی ہندوستانی اور مصری فن تعمیر کا حسین شاہکار ہے اس عمارت کا ٹاور گنبد نما ہے جس پر ایک بڑی چار رخی گھڑی آویزاں ہے اسے برطانیہ کی ایک الیکٹرک کمپنی نے نصب کیا تھا۔ اس عمارت کی تمام برقی تنصیبات کا کام کراچی کی ایک الیکٹرک کمپنی میسرز اورنیٹیل جنرل انجینئرنگ نے انجام دیا تھا۔ اس کے ٹاور کی اونچائی 162 فٹ ہے یہ شہر کے کئی علاقوں سے صاف نظر آتا ہے یہ عمارت اب 60 سال سے زیادہ

پرانی ہو چکی ہے مگر اس کی خوبصورتی میں ذرا بھی فرق نہیں آیا ہے یہ برصغیر میں انگریزوں کے دور میں تعمیر ہونے والی چند شاندار عمارات میں سے ایک ہے یہ عمارت کراچی کی شناخت ہے۔

کراچی چیمبر آف کامرس کی عمارت

یہ یورپین طرز تعمیر کی شاہکار عمارت 1865ء میں وڈ اسٹریٹ پر تعمیر ہوئی تھی۔ کراچی کی تجارتی سرگرمیوں کو پروان چڑھانے کے لیے یہاں چیمبر آف کامرس کا قیام عمل میں آیا تھا۔ تقسیم سے قبل یہ عمارت سندھ اور کراچی کی تجارتی سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ کراچی کے تمام بڑے تاجر اور صنعت کار چیمبر آف کامرس کے ممبر تھے۔

یہ عمارت سرخ جودھپوری پتھر سے تعمیر کی ہوئی ہے اس میں ایک وسیع خوبصورت ہال ہے جس میں ممبران کا اجلاس منعقد ہوتا تھا اس کا فرش خوبصورت سنگ مرمر سے مزین ہے اس عمارت کو دیکھ کر لندن کی کسی خوبصورت عمارت کا گمان ہوتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی چیمبر آف کامرس کا دفتر انڈین مرچنٹ ایسوسی ایشن کی عمارت میں منتقل ہو گیا ہے اور اب اس عمارت میں ایک پرائیویٹ کمپنی کا دفتر قائم ہے۔

میری ویدر ٹاور

یہ ٹاور آئی آئی چندریگر روڈ اور ایم اے جناح روڈ کے سنگم پر کراچی خشک گودی کے سامنے واقع ہے اس ٹاور کو ایک سابق ہردلعزیز کمشنر سندھ مسٹر ولیم میری ویدر کی یاد میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس عمارت کا سنگ بنیاد 1884ء میں گورنر بمبئی مسٹر جیمز فرگوس نے رکھا تھا۔ اس کی تعمیر 1882ء میں مکمل ہوئی تھی۔ اس کا افتتاح اس وقت کے کمشنر سندھ مسٹر ایوان جیمز نے کیا تھا اس کی تعمیر کے لیے مسٹر میری ویدر کے مداحوں نے رقم فراہم کی تھی اس کی تعمیر پر 37178ء روپے خرچ ہوئے تھے یہ مخروطی ٹاور جو زمین سے 102 فٹ اونچا ہے جو دھپوری پتھر کا بنا ہوا ہے اس کے چاروں کونوں پر ملکہ وکٹوریہ کی شبیہہ نقش ہے اس پر مسٹر میری ویدر کا نام بھی کندہ ہے اس پر 70 فٹ کی اونچائی پر ایک چاررخی گھڑی آویزاں ہے اس کے اوپر چاروں طرف صیہونی طرز کے تارے بھی کندہ ہیں مگر یہ محض نقش ونگاری کا شاہکار ہے ان کا یہودیوں کے مخصوص تارے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

وکٹوریہ میوزیم بلڈنگ

یہ عالی شان عمارت یورپی طرز تعمیر کا شاندار شاہکار ہے یہ سو سال سے زیادہ پرانی ہونے کے باوجود اب بھی دلکش اور پائیدار ہے اس کی تعمیر 1887ء میں شروع ہوئی اور 1892ء میں یہ عمارت مکمل طور پر تعمیر ہو چکی تھی اس کا سنگ بنیاد ڈیوک آف کناٹ نے رکھا تھا۔اس عمارت کا افتتاح 21 مئی 1892ء کو ہوا تھا جن علاقوں پر آج پاکستان مشتمل ہے ان تمام میں یہ تعمیر ہونے والا پہلا میوزیم تھا آزادی کے بعد اسے اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے وقف کر دیا تھا۔

ایمپرس مارکیٹ

1839ء میں کراچی پر قبضہ کرنے والی برطانوی افواج کے سپاہیوں کے لیے کیمپ کے علاقے میں خرید وفروخت کے لیے جس بازار کی ابتدا کی گئی تھی وہ حیرت انگیز طور پر ترقی کر کے بہت جلد پورے شہر میں کیمپ بازار کے نام سے مشہور ہو گیا اور شہر کے دور دراز محلوں کے لوگ یہاں خرید فروخت کے لیے آنے لگے۔کراچی کی انگریز انتظامیہ نے اس بازار کی عوام میں مقبولیت کو دیکھتے ہوئے یہاں ایک عظیم الشان مارکیٹ تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا اس مجوزہ مارکیٹ کا ڈیزائن کراچی کے مشہور انجینئر مسٹر جمیز اسٹریچن نے تیار کیا۔10 نومبر 1884ء کو اس مجوزہ عمارت کا سنگ بنیاد گورنر بمبئی سر جمیز فرگوسن نے رکھا اور مسٹر جمیز اسٹریچن کی نگرانی میں اس کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔اس عمارت کی تعمیر کا ٹھیکہ تین کنٹریکٹرز کو دیا گیا تھا جن کے نام مسٹر جے ایس ایٹ فلیڈ، مسٹر ولی محمد جیون اور مسٹر ڈلو کیجو تھے اس کی تعمیر پر ایک لاکھ 55 ہزار روپے سے زائد رقم خرچ ہوئی تھی۔اس کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد 21 مارچ 1889ء کو ایک رنگا رنگ تقریب میں کمشنر سندھ مسٹر پرچرڈ Mr Pricherd نے اس کا افتتاح کیا تھا اور چونکہ اس سال ملکہء وکٹوریہ کی سلور جوبلی منائی جا رہی تھی چنانچہ اس کی مناسبت سے اس کا نام ایمپریس مارکیٹ رکھا گیا تھا۔اس کے افتتاح کے بعد کئی برس تک یہاں مقامی لوگوں کو خرید وفروخت کی اجازت نہیں تھی۔

یہ عمارت یورپین طرز تعمیر کا بہترین نمونہ ہے اسے جودھپوری سرخ پتھر سے تعمیر کیا گیا ہے اس کے ٹاور کی اونچائی 140 فٹ ہے اس مارکیٹ میں چار گیلریاں ہیں درمیان میں 130 فٹ لمبا 100 فٹ کھلا صحن ہے اس مارکیٹ میں 280 اسٹالز کی جگہ ہے جہاں پھل گوشت اور سبزیاں فروخت

ہوتی ہیں۔ یہ عمارت اب سو سال سے زیادہ عرصہ گذر جانے کے بعد بھی اپنی خوبصورتی اور پختگی کے اعتبار سے بے مثال ہے یہ عمارت اپنی ابتداء ہی سے کراچی کی شناخت بنی ہوئی ہے۔

واضح ہو کہ ایمپرس مارکیٹ کی تعمیر سے قبل خاص اس جگہ پر 1857ء میں انگریزوں کے خلاف بغاوت میں حصہ لینے والے اکیسویں رجمنٹ کے مقامی سپاہیوں کو نعرۂ آزادی بلند کرنے کی پاداش میں گولیوں سے شہید کر دیا گیا تھا۔

خالق دینا ہال

خالق دینا ہال برصغیر کی وہ واحد عمارت ہے جسے خلافت تحریک کے حوالے سے نمایاں تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ جس جگہ آج خالق دینا ہال واقع ہے وہاں 1906ء سے قبل نیٹو جنرل لائبریری کی چھوٹی سی عمارت واقع تھی یہ کراچی کی پہلی عوامی لائبریری تھی جسے کمشنر سندھ سر بارٹلے فریئر نے قائم کیا تھا اس وقت جب یہ چھوٹی سی لائبریری اپنی زندگی کے پچاس سال مکمل کر چکی تھی کراچی کی ایک ممتاز اور مخیر شخصیت سیٹھ غلام حسین خالق دینا نے اس کے لیے اپنے انتقال سے قبل اپنے وصیت نامے میں 18 ہزار روپے کی رقم اس شرط پر مختص کی تھی کہ اس رقم سے لائبریری کی پرانی عمارت کی جگہ ایک نئی وسیع اور شاندار عمارت تعمیر کی جائے لائبریری سے ملحق ایک پبلک ہال بھی تعمیر کرایا جائے جو لائبریری کی ملکیت ہو اس ہال کو کرائے پر چلا کر اس کی آمدنی سے لائبریری کا انتظام موثر طریقے سے چلایا جائے نیز نئے تعمیر شدہ ہال کو ان کے نام سے منسوب کیا جائے۔

غلام حسین دینا کی وصیت کے مطابق نئی عمارات کو تعمیر کرانے کے لیے مزید قطعہ اراضی کی ضرورت تھی چنانچہ نگران کمیٹی نے حکومت بمبئی سے مزید زمین مہیا کرنے کے لیے درخواست کی جسے 11 فروری 1902ء کو منظور کر لیا گیا۔ اس کے تحت پہلے سے موجود اراضی 2289 مربع گز میں مزید 2522 مربع گز کا ملحقہ قطعہ بھی شامل کرنے کا اجازت نامہ جاری کر دیا گیا۔ وصیت کے مطابق عمارت کے تعمیر کے سلسلے میں ایک یہ بھی مشکل تھی کہ غلام حسین خالق دینا کی عطیہ کی ہوئی اٹھارہ ہزار روپے کی رقم قطعی ناکافی تھی چنانچہ نگران کمیٹی نے کراچی میونسپلٹی سے مالی امداد کی درخواست کی۔ کراچی میونسپلٹی نے کچھ پس و پیش کے بعد اس درخواست کو منظور کر کے سولہ ہزار روپے کی رقم فراہم کر دی۔

1905 میں خالق دینا ہال کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا اور 1906ء میں یہ عمارت تیار ہو چکی تھی

اس نئی عمارت کی تعمیر پر 38 ہزار روپے خرچ ہوئے تھے اس خوبصورت عمارت میں ایک 70 فٹ لمبے اور 40 فٹ چوڑے ہال کے علاوہ لائبریری کے لیے دو کمرے بھی تعمیر کیے گئے تھے۔

16 جولائی 1906ء کو اس وقت کے کمشنر سندھ مسٹر ہینگ ہسینڈ نے اس عمارت کا افتتاح کیا تھا۔

تعمیر کے بعد اس کا ہال کراچی کی مختلف سماجی اور سیاسی تقریبات کے لیے استعمال ہوتا رہا مگر ستمبر 1921ء میں جس اس ہال میں مولانا محمد علی جوہر اور ان کے رفقاء پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا تو اس عمارت کو لازوال تاریخی اہمیت حاصل ہوگئی اور برصغیر کا بچہ بچہ اس سے واقف ہوگیا۔

خلافت تحریک کے مناسبت سے اس عمارت کے ہال کے باہر ایک کتبہ آویزاں ہے جس پر مندرجہ ذیل تاریخی عبارت کندہ ہے۔

09 جولائی 1921ء کو تحریک خلافت کے جلسے میں مولانا محمد جوہر نے ایک قرارداد منظور کرائی کہ افواج برطانیہ میں مسلمانوں کی بھرتی خلاف شرع ہے اس جرم میں مولانا اور ان کے رفقاء پر حکومت برطانیہ نے بغاوت کا مقدمہ اسی عمارت میں چلایا تھا مگر مقدمے کی پوری کاروائی کے دوران مولانا کا موقف یہ رہا

ہم کو خود شوق شہادت ہے گواہی کیسی
فیصلہ کر بھی چکو مجرم اقراری کا

اس مقدمے کے فوراً بعد ایک جعلی تنازعے کے ذریعے انگریز حکومت نے اس ہال اور لائبریری کی زمین کو کراچی میونسپلٹی سے منسلک کر دیا تھا۔س کے نتیجے میں ہال کی آمدنی کراچی میونسپلٹی کو جانے لگی۔ تاہم میونسپلٹی کو پابند کر دیا گیا کہ وہ ہال اور لائبریری کے لیے باقاعدگی سے سالانہ امداد فراہم کرکے اور عمارت کی دیکھ بھال اور ٹوٹ پھوٹ کا خیال رکھے۔ چنانچہ کراچی میونسپل کارپوریشن اس ہال اور لائبریری سے متعلق اپنی ذمہ داریوں کو نہایت احسن طریقے سے انجام دیتی رہی۔

تحریک پاکستان کے دنوں میں اس عمارت میں کئی اہم سیاسی اجلاس منعقد ہوتے رہے دراصل یہ عمارات خلافت تحریک کے بعد تحریک پاکستان کا مرکز بن گئی اور اس طرح مسلمانان کراچی پر اس عمارت کا قرض پہلے سے سوا گنا ہوگیا تھا مگر افسوس کہ قیام پاکستان کے بعد اس قرض چکانے کی بجائے اس کی وہ بے قدری ہو رہی ہے کہ اس تاریخی عمارت کا وجود ہی خطرے میں پڑتا نظر آ رہا ہے۔

وکٹوریہ گارڈن

یہ برطانوی دور میں لگایا جانے والا سب سے پہلا باغ تھا یہ باغ اس تاریخی جگہ پر لگایا گیا تھا جہاں 1799ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی فیکٹری قائم کی تھی چونکہ یہ فیکٹری مملکت سندھ کے خلاف خفیہ سرگرمیوں میں ملوث تھی۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد ہی اسے تالپور حکمرانوں کے حکم سے بند کر دیا گیا تھا اس فیکٹری کی عمارت 1838ء تک لیاری ندی کے کنارے آثار موجود تھے۔ کمانڈر کارلیس کے نقشے میں اس فیکٹری کی جگہ کی نشاندہی کی گئی تھی۔ کراچی میں برطانوی قبضے کے بعد 1840 میں ٹھیک اسی مقام پر ایک باغ لگایا گیا تھا یہ ایک وسیع و عریض باغ تھا جس میں ابتداء میں سبزیاں اگائی جاتی تھیں جو کراچی میں مقیم برطانوی فوجیوں کو فراہم کی جاتی تھیں۔ بعد میں اسی باغ کی زمین کو مزید زرخیز بنانے کے لیے یہاں لیاری ندی سے مٹی لا کر بچھائی گئی تھی۔ میجر بلیکنس اس باغ کی دیکھ بھال کے انچارج تھے۔ صرف دو سال کے عرصے میں یعنی 1845ء تا 1847ء میں اس باغ سے سبزیاں سپلائی کرنے سے سترہ ہزار روپے سے زیادہ کا منافع ہوا تھا مگر بعد میں یہ باغ سبزیاں اگانے کے لیے موزوں نہ رہا چنانچہ 1860ء میں کراچی میونسپلٹی کو یہاں ایک مکمل عوامی باغ لگانے کا کام سونپ دیا گیا۔ 1878ء میں اسے ٹریڈ سینٹر کی ایک کمپنی کے حوالے کر دیا گیا اور 1884ء میں اسے میونسپل گارڈن کمیٹی کے حوالے کر دیا گیا۔ اس کمیٹی کے سربراہ محکمہ ٹیلی گراف کے مسٹر بی ٹی فرنچ تھے اس کمیٹی کے ممبران کے نام اس طرح تھے۔

جناب حسن علی آفندی، دیارام جیٹھ مل، پٹس جی بہرام جی، مسٹر جے اسٹرپ کرنل وال کاٹ اور مسٹر برووڈ۔

ان حضرات نے اس باغ کو ترقی دینے کے لیے کئی ایک منصوبے تیار کیے جن کے نتیجے میں کچھ ہی دنوں میں یہ باغ یورپی طرز کے پھولوں اور دنیا کے مختلف علاقوں سے لائے گئے ہمہ اقسام پودوں سے مزین ہو گیا۔ 1886ء تک یہ ایک نہایت خوبصورت باغ بن چکا تھا۔ چونکہ اس وقت یہ باغ شہر سے باہر تھا چنانچہ انگریز حکام اپنی تعطیلات اور شام کے اوقات اس باغ میں گزارنے لگے یہاں آنے والے بعض افراد شکار کے بھی شوقین تھے چنانچہ انہوں نے اس باغ کو مزید پر کشش بنانے کے لیے مختلف مقامات سے پکڑنے گئے اپنے جنگلی جانوروں کو یہاں لا کر چھوڑنا شروع کر دیا۔ جب یہاں اس قسم کے جانوروں کی تعداد کافی بڑھ گئی تو ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری باغ کی

انتظامیہ کے سپرد کر دی گئی۔ 1890ء تک اس باغ میں 293 مختلف جنگلی جانور اور 465 پرندے لائے جا چکے تھے۔ بعد میں ان کو دیکھنے کے لیے عوام کو اس باغ میں داخلے کی اجازت دے دی گئی۔ کمشنر سندھ سرایوان جمیز نے اس باغ کی ترقی میں زبردست دلچسپی لی اور ان کے حکم سے 1893ء میں یہاں کیلی فورنیا سے انگور کی بیلیں لا کر لگائی گئی تھی۔

1921ء میں اس باغ کی انتظامیہ ایک کلرک، ایک چپڑاسی اور تین مالیوں پر مشتمل تھی۔ 1934ء سے قبل اس باغ کا نام وکٹوریہ گارڈن تھا۔ مگر جب جولائی 1934ء میں مہاتما گاندھی کراچی کے دورے پر آئے تو ان کے اعزاز میں کراچی میونسپل کارپوریشن کی جانب سے اس باغ میں ایک استقبالیہ دیا گیا اور اس تقریب میں اس کا نام وکٹوریہ گارڈن سے بدل کر مہاتما گاندھی گارڈن رکھنے کا اعلان کیا گیا۔

قیام پاکستان کے بعد اس باغ اور یہاں کے چڑیا گھر کو جدید خطوط پر ترقی دی گئی جس کے نتیجے میں اب اس کا شمار دنیا کے بڑے بڑے چڑیا گھروں میں ہوتا ہے۔

فریئر گارڈن

اس باغ کو فریئر ہال کی تعمیر کے کافی عرصے بعد لگایا گیا تھا قیام پاکستان سے قبل یہ کراچی کا خوبصورت ترین باغ تھا اس باغ میں میں مقامی لوگوں کے علاوہ انگریز بھی تفریح کے لیے آتے تھے۔ اس باغ کو 1887ء میں مسٹر بنجمن فرنچ نے لگوایا تھا اس کی دیکھ بھال کی ذمہ داری کراچی میونسپلٹی کی تھی۔ یہاں ہر قسم کے پھولوں کے پودے تھے اس باغ نے فریئر ہال کی خوبصورتی میں چار چاند لگا دیئے تھے اس باغ کے وسط میں ایک خوبصورت فوارہ ہے اس فوارے سے ملحق پہلے ملکہ وکٹوریہ کا مجسمہ نصب تھا جسے قیام پاکستان کے بعد ہٹا دیا گیا اس باغ کا شمار آج بھی کراچی کے خوبصورت باغوں میں ہوتا ہے۔

برنس گارڈن

یہ خوبصورت باغ 1921ء میں کراچی میونسپلٹی نے لگوایا تھا اس میں ہر قسم کے پھولوں کے پودے اگائے گئے تھے۔ قیام پاکستان سے قبل اس میں اتنے انگور پیدا ہوئے تھے کہ انہیں بیرون ملک برآمد کیا جاتا تھا۔

یہ باغ تقریباً25 ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا ہے کراچی میونسپل کارپوریشن کی 1936ء کی سالانہ رپورٹ میں اس باغ کے بارے میں یوں تحریر کیا گیا تھا۔

یہ باغ گاندھی گارڈن سے زیادہ پرانا لگتا ہے ایک ایسا وقت بھی تھا کہ جب یہ سپرنٹنڈنٹ کراچی جیل کے کنٹرول میں تھا اس باغ کا ترقیاتی کام 1921ء میں شروع ہوا تھا۔

یہ اب بھی کراچی شہر کا ایک خوبصورت باغ ہے اس باغ میں قومی عجائب گھر بھی واقع ہے۔

رام باغ

یہ کراچی شہر کا پرانا تفریحی باغ اور گراؤنڈ ہے اس کے کچھ حصے پر سبزہ اور پھولوں کی کیاریاں ہیں یہ قیام پاکستان سے قبل ہندوؤں کے مذہبی اجتماعات کے لیے مخصوص تھا تاہم یہاں کبھی کبھی سیاسی جلسے بھی منعقد ہوتے تھے اس باغ کے بارے میں ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں درج ہے کہ رام نے ہنگلاج بلوچستان جاتے ہوئے یہاں ایک رات قیام کیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ہندوؤں کے کراچی سے چلے جانے کے بعد اس باغ کا نام رام باغ سے بدل کر آرام باغ رکھ دیا گیا۔

تاریخی کلاک ٹاور

یہ کلاک ٹاور 1913 میں ممبئی کے گورنر لارڈ سائڈن ہیم کے دور میں کھولا گیا تھا اور اس وقت سے لے کر اب تک اس کی مرمت نہیں ہوئی تھی اب یہ تمام علاقہ دوبارہ مرمت ہونے کے بعد جس کو چونے کے پتھر اور سرخ اینٹوں سے تزئین کیا گیا ہے بہت ہی خوبصورت نظارہ پیش کر رہا ہے وائس ایڈمرل خالد ایم میر چیئرمین کے پی ٹی نے کیاڑی بوٹینگ بیس پر موجود سو سال پرانے اور تاریخی کلاک ٹاور جس کی حال ہی میں کے پی ٹی انتظامیہ نے دوبارہ مرمت کر کے اس کی اصل شان و شوکت کو بحال کیا کا افتتاح کیا۔

کلفٹن

یہ مقام تاریخی اہمیت کا حامل ہے سکندر اعظم کا سپہ سالار نیارکس اپنے وطن یونان واپس جاتے ہوئے 326ء قبل از مسیح میں سمندری طوفان سے بچنے کے لیے اپنے لشکر کے ساتھ یہاں

سے گزر کر کیماڑی یا منوڑے کی جانب گیا تھا اس دور کے ایک نقشے میں کلفٹن کے علاقے کو واضح طور پر دکھایا گیا ہے اور اسے ERIOS کا نام دیا گیا ہے۔ ناوٗل ہوت چند کے مطابق یہ علاقہ کسی زمانے میں کیماڑی سے ملا ہوا تھا اور درمیان میں سمندر حائل نہ تھا مگر بعد میں ایک شدید زلزلے کی وجہ سے یہ علاقہ کیماڑی سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ اس علاقے کے قریب ہی نرگسی بندر واقع تھی جو ایک طویل عرصے تک رسل ورسائل کا اہم ذریعہ رہی۔

کراچی پر انگریزوں کے قبضے کے بعد اس علاقے کو زبردست اہمیت حاصل ہوئی۔ انگریزوں نے اس مقام کی فرحت بخش ہوا اور سمندر کی موجودگی کے دلفریب نظارے سے اہل کراچی کو لطف اندوز کرانے کے لیے یہاں ضروری سہولتیں بہم پہنچائی تھیں۔ اس وقت یہاں لوگوں کو سمندر تک پہنچنے میں بڑی دقت اٹھانا پڑتی تھی کیونکہ سمندر تک پہنچنے کا راستہ پتھریلا ناہموار اور طویل تھا۔ چنانچہ سمندر تک پہنچنے کے لیے ابتداء میں ایک لکڑی کا پل تعمیر کیا گیا تھا۔ بعد میں کراچی کے ایک مخیر شخص سر جہانگیر کوٹھاری نے تین لاکھ روپے کے مصارف سے لیڈی لائڈ پائر یعنی موجودہ خوبصورت پتھر کا پل نما راستہ 1921 میں تعمیر کروایا۔ پھر کراچی میونسپلٹی نے یہاں باغ لگوایا اور بیٹھنے کے لیے بینچوں کا انتظام کیا تا کہ لوگ ان پر بیٹھ کر بحیرۂ عرب کے دلفریب موجوں کا نظارہ کر سکیں اور یہاں کی بھیگی بھیگی ہوا سے لطف اندوز ہو سکیں۔

اس علاقے کے کلفٹن نام کے بارے میں الیگزینڈر ایف بیلی اپنی تصنیف Kurrachee Post preasentand Future میں رقم طراز ہے کہ یہ نام سندھ پر قبضہ کرنے والے انگریز جنرل چارلس نپیئر کی جائے ولادت سے منسوب ہے مگر I.N.Alen لکھتا ہے کہ اس مقام کا کلفٹن کی یورپین لیڈی نے رکھا تھا۔ الیگزینڈر ایف بیلی نے اپنی کتاب میں جو آج سے تقریباً سو سال قبل شائع ہوئی تھی۔ حضرت عبداللہ شاہ غازی کے مزار کے عِلاوہ یہاں کے زمین دوز شوا مندر کا بھی ذکر کیا ہے۔

27 مئی 1970ء کے روزنامہ جنگ میں شائع ہونے والے ایک مضمون کے مطابق کراچی کے آباد ہونے سے تقریباً تین سو سال قبل کلفٹن سے ملحق علاقے سے باتھ آئی لینڈ میں ایک ''دلورائی'' نامی راجا کی حکومت تھی۔

انڈس بوٹ سفاری

ایکوٹورازم پاکستان میں ایک نیا تصور ہے جس کے فروغ کے لیے ایڈونچر فاؤنڈیشن پاکستان باقاعدہ ایک پروجیکٹ ''انڈس ڈولفن بوٹ سفاری'' کے تحت کام کررہا ہے اس پروجیکٹ کے لیے مالی تعاون یواین ڈی پی نے فراہم کیا ہے اس کے تحت دریائے سندھ میں روایتی کشتیوں کے ذریعے سفراور دریائی جاندار خصوصاً انڈس ڈولفن کا نظارہ کیا جاتا ہے پروجیکٹ کے مقاصد میں ایکوٹورازم کے فروغ کے علاوہ خطرات سے دوچار انڈس ڈولفن کے تحفظ میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کی شمولیت ہے یہ پروجیکٹ کئی اعتبار سے بہت مفید ہے اس منصوبے کی کامیابی زیادہ سیاحوں کولائے گی اوراگر آلودگی سے متعلق معاملات نہیں سلجھائے گئے تو انڈس ڈولفن متاثر ہوسکتی ہے۔

مسجد طوبیٰ

مسجد اللہ کا گھر ہے جولوگ مسجدوں کو آباد کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے گھروں کوشادو آباد کرتا ہے مسجد مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کا امتیازی نشان ہے کراچی میں بے شمار مسجدیں ہیں لیکن مسجد طوبیٰ کراچی ہی نہیں دنیا بھر میں اپنی مثال آپ ہے اس مسجد کا گنبد دنیا کا سب سے بڑا گنبد ہے دنیا بھر کی کسی اور مسجد میں اس سے بڑا گنبد موجود نہیں۔ اس مسجد کو دیکھے بغیر کراچی کی سیر ادھوری ہے یہ حسین ترین مسجد ڈیفنس فیز 11 کے علاقے میں ہے۔

قائداعظم انٹرنیشنل ایئرپورٹ

کراچی آمدرفت کے تمام ذرائع سے دنیا بھر کے ساتھ منسلک ہے برصغیر کا پہلا ہوائی اڈہ 1924 میں کراچی ہی میں تعمیر ہوا۔ اس وقت یہ ہوائی اڈہ شہر سے خاصا دور سمجھا جاتا تھا مگر یہی ہوائی اڈہ جوآج ''قائداعظم انٹرنیشنل'' کے نام سے اپنی نئی شانداراور پرشکوہ عمارت کے ساتھ موجود ہے شہر سے باہر نہیں بلکہ ہر طرف سے آبادیوں میں گھرا ہوا ہے ہوائی اڈے سے مرکز شہر کی طرف جانے کے لیے کراچی کی سب سے شاندار سڑک شارع فیصل ہے جوشہر کی ساری آبادیوں کو ہوائی اڈے سے ملاتی ہے۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق کراچی ہوائی اڈے پر روزانہ 180 ملکی و غیر ملکی پروازوں کی آمدروفت ہوتی ہے ایشیائی علاقے کا یہ سب سے معروف فضائی مستقر تقریباً 79,000 مربع میٹر رقبے پر پھیلا ہوا ہے اس کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے چاروں جانب خوبصورت سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے جو مسافروں کی آمدروفت کا نہایت سہولت بخش وسیلہ بن گیا ہے۔ قائد اعظم بین الاقوامی ہوائی اڈے کی اہم ترین خوبی یہ ہے کہ یہاں بجلی فیل ہونے کا کوئی خطرہ نہیں انتظامیہ نے بجلی کا اپنا خودکار نظام قائم کر رکھا ہے اس لیے یہاں ایک لمحے کے لیے بھی بجلی نہیں جاتی اور تمام متعلقہ کام باقاعدگی اور سبک رفتاری سے انجام پاتے ہیں یہ ہوائی اڈہ پاکستان کے فنی ماہرین کے ہنر کا شہ پارہ ہے یہاں پر جدید ترین ایکسرے مشینوں اور کلوز سرکٹ کیمروں کا ایسا اعلیٰ نظام قائم کیا گیا ہے کہ اس ہوائی اڈے کے حدود میں کوئی غلط کار یا تخریب کار راہ نہیں پا سکتا اس ہوائی اڈے میں محصولات سے مستثنیٰ ایک عظیم الشان مرکز خریداری بھی موجود ہے۔

قائد اعظم انٹرنیشنل کا جدید ٹنل سسٹم طیاروں کو سیڑھیوں سے بے نیاز کر دیتا ہے مسافر طیارے سے باہر قدم رکھتے ہی ایک سرنگ کے ذریعے سیدھے ہوائی اڈے کی عالی شان اور جگمگاتی وسعتوں میں داخل ہو جاتے ہیں ہوائی اڈے کی سات منزلہ عمارت میں پہلی منزل پروازوں کی آمد اور دوسری صرف روانگی کے لیے مخصوص ہے بقیہ منزلوں پر انتظامی دفاتر اور آخری منزل پر ایک خوبصورت ریسٹورنٹ ہے جس میں بیٹھ کر آپ آتی جاتی پروازوں کا انوکھا نظارہ کر سکتے ہیں پرانے ہوائی اڈے کو اب کارگو ٹرمینل اور حج ٹرمینل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

''کراچی، تاریخ کے آئینے میں'' تحریر: عثمان دموہی
انڈس پبلیکیشنز، کراچی

O

کراچی بندرگاہ

کراچی ایک قدرتی بندرگاہ ہونے کی وجہ سے برطانوی قبضے سے قبل ہی دور دراز ممالک تک مشہور ہو چکی تھی چین، یورپ، افریقہ، ہندوستان، سری لنکا اور خلیجی ممالک سے اس کے تجارتی تعلقات کافی پرانے تھے۔ کراچی بندرگاہ کو اس وقت تک نہ صرف پنجاب، سرحد اور افغانستان کی تجارت میں اہم مقام حاصل ہو چکا تھا بلکہ ان علاقوں پر فوجی برتری حاصل کرنے کے لیے بھی کلیدی حیثیت حاصل تھی۔

مسٹر پارکس کی زیرنگرانی کراچی کی بندرگاہ میں تعمیراتی کاموں کا آغاز ہوا ان کاموں میں کیماڑی گروسن کی تعمیر کو اولیت دی گئی اس کی تعمیر 1861ء میں شروع ہوئی اور مارچ 1863ء میں مکمل ہوگئی اس کی تعمیر سے کراچی کی بندرگاہ سمندر کی سرکش موجوں سے محفوظ ہوگئی جولائی 1886ء میں کسٹم ہاؤس کے قریب نیٹو جیٹی کی تعمیر کا کام بھی مکمل ہوگیا اس کی تعمیر سے کراچی کی تجارتی سرگرمیوں کی بے حد تقویت ملی۔

گوکہ 1854ء میں شہر کو کیماڑی سے ملانے والا پشتہ تعمیر ہوگیا تھا اور اس کی تعمیر سے کیماڑی اور شہر کے درمیان آمدورفت میں خاصی سہولت ہوگئی تھی مگر اس پشتے کی تعمیر سے چونکہ بندرگاہ پر برے اثرات مرتب ہو رہے تھے چنانچہ شہر کو کیماڑی سے ملانے کے لیے ایک آہنی پل کی تعمیر کا کام 17 فروری 1861ء کو شروع ہوا اور 1865ء میں اس کی تعمیر مکمل ہوگئی اس پل کی تعمیر پر 6 لاکھ 43 ہزار 4 سو روپے کی رقم خرچ ہوئی تھی مگر اس کی تعمیر کراچی کی تجارتی سرگرمیوں میں اضافے کا باعث ثابت ہوئی۔ بعد میں اس پل پر ریلوے لائن بچھا کر بندرگاہ کو ریل کے ذریعے اندرون ملک سے ملا دیا گیا بندرگاہ تک ریلوے لائن کے بچھائے جانے سے کراچی بندرگاہ کا براہ راست شمالی علاقوں سے رابطہ قائم ہوگیا تھا۔

1869ء میں بریک واٹر تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یکم نومبر 1870ء کو کمشنر سندھ مسٹر ولیم میری

ویدر نے اس منصوبے کا سنگ بنیاد رکھا چونکہ یہ کام نہایت اہم تھا چنانچہ اس کی تعمیر پر خصوصی توجہ دی گئی اور اسے صرف 3 سال کے عرصے میں یعنی 1874ء میں مکمل کر لیا گیا اس پشتے کی لمبائی 1500 فٹ ہے اس کی تعمیر پر 10 لاکھ 90 ہزار روپے خرچ ہوئے تھے یہ اس قدر مضبوط تعمیر ہوا ہے کہ سوائے ایک دفعہ کے کبھی اس کی مرمت کی ضرورت پیش نہیں آئی اس کی تعمیر کا اصل مقصد بندرگاہ میں لنگر انداز جہازوں کو خراب مون سون میں سمندر کی طوفانی لہروں سے محفوظ رکھنا ہے۔

1870ء میں کمشنر سندھ مسٹر میری ویدر کو کراچی بندرگاہ کی ترقی اور اس کے انتظام کے لیے ایک علیحدہ ادارہ قائم کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔ کراچی بندرگاہ کے ترقیاتی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے حکومت نے کراچی ہاربر ورکس کے نام سے سرکاری اہل کاروں پر مشتمل ایک ادارہ قائم کر دیا اس ادارے کا سربراہ کراچی بندرگاہ کا چیف انجینئر تھا دس سال تک یہ ادارہ بندرگاہ کے ترقیاتی کاموں کی نگرانی کرتا رہا اور بندرگاہ کے انتظام کو چلاتا رہا پھر 10 مارچ 1880ء کو حکومت نے نوٹیفکیشن کے ذریعے کراچی ہاربر ورکس کو کراچی ہاربر بورڈ میں تبدیل کر دیا۔

ہاربر بورڈ نے بندرگاہ کی تعمیر و ترقی کے لیے بندرگاہ ٹیکس عائد کر کے بندرگاہ میں بڑے جہازوں کو ٹھہرانے کے لیے گودیاں تعمیر کرنے کا ایک منصوبہ تیار کیا۔

کراچی بندرگاہ کے معاملات میں مقامی لوگوں کی شمولیت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے بمبئی لیجسلیٹو کونسل نے 1886ء میں کراچی پورٹ ٹرسٹ ایکٹ نمبر 6 مجریہ 1886 پاس کیا۔ اس ایکٹ کے تحت 1887ء میں ہاربر بورڈ توڑ کر کراچی پورٹ ٹرسٹ کا قیام عمل میں لایا گیا۔

بیسویں صدی کا سورج کراچی بندرگاہ کے لیے بے شمار کامیابیوں اور شادمانیوں کا پیغام لے کر طلوع ہوا۔ 1900ء تک کراچی بندرگاہ نہ صرف ایک جدید اور معروف بندرگاہ بن چکی تھی بلکہ اسے مشرق کی سب سے زیادہ گندم برآمد کرنے والی بندرگاہ کا اعزاز حاصل ہو گیا تھا۔ کراچی بندرگاہ چونکہ تجارتی اہمیت کے ساتھ ساتھ فوجی اہمیت کی بھی حامل تھی چنانچہ برطانوی حکومت نے ترقیاتی کاموں کی اس طرح منصوبہ بندی کی کہ کراچی بندرگاہ کی تجارتی اہمیت میں اضافے کے ساتھ ساتھ اس کی فوجی اہمیت میں بھی مزید اضافہ ہو سکے۔ دراصل انگریزوں کا کراچی بندرگاہ کو فوجی نقطۂ نگاہ سے ترقی دینا ان کی دور اندیشی پر مبنی تھا اور ان کی یہ دور اندیشی 1914ء میں پہلی جنگ کے موقعے پر ان کے کام آ گئی اس وقت کراچی بندرگاہ اتحادی فوجوں اور فوجی ساز و سامان کو مشرقی و مغربی محاذوں پر بھیجنے کے لیے ایک انتہائی بندرگاہ ثابت ہوئی۔

1901ء میں جہازوں کو کھینچنے والے اور سمندر کی تہہ سے کیچڑ صاف کرنے والے جہاز درآمد کیئے گئے جہازوں کی مرمت کرنے کے لیے ایک گودی بھی تعمیر کی گئی۔ 7-1906ء میں جائلز نامی وھارف تعمیر ہوئی۔اس وھارف میں تین برتھیں۔ 1908ء میں ینگ ہسبنیڈ نامی ومعارف کی تعمیر شروع ہوئی جو 1910ء میں مکمل ہوگئی۔

اس وھارف میں چار برتھیں تھیں۔ 8-1907 میں میری ویدر پائر اور اریکسن وھارف کو از سرنو تعمیر کیا گیا اس طرح 1910ء تک کراچی بندرگاہ میں کل برتھوں کی تعداد 17 ہوگئی تھی جن کی کل لمبائی 3600 فٹ تھی۔ان برتھوں پر ریلوے ویگنوں اور جدید کرینوں کی سہولت بھی موجود تھی۔اس وقت بندرگاہ میں کرینوں کی کل تعداد 89 تھی ان کرینوں میں 87 کرینیں 35 ہنڈرڈ ویٹ وزن اٹھانے والی ایک کرین 30 ٹن اور ایک 14 ٹن کی گنجائش والی تھی۔

1909 میں Bulkoil plir کی تعمیر مکمل ہوگئی اور اسے ایک پائپ لائن کے ذریعے برما آئل کمپنی اور اسٹینڈرڈ آئل کمپنی کے آئل ٹینکروں سے ملا دیا گیا۔اس سال بندرگاہ کو مزید وسعت دینے کے لیے 177 ایکڑ ساحلی علاقہ حاصل کیا گیا۔اس سال پورٹ ٹرسٹ نے منوڑہ پر پہلے سے تعمیر شدہ لائٹ ہاؤس کی از سرنو تعمیر مکمل کرائی اور اب یہ دنیا کا سب سے طاقت ور لائٹ ہاؤس بن چکا تھا اس لائٹ ہاؤس میں نہایت طاقت ور Deopric روشنی کا انتظام کیا گیا تھا۔

1914ء میں ایک Light Ship بھی خریدا گیا جسے بندرگاہ کے جنوب مشرق میں 55 میل کے فاصلے پر دریائے سندھ کے ڈیلٹا کے نزدیک سمندر میں کھڑا کر دیا گیا تھا۔یہ مشرقی سمت سے کراچی بندرگاہ کی جانب آنے والے جہازوں کی دھندیا کہر میں رہنمائی کرتا تھا۔چنا کریک ریلوے پل کی تعمیر 1910ء میں شروع ہوئی اور 1914ء میں مکمل ہوگئی۔ 1911ء میں کیماڑی اور منوڑہ کے درمیان آمدورفت کی سہولت بہم پہنچانے کے لیے بوٹ بیسن تعمیر کیا گیا۔

1914 سے 1918ء تک کراچی بندرگاہ میں بہت کم ترقیاتی کام انجام پا سکے کیونکہ اس وقت تک پوری دنیا پہلی عالمی جنگ کی لپیٹ میں آچکی تھی۔تاہم اس دوران انگریزوں نے کراچی بندرگاہ کو اس کی فوجی اہمیت کی وجہ سے اپنے فوجی مقاصد کے لیے خوب استعمال کیا بندرگاہ کے بالائی حصے کو چوڑا کرنے اور مغربی ساحلی دلدلی علاقے سے پانی کو پمپ کے ذریعے نکالنے کا کام بھی

جاری رہا۔

1919ء اور 1920ء کے دوران کراچی بندرگاہ کا سروے کیا گیا اور ستمبر 1920ء میں بندرگاہ کو ترقی دینے کے لیے ایک جامع منصوبہ بورڈ آف ٹریڈ سینٹر کو پیش کیا۔ 1941ء تک بندرگاہ کی تمام پرانی تنصیبات کو جدید بنا دیا گیا۔ 1936ء میں بندرگاہ کے مشرقی حصے پر نصب شدہ تمام بھاپ سے چلنے والی کرینوں کی جگہ بجلی سے چلنے والی جدید کرینیں نصب کردی گئیں۔

جنگ عظیم اول کی بانسبت دوسری جنگ عظیم کے دوران کراچی بندرگاہ میں کئی ترقیاتی کام انجام پائے تھے۔ 1944ء تک کراچی بندرگاہ پر جہازوں کو تیل فراہم کرنے کے لیے گیارہ برتھیں تعمیر ہو چکی تھیں۔

1942ء میں حکومت نے کراچی پورٹ ٹرسٹ کو جہازوں کی مرمت کے لیے باقاعدہ انتظامات کرنے کے لیے ہدایات جاری کیں۔ اس کے نتیجے میں کراچی پورٹ ٹرسٹ نے بندرگاہ پر جہازوں کی مرمت کے لیے جدید سہولتیں فراہم کرنے کے لیے اقدامات کیے 1943-44 کے دوران کراچی بندرگاہ پر 20 جہاز زیر مرمت تھے۔ اس وقت تک کراچی بندرگاہ جہازوں کی مرمت کے لیے اتنی اہمیت اختیار کر چکی تھی کہ یہاں جنگ کے دوران تباہ ہونے والے درجنوں جہازوں کی تسلی بخش مرمت کی گئی تھی۔

قیام پاکستان کے وقت کراچی بندرگاہ میں 28 ملین ٹن سامان سنبھالنے کی گنجائش موجود تھی۔ اس وقت اس کے پلیٹ فارم کی لمبائی 1824 فٹ تھی۔ کیماڑی پر اترنے والا سامان امپورٹ یارڈ میں رکھا جاتا تھا اس یارڈ کے 12 سائبان تھے اس یارڈ کے سامنے کھلی جگہ پر ایک 10 ٹن گنجائش کی کرین نصب تھی۔ اس کے علاوہ بندرگاہ میں 11 گشتی کرینیں بھی موجود تھیں۔ اس وقت بندرگاہ میں 150 میل لمبی ریلوے لائن بچھی ہوئی تھی۔ یہ بات قارئین کے لیے دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ اس وقت کراچی بندرگاہ سے کل برآمد ہونے والی اشیاء 6 %70 حصہ گندم اور روئی پر مشتمل ہوتا تھا۔

کراچی بندرگاہ کو چار چاند لگانے اور اسے ایک بین الاقوامی بندرگاہ بنانے میں انیسویں صدی کے بعض بین الاقوامی واقعات نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ 1850ء کے عشرے میں اس وقت

کراچی بندرگاہ کی تجارتی سرگرمیاں ایک نئے دور میں داخل ہوگئیں جب برطانوی حکومت نے روس اور امریکا کے مابین جاری تجارتی مقابلے میں شامل ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ جنوری 1852ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹر نے ایک یادداشت کے ذریعے وسطی ایشیائی ممالک، افغانستان اور ایران میں روس اور امریکی تجارتی سرگرمیوں کی جانب نہ صرف برطانوی حکومت کی توجہ مبذول کروائی بلکہ اس صورتحال سے نمٹنے اور برطانوی تجارت کو ان علاقوں میں فروغ دینے کے لیے تجاویز پیش کیں ڈائریکٹرز کی تجاویز پر حکومت بمبئی نے عمل کر کے نہ صرف روس اور امریکی تجارتی یلغار سے کامیابی سے مقابلہ کیا بلکہ ان اقدامات کے نتیجے میں وسطی ایشیائی ممالک کے لیے بذریعہ کراچی بندرگاہ برطانوی برآمدات میں ریکارڈ اضافہ ہوا۔

انیسویں صدی کے وسط میں امریکہ، یورپ کو روئی برآمد کرنے والا سب سے بڑا ملک تھا مگر 1861ء سے 1865ء تک امریکی خانہ جنگی کا شکار رہا جس کی وجہ سے اس دوران امریکی روئی کی یورپ کے لیے برآمد معطل رہی۔ جس کے نتیجے میں یورپ میں روئی کی شدید قلت ہوگئی اور کپڑے کے کارخانے متاثر ہونے لگے۔ تاہم پنجاب اور سندھ سے بڑی مقدار میں روئی یورپ پہنچنا شروع ہوگئی۔ روئی کے بڑی مقدار میں یورپ بھیجے جانے کی وجہ سے کراچی بندرگاہ کی آمدنی کے تمام سابقہ ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ امریکی خانہ جنگی 1865ء میں ختم ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی امریکہ روئی کی یورپ کو دوبارہ ترسیل شروع ہوگئی مگر پنجاب کی روئی چونکہ یورپین مارکیٹ میں اپنا ایک مقام بنا چکی تھی چنانچہ بعد کے سالوں میں بھی تقریباً 65 لاکھ روپے مالیت کی روئی ہر سال کراچی بندرگاہ سے یورپ برآمد ہوتی رہی۔

نہر سوئز کی تعمیر سے قبل یورپین جہاز برصغیر تک پہنچنے کے لیے افریقہ کا پورا چکر کاٹ کر بمبئی پہنچتے تھے یہ راستہ چونکہ نہایت طویل تھا اور اس سے نہ صرف وقت کا ضیاں ہوتا تھا بلکہ یہ بہت مہنگا بھی پڑتا تھا۔ نہر سوئز کی تعمیر سے کراچی بندرگاہ برصغیر کی یورپ سے نزدیک ترین بندرگاہ بن گئی تھی۔ اب کراچی سے برطانیہ کا فاصلہ صرف 5918 میل رہ گیا تھا کراچی اور یورپ کے درمیان فاصلے کے غیر معمولی طور پر کم ہو جانے کی وجہ سے اب یورپ سے آنے والے جہاز پہلے کراچی بندرگاہ میں لنگر انداز ہوتے اور پھر بمبئی کے لیے روانہ ہوتے اس طرح کراچی بندرگاہ میں جہازوں

کی آمد رفت میں زبردست اضافہ ہوگیا تھا۔

- 1895-96 میں کراچی بندرگاہ کے ذریعے ہونے والی کل تجارت میں پنجاب کا حصہ %43 تھا کراچی بندرگاہ کی روزافزوں ترقی اور بڑھتی ہوئی آمدنی میں پنجاب کی غیرملکی تجارت نے اہم کردار ادا کیا تھا کراچی بندرہ گاہ کے پنجاب کی تجارت میں اہم کردارادا کرنے کی وجہ سے ہی پنجاب کے بعض حلقوں کی جانب سے سندھ کو بمبئی پریذیڈنسی سے نکال کر پنجاب کے ساتھ منسلک کرنے کا پر زور مطالبہ کیا گیا تھا۔

انیسویں صدی کے اختتام تک کراچی بندرگاہ ایک اہم بین الاقوامی بندرگاہ کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ اس وقت تک نہ صرف کراچی کے دنیا کے بیشتر ملکوں سے تجارتی تعلقات قائم ہو چکے تھے بلکہ بعض اشیاء کی درآمد کے لیے ایک اہم بین الاقوامی مرکز بن چکا تھا۔

کراچی بندرگاہ پر مرحلہ وار ترقیاتی منصوبوں کے ذریعے زیادہ سے زیادہ سہولتوں کے مہیا کیے جانے کی وجہ سے کراچی بندرگاہ کی اہمیت اور شہرت میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔

''کراچی، تاریخ کے آئینے میں'' تحریر: عثمان دموہی
انڈس پبلیکیشنز، کراچی

○

مزار قائد، کراچی

کراچی شہر میں بانی پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناح کی پیدائش ہوئی اور آپ اس بارونق شہر میں 11 ستمبر کو اپنی آخری منزل کو روانہ ہوئے جناب قائد کو کراچی ہی میں سپرد خاک کیا گیا۔آپ کا خوبصورت مزار شہر کے لیے دل و جان کی حیثیت رکھتا ہے۔

مزار قائد تقریباً چھ لاکھ مربع گز کے رقبہ پر کراچی شہر کے قلب میں واقع ہے اس کا احاطہ چھ ہزار سوفٹ طویل، چھوٹی چار دیواری پر مشتمل ہے اس چار دیواری پر لوہے کی خوبصورت جالیاں نصب ہیں۔

مزار قائد کے احاطہ میں داخل ہونے کے لیے چار بڑے دروازے ہیں ایک دروازے سے صرف غیر ممالک کے سربراہوں اور اعلیٰ سرکاری حکام کی آمد پر کھلتا ہے دوسرا بڑا دروازہ جو ایم اے جناح روڈ پر واقع ہے صبح نو بجے سے دس بجے شب تک کھلا رہتا ہے اس بڑے دروازے سے طویل سیڑھیوں تک پندرہ(15) تالاب بنے ہوئے ہیں ہر تالاب اٹھائیس(28) فٹ چوڑا اور پچاس (50) فٹ لمبا ہے ہر ایک کی گہرائی تین(3) فٹ ہے۔" ہر تالاب میں دو خوبصورت فوارے ہیں اور فوارے کی لمبائی چار فٹ ہے تالابوں کے دائیں بائیں چھوٹے بڑے 120 درخت ہیں ہر درخت کے نیچے دائیں بائیں دو چھوٹی سرخ لائٹیں نصب ہیں۔

مزار قائد کا خوبصورت نمونہ بمبئی کے مشہور ماہر تعمیرات مسٹر یحییٰ مرچنٹ نے تیار کیا اور مزار قائد کا سنگ بنیاد 8 فروری 1960ء میں رکھا گیا۔مزار کی تعمیر کے پہلے مرحلہ میں اڑھائی سو فٹ وسیع چبوترا تعمیر ہوا جس کے تہہ خانے میں اصل مزار محفوظ کر دیا گیا۔یہ تہہ خانہ ایک سو چودہ فٹ گہرا ہے مقبرے کی بنیادوں میں 23 مارچ 1940ء کی قرارداد پاکستان (لاہور) کی دستاویزات اور قائد اعظم کی مختصر سوانح عمری بھی لکھی ہوئی ہیں۔مزار قائد کا گنبد سطح زمین سے 125 فٹ بلند ہے آپ کی اصل قبر سنگ مرمر کی ہے جس پر قرآنی آیات کندہ ہیں اور مزار کے ہال کے چار بڑے اور چار

چھوٹے دروازے ہیں مقبرے کے گنبد کی تعمیر پر تقریباً چھ لاکھ روپے خرچ ہوئے مقبرے کے مرکزی ہال میں ٹھوس چاندی کا 13 فٹ لمبا اور 10 فٹ چوڑا خوبصورت جالیوں کا بنا ہوا کٹہرا نصب ہے جس کے تقریباً 2 فٹ فاصلے پر پیتل کی خوبصورت جالیوں کا 21 فٹ 18 انچ لمبا اور 17 فٹ 4 انچ چوڑا کٹہرا چاندی کے کٹہرے کی حفاظت کے لیے اس کے اطراف میں نصب کیا گیا ہے چاندی کے کٹہرے کا وزن 18 ہزار تولہ اور مالیت 2 لاکھ 25 ہزار روپے ہے۔

مزار کے مرکزی ہال میں گنبد کے بیچ ایک انتہائی خوبصورت فانوس لگایا گیا ہے یہ فانوس پاکستان کے عظیم دوست ملک چین کے سابق وزیراعظم جناب چواین لائی نے اپنے عوام کی طرف سے خاص طور پر مزار قائد کے لیے بطور تحفہ حکومت پاکستان کو 20 جنوری 1971ء کو پیش کیا۔ فانوس کی لمبائی تقریباً پندرہ فٹ ہے اور اس کا وزن تین ٹن ہے فانوس کے نچلے حصے میں لگے ہوئے ستاروں کی تعداد سترہ ہے یہ فانوس صحیح معنوں میں اپنی مثال آپ ہے مزار کا اندرونی قطر 75 فٹ ہے اور بیرونی قطر 72 فٹ ہے مزار پر روشنی پھینکنے کے لیے لائٹ کے تقریباً 9 بلند لوہے کے چار ٹاور ہیں دو ٹاوروں میں بارہ بارہ سرچ لائٹیں اور دوسرے دو ٹاوروں میں سات سات سرچ لائٹیں ہیں چاروں ٹاور مزار کے چاروں کونوں پر تقریباً سو فٹ کے فاصلے پر نصب ہیں مزار قائد کی عمارت کی صفائی کے لیے ایک خاص مشین درآمد کی گئی جس کی مالیت 25 ہزار روپے کے قریب ہے۔

مزار کی دیکھ بھال کے لیے دفتری عملہ ہمہ تن مصروف رہتا ہے مزار قائد پر بری، بحری اور فضائی افواج کے دستے باری باری چار چار ماہ تک پہرہ دیتے ہیں 15 جنوری 1971ء کو سب سے پہلے پاک بحریہ کے محافظ مزار قائد پر متعین کیے گئے تھے۔

○

باغ قائد، کراچی

مزار قائد اعظم اپنی تعمیر کے بعد اب کراچی کی شناخت بن چکا ہے 25 دسمبر 2000ء کو سابقپاکستان جنرل پرویز مشرف نے مزار کے احاطے میں باغ قائد اعظم کا افتتاح کیا۔ 10 ماہ کی ریکارڈ مدت میں 25 کروڑ روپے کی لاگت سے مکمل ہونے والا 60 ایکڑ رقبے پر محیط باغ قائد اعظم کو بانی پاکستان کے شایان شان بنانے میں مسلح افواج کی کور 5 کے افسران اور جوانوں کے علاوہ کے ایم سی، ڈی ایم سیز، کے ڈی اے اور بعض نجی اداروں نے بھرپور کردار ادا کیا اس تمام کام کی نگرانی کور 5 کے کمانڈر بریگیڈئر آصف غزالی اور پراجیکٹ ڈائریکٹر بریگیڈیئر آنذیری عبداللہ زبیر نے کی۔ انکے ہمراہ معاونت میں ڈیزائن بیورو کے ڈی اے کے ڈائریکٹر ضیغم جعفری پراجیکٹ ڈائریکٹر کرنل عبدالرحیم، انجینئرنگ انچارج کرنل وحید اور انچارج کوالٹی کنٹرول کیپٹن علی یامین قریشی شامل ہیں۔

صدر پاکستان مزار قائد اعظم کے دورے پر تشریف لائے تو انہوں نے مزار قائد اعظم کے اس منصوبے کو صرف ایک سال میں مکمل کرنے کا حکم دیا۔ سربراہ مملکت کے حکم کے بعد کور 5 کے نوجوانوں نے اس منصوبے کو ایک مشن کے طور پر شروع کیا اور چیلنج قبول کرتے ہوئے نہ صرف اسے دس ماہ میں مکمل کر دیا بلکہ 7 کروڑ روپے بھی بچا دیئے۔

باغ قائد کا ڈیزائن ''چہار باغ'' سے مطابقت رکھتا ہے اس کی ڈیزائننگ میں تہذیب و تمدن، ثقافت اور مسلم تاریخ کو انتہائی باریک بینی کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے اور پھر اس میں اکیسویں صدی کا جدید رنگ بھی کمال مہارت کے ساتھ بھر دیا گیا ہے مسلم معاشرے کے مطابق تیار کیا گیا یہ پراجیکٹ چار حصوں میں منقسم ہے 61 ایکڑ اراضی پر مشتمل اس منصوبے میں واٹر چینلز، سرسبز گھاس کے لان، پھولوں کے باغیچے جاگنگ ٹریک اور مزار قائد کی جانب جانے والی خوبصورت سیڑھیوں کی تشکیل نفاست سے عمل میں لائی گئی ہے یہاں پر مختلف ملکی و غیر ملکی اقسام کے درختوں کے ساتھ ساتھ نرم گھاس لگانے کی منصوبہ بندی بھی کی گئی ہے۔

باغ قائد میں پارکنگ، مسجد بیت الخلاء اور سوونیر شاپ کی سہولیات بھی موجود ہیں اس کی دیکھ بھال کے لیے کراچی واٹر اینڈ سیوریج بورڈ نے 3 لاکھ گیلن پانی فراہم کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے۔ شام اور رات کے اوقات میں باغیچوں کے مختلف حصوں میں روشنی اور پانی کے فواروں میں لائٹنگ کا انتظام بھی موجود ہے یہ پراجیکٹ بانی پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناح کے لیے بہترین خراج عقیدت ثابت ہوگا۔

باغ قائد کے لیے مختص اراضی سے 112 ایکڑ پر لان تیار کیے گئے ہیں جبکہ 122 ایکڑ کے رقبے پر درخت لگائے جانے کا پروگرام ہے 18 ایکڑ اراضی راستوں اور سیڑھیوں کے لیے مخصوص ہے جبکہ بقیہ زمین کو واٹر فال ہریالی اور دیگر تفریحی کاموں کے لیے وقف کر دیا گیا ہے چونکہ یہ ایک قومی اہمیت کا حامل پراجیکٹ ہے اس لیے کوالٹی کنٹرول اولین ترجیحات میں شامل ہے اس مقصد کے لیے اعلیٰ قسم کا میٹریل بہتر سرپرستی اور انتہائی ماہر افراد سے کام لیا گیا۔

باغ قائداعظم کے منصوبے کے دوسرے فیز میں مزار قائد کا ترقیاتی پراجیکٹ شامل ہے جس میں ایک لائبریری، آڈیٹوریم اور بچوں کے لیے ایک کھیل گھر شامل ہے اس پراجیکٹ کے لیے 151 ایکڑ زمین مختص کر دی گئی ہے باغ قائد کے لیے درختوں کا انتخاب شہر کی آب و ہوا اور ماحول کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا جا رہا ہے یہاں ایسے درخت لگائے گئے ہیں کہ جس سے مزار کے منظر پر کوئی برا اثر نہ پڑے اور اس سلسلے میں اس بات کا انتہائی خیال رکھا گیا ہے کہ ایسے درخت لگائے جائیں جو ماحولیاتی آلودگی کو کم کرنے میں مددگار ثابت ہوسکیں۔ باغ قائد کی مینجنگ ٹیم مزار کے سنگ مرمر سے بنے ہوئے مقبرے کے غسل کا بھی انتظام کر رہی ہیں تا کہ اس کو صاف وشفاف اور چمکدار رکھا جا سکے۔

باغ قائد کا تصور شروع میں تو شالامار باغ پر منحصر تھا لیکن بعد میں اسلامی دنیا کے 27 باغات کے گہرے مطالعے کے بعد اس جدید منصوبے کو حتمی شکل دی گئی مزار کے چاروں اطراف پانی کی فراہمی کے لیے واٹر چینلز کا نیٹ ورک بچھایا گیا ہے۔

باغ قائد کی تکمیل کے بعد اس کی مکمل دیکھ بھال اور خوبصورتی کو برقرار رکھنے کے لیے نہایت موثر اقدامات کیے گئے ہیں پہلے سال تک پراجیکٹ ڈائریکٹوریٹ باغ قائد کی مناسب دیکھ بھال اور انتظامی امور کی سرپرستی کے فرائض سرانجام دے گا۔ جبکہ اس کے بعد یہ ذمہ داری قائداعظم مزار مینجمنٹ بورڈ کو سنبھالنا پڑے گی پراجیکٹ کے انجینئرنگ کے شعبے میں بھی اسلامی انداز کو ہو بہو مدنظر رکھا گیا ہے اور تعمیراتی کام میں ISO--9000 کوالٹی اسٹینڈرڈ کو یقینی بنایا گیا ہے

باغ قائد کے لیے روشنیوں کا انتخاب بھی اس معیار کے عین مطابق کیا گیا ہے لائٹنگ کے لیے اندرون ملک سمیت بیرون ملک سے بھی سامان منگوا کر یہاں نصب کروایا گیا ہے اور اس طرح باغ قائد ایک بین الاقوامی معیار کا پہلا پاکستانی باغ بن چکا ہے۔

مزار قائد کی تعمیر و ترقی کے منصوبے کو اہالیان کراچی نے بے حد سراہا ہے اور توقع ظاہر کی ہے کہ باغ قائد کی تعمیر سے اہل کراچی کو سیر و تفریح کے لیے ایک اور اہم مقام مل گیا ہے اس سے قبل عموماً لوگ مزار قائد پر فاتحہ خوانی کے لیے آتے تھے اور جلد ہی واپس چلے جاتے تھے مگر اب فاتحہ خوانی کے ساتھ یہاں سیر و تفریح سے بھی بھرپور لطف اندوز ہوتے ہیں اس سے مزار قائد پر آنے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

باغ قائد اعظم کے اس منصوبے میں تین ہزار درخت اگائے گئے چار لاکھ مربع فٹ گھاس اگائی گئی ساڑھے 23 ہزار پھولوں کے پودے لگائے گئے تمام احاطے میں از سر نو بجلی کی وائرنگ کی گئی اور چوالیس ہزار پانچ سو فٹ لمبے زیر زمین پاور کیبل بچھائے گئے پانی کے 13 تالاب بنائے گئے جن میں فوارے نصب کیے گئے ہیں فواروں کو رنگ برنگی زیر آب روشنیوں سے سجایا گیا ہے اور تمام سجاوٹی روشنیاں جرمنی سے منگائی گئی ہیں تالابوں میں پانی بھرنے اور فواروں تک لانے کے لیے پمپ ہاؤس تک پہنچانے کے لیے 31 ہزار دو سو فٹ طویل پائپ لائنیں بچھائی گئی ہیں باغ کی تعمیر کے دوران چونسٹھ لاکھ نواسی ہزار ایک سو چون مربع فٹ اوتھ ورک اور ایک لاکھ اٹھتر ہزار سات سو پچاس مربع فٹ کنکریٹ ورک کیا گیا ہے باغ قائد اعظم کی تعمیر کے مرحلے میں چھیاسٹھ ہزار آٹھ سو مربع فٹ سنگ مرمر استعمال کیا گیا ہے جبکہ دوسرے مرحلوں میں کل چار لاکھ ستائیس ہزار مربع سنگ مرمر کا کام ہونا ہے۔

مزار کے احاطے میں عوام کی سہولت کے لیے پینے کے پانی کے نل نکالے گئے ہیں اور بیت الخلا بھی تعمیر کئے گئے ہیں لوگوں کے آرام کے لیے سنگی نشستیں جا بجا نصب کی گئی ہیں اور پیدل چلنے کے لیے راہ داریاں اور تالابوں کے اوپر پلیاں بنائی گئی ہیں۔ 25 دسمبر کو جب باغ قائد اعظم کو عوام کے لیے کھولا گیا تو اس روز تقریباً اڑھائی لاکھ افراد اسے دیکھنے کے لیے آئے مستقبل میں بھی قومی دنوں اور مذہبی تہواروں پر عوام کی اتنی بڑی تعداد یہاں کا رخ کرے گی۔

سید محب شاہ۔ ہفت روزہ فیملی میگزین لاہور

18 تا 24 جون 2000ء

○

کراچی کی آرٹ گیلریاں

آرٹ گیلریاں کسی بھی ملک وقوم کی تہذیب وتمدن اور ثقافت کی مظہر ہونے کے علاوہ اس قوم کی آرٹ سے دلچسپی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ پاکستان اس حوالے سے خوش قسمت ہے کہ یہاں قیام پاکستان سے ہی فنون لطیفہ کو قدر ومنزلت حاصل رہی ہے اور آج پاکستان کے تمام بڑے شہروں میں آرٹ گیلریاں، فنون لطیفہ کی ترویج کا باعث بنی ہوئی ہیں۔ کراچی کی آرٹ گیلریاں اس حوالے سے قابل مثال ہیں کہ یہاں ناپید فنون کو ازسرنو زندہ کیا گیا اور پاکستان ومشرقی فنون کو دنیا بھر میں متعارف کرانے کے لیے آرٹ گیلریوں کو کمرشل پیمانے پر استوار کیا گیا ہے۔

آزادی کے وقت یعنی 1947ء میں فنون لطیفہ سے متعلق سرگرمیاں سمٹ کر لاہور تک محدود ہوگئی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آرٹ سے متعلق اہم ادارے لاہور میں تھے جبکہ باقی بھارت میں رہ گئے تھے۔ 1875ء میں انگریزوں نے لاہور میں میوسکول آف آرٹس بنوایا تھا جو فن اور فنکاروں کی خدمت کے حوالے سے بہت مصروف تھا۔ قیام پاکستان کے بعد عروس البلاد کراچی نے بھی فن کی خدمت کے حوالے سے بہت مصروف تھا پھر پنجاب یونیورسٹی میں قائم ہونے والا فنون لطیفہ کا شعبۂ آرٹ میں فیچرز فنکاروں اور ڈیزائنرز کی تربیت کی جاتی تھی گویا فنون لطیفہ کے حوالے سے شروع سے ہی لاہور کی ایک خاص پہچان رہی ہے اور اسے فن اور فنکاروں کا شہر خیال کیا جاتا رہا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد عروس البلاد نے کراچی نے بھی فن کی خدمت کا بیڑہ اٹھایا۔ نامساعد حالات اور شہری مسائل کے باوجود یہاں بڑی تعداد میں آرٹ سکول اور آرٹ گیلریاں قائم کی گئیں اور فنکاروں نے فن کو زندگی بخشی۔ کراچی کی آرٹ گیلریاں کسی نہ کسی حوالے سے انفرادیت اور اہمیت کی حامل ہیں۔

کراچی کی سب سے پہلی آرٹ گیلری مصروف فنکار بشیر مرزا نے 1964ء میں قائم کی جلد ہی یہ گیلری فن پاروں کی نمائش کے حوالے سے مرکزی مقام کی حیثیت سے اختیار کر گئی۔ 1970ء

کی دھائی میں جب فنون لطیفہ کی طرف سنجیدگی سے توجہ دی گئی اور پاکستان بھر سے فنکاروں نے کراچی میں اپنی نمائشیں منعقد کرانا شروع کیں تو کئی مزید گیلریوں کی ضرورت پیش آئی گویا یوں یہ صنعت بن گئی اور مختصر عرصے میں بہت سی کمرشل گیلریاں قائم ہوگئیں۔فنون لطیفہ کے مداحین کے لیے نمائشیں دیکھنا ان کے ذوق کی تسکین تھا۔ خواہ وہ فن پارہ خریدیں یا نہ خریدیں۔ کلفٹن کے علاقے میں آرٹ کلیکٹر ز گیلری اپنی مثال آپ ہے سلطان محمود نے اپنے جمع کیے ہوئے فن پاروں کی حفاظت اور نمائش کے لیے یہ آرٹ گیلری قائم کی چالیس سال پر مشتمل آرٹ کا ان کا ذاتی ذخیرہ ہزراوں پینٹنگز پر مشتمل ہے اس ذخیرے سے پتہ چلتا ہے کہ گذشتہ 40 سالوں کے دوران ان فنون لطیفہ میں کیا کیا تبدیلیاں آئی ہیں۔ پاکستان میں آرٹ پر ہونے والا کام کس حد تک بہتر ہوا ہے اور تب اور اب اس میں کیا فرق ہے آرٹ کے طالب علموں کے لیے یہ گیلری بذات خود ایک کتاب ہے۔ سلطان محمود ان ابتدائی لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے آرٹ کو ذخیرہ کرنا شروع کیا۔ان کے پاس بعض ایسی نادر پینٹنگز ہیں جو کہیں اور نہیں ملتیں۔ ماضی کے ساتھ ساتھ وہ حال سے بھی رشتہ جوڑے ہوئے ہیں اور نو آموز باصلاحیت فنکاروں کی حوصلہ افزائی کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ سارا سال نوجوان غیر معروف آرٹسٹوں کے فن پاروں کی نمائش ان کی گیلری میں ہوتی رہتی ہے جو فن پارے مستقل طور پر اس گیلری کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ ان میں عبد الرحمٰن چغتائی، محمد سردار منصور آئی مقصود علی وغیرہ کا کام نمایاں ہے نوادرات اور دنیا بھر سے خوبصورت مجسمے بھی یہاں رکھے گئے ہیں۔

''چوکنڈی آرٹ'' کو فنون لطیفہ میں ہونے والی نت نئی تبدیلیوں اور تازہ ترین فن پاروں کے حوالے سے انفرادیت حاصل ہے اس کی مالک زہرہ حسین ہیں اس آرٹ گیلری کا قیام 1985ء میں عمل میں آیا۔ گیلری میں پاکستان کے معروف فنکاروں کے متاثر کن فن پارے رکھے گئے ہیں زہرہ حسین یہاں بہترین اور معیاری نمائشیں منعقد کراتی ہیں اور یہی اس آرٹ گیلری کی انفرادیت ہے معروف فنکاروں کے فن پاروں سے بجی اس گیلری میں بے شمار بہترین پینٹنگز اپنی باری کے انتظار میں ہیں کہ کب وہ نمائش پذیر ہوں گی۔ البتہ ایسے مداحین کو جو انہیں خریدنے کی خواہش رکھتے ہیں ذاتی درخواست پر دکھا دی جاتی ہیں۔ چوکنڈی آرٹ، سارا سال بے حد مصروف رہتی ہے مداحین اور طالب علم خاص طور پر یہ دیکھنے کے لیے یہاں آتے ہیں کہ فنون لطیفہ میں کونسی جدت آئی ہے اور معروف فنکاروں کے کام میں کونسی نئی تبدیلیاں آئی ہیں۔

کلفٹن آرٹ گیلری میں جہاں معروف فنکاروں کے دیدہ زیب فن پارے آویزاں ہیں وہیں گیلری کے دو فلور مکمل طور پر نمائشوں کے لیے مخصوص ہیں یہاں صرف معروف فنکاروں کے کام کی نمائش منعقد نہیں کی جاتی بلکہ غیر معروف مگر باصلاحیت فنکاروں کی بھی بھرپور حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ یہاں نام سے زیادہ کام کی قدر و قیمت ہوتی ہے مقامی فنکاروں میں یہ آرٹ گیلری بہت مقبول ہے۔

فرنچ قونصلیٹ کے قریب کراچی کی ابتدائی آرٹ گیلریوں میں سے ایک نہایت شاندار انڈس گیلری ہے جو 1970ء میں قائم کی گئی اس کے مالک سید علی امام ہیں جو فنون لطیفہ کے حوالے سے نہایت محترم شخصیت ہیں۔ منی ایچر پینٹنگز اور نوادرات کا ایک ذخیرہ ان کے پاس ہے انڈس گیلری اس وقت کراچی میں آرٹ کے قدردانوں اساتذہ اور ذرائع ابلاغ کے لیے پسندیدہ ترین مقام ہے جہاں وہ سید علی امام کے خزانے سے نظریں سیراب کرنے کے ساتھ ساتھ فنون لطیفہ پر معلومات افزاء اور فکر انگیز گفتگو بھی کر سکتے ہیں۔ تصدیق سہیل، ایف این سوز، اور گل جی جیسے فنکار اس گیلری کی سرگرمیوں میں باقاعدگی سے حصہ لیتے ہیں۔

فریئر ہال جو 1880 میں ''سر بارٹلے فریئر'' نے قائم کیا تھا، یہاں کی آرٹ گیلری کو عظیم فنکار ''صادقین'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے کیونکہ صادقین نے اپنی زندگی کا آخری کام یہیں کیا تھا موت سے چند ماہ پہلے انہوں نے گیلری کی اندرونی چھت پر خطاطی کا آغاز کیا تھا مگر پھر ان کی وفات کی وجہ سے یہ کام نامکمل رہ گیا۔ اکثر لوگ نمائشیں اور معروف فنکاروں کے فن پارے دیکھنے سے زیادہ صادقین کی زندگی کا آخری کام دیکھنے کے لیے یہاں آتے ہیں۔ صادقین نے فنون لطیفہ کے شعبے میں ایک نئے طبقہ فکر کو متعارف کروایا۔ گیلری میں صادقین کے فن پارے مستقل طور پر آویزاں کیے گئے ہیں۔ جن میں خطاطی کے نمونوں کی نمایاں تعداد ہے۔ خطاطی کے ذریعے یہاں فیض رحمین کے بنائے ہوئے پورٹریٹ بھی نمایاں ہیں۔ فیضی کو پورٹریٹ کے حوالے سے جو شہرت حاصل ہے وہ کم لوگوں کے حصے میں آئی ہے ان کا کام لندن کی سٹیٹ گیلری میں بھی دکھایا گیا ہے۔ فیضی معروف پورٹریٹ ''جان سنگر سارجنٹ'' کے شاگرد تھے۔ فیضی کا خواب تھا کہ برصغیر میں فنون لطیفہ کے حوالے سے ہونے والے کام کو از سر نو زندہ کیا جائے یہی مقصد لے کر وہ یورپ سے ایشیاء واپس آ گئے تھے۔

حال ہی میں قائم ہونے والی کنج گیلری واحد گیلری ہے جو فنکاروں کو رہائش بھی مہیا کرتی

ہے یہاں جدید ترین سہولیات سے آراستہ سٹوڈیو بنایا گیا ہے ایک رہائشی علاقہ اور کئی ہال جہاں پاکستان کے مختلف شہروں اور بیرون ملک سے آنے والے آرٹسٹ رہائش پذیر ہوتے ہیں۔

رنگون والا سینٹر میں ''وی ایم گیلری'' بھی بہت اہمیت کی حامل ہے۔ کراچی کی تمام آرٹ گیلریوں میں یہ سب سے کم کمرشل ہے۔ رفعت علوی اس کو چلا رہی ہیں رفعت کی ان تھک کوششوں اور ساتھیوں کے تعاون سے وہ الم گیلری'' ایک اہم آرٹ ڈسپلے سنٹر کے طور پر کام کر رہی ہے۔ برطانیہ، چین، سری لنکا، اور بنگلہ دیش وغیرہ سے آرٹسٹ آکر یہاں اپنے فن پاروں کی نمائش کرتے ہیں۔ یہاں باقاعدگی سے آرٹ پر لیکچرز اور ڈسکشن ہوتی ہے۔ پاکستان چیئر آف دی ایشن واٹر کلر ایسوسی ایشن کی سربراہی میں رفعت کر رہی ہیں اور وہ مقامی فنکاروں کی بے حد حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ کہ وہ اس شعبے میں مزید کام کریں پھر ان کا کام یہاں اور ملک سے باہر نمائش کے لیے رکھا جاتا ہے۔

کراچی کے معروف فنکار اپنی انفرادیت اور مختلف انداز کی وجہ سے منفرد سمجھے جاتے ہیں اور ملک کے ان چند آرٹسٹوں میں شامل ہیں جو اپنے کام کی وجہ سے خاصی شہرت کے حامل ہیں۔ باصلاحیت، متحرک، محنتی اور اپنے کام کی لگن رکھنے والے ان فنکاروں میں ایک بڑی تعداد خواتین کی ہے۔

کراچی کی آرٹ گیلریاں دیکھنے کا جب بھی ارادہ کریں یہ یقین کرلیں کہ آپ کے پاس اچھی خاصی رقم ہے کیونکہ باصلاحیت آرٹسٹوں کے اصل فن پارے دیکھ کر آپ انہیں خریدے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔

○

وزیر مینشن، کراچی

قائداعظم کی جائے پیدائش، وزیر مینشن کراچی کے مغرب میں مشہور و معروف تجارتی علاقے کھارادر میں میری ویدر ٹاور سے کچھ فاصلے پر ایم اے جناح روڈ سابقہ بندر روڈ پر کیماڑی سے آتے ہوئے بائیں جانب نیونہام روڈ اور چھاگلہ اسٹریٹ کے سنگم پر واقع ہے یہ تین منزلہ خوبصورت عمارت تقریباً ڈیڑھ صدی (1860-70) قبل تعمیر کی گئی اور آج بھی اپنی مضبوطی اور شان و شکوہ کے اعتبار سے علاقے کی خوبصورت عمارتوں میں شامل ہے۔ عمارت کی تعمیر میں پہاڑی پتھروں کے بلاک، چونے پٹ سن کے ریشے اور گارے کے آمیزے سے چنے گئے ہیں عمارت کا رقبہ تقریباً 125 مربع گز ہے۔

قائداعظم کے والد جینا بھائی کاٹھیاواڑ کی ریاست گوندل سے نقل مکانی کر کے 1872ء میں کراچی تشریف لائے اور کھارادر کے علاقے میں یہ عمارت خریدی۔ انہوں نے یہ عمارت کس سے خریدی یہ عمارت کس کی تھی اور کس نے تعمیر کرائی تھی اس بارے میں کوئی شہادت نہیں ملتی۔ قائداعظم کے والد اس عمارت میں تقریباً 20 سال رہائش پذیر رہے اور یہیں پر ان کی تمام اولادیں پیدا ہوئیں جن میں قائداعظم، محترمہ فاطمہ جناح محترمہ شیریں بائی اور دیگر اولادیں شامل ہیں۔

قائداعظم محمد علی جناح دسمبر 1876 میں پیدا ہوئے اور 1892ء تک یہاں مقیم رہے گویا آپ نے تقریباً 16 سال اس عمارت میں گذارے۔ بعد ازاں جب قائداعظم اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن چلے گئے تو ان کے والد نے یہ عمارت 1893 میں ایک شخص گوردن داس نوتن داس کو فروخت کر دی۔ قیام پاکستان کے بعد وزیر محمد پونا والے نے یہ عمارت گوردن داس نوتن داس سے خرید لی اور اسے اپنے نام سے موسوم کر دیا جس کے بعد سے یہ وزیر مینشن کے نام سے مشہور ہے۔

نومبر 1952ء میں کراچی کے اس وقت کے میئر حاتم علوی کی زیر صدارت میونسپل کارپوریشن کے کونسلروں کے اجلاس میں طے پایا کہ قائداعظم کی جائے پیدائش کو قومی یادگار کے

طور پر حاصل کرلیا جائے۔

حکومت پاکستان نے ایک معاہدہ کے تحت 1953ء میں اس عمارت کو وزیر محمد پوناوالے سے خرید کر اپنی تحویل میں لے لیا اور پی ڈبلیو ڈی کو اس کی تعمیر نو و تزئین و آرائش کی ذمہ داری سونپی۔ 13 اگست 1953ء کو یہ عمارت ڈیپارٹمنٹ آف آرکیالوجی کے حوالے کر دی گئی۔ ڈیپارٹمنٹ نے عمارت میں ضرورت کے مطابق تبدیلیاں کیں اور عمارت کو قائداعظم کے استعمال کی اشیاء کے حوالہ سے میوزیم میں منتقل کر دیا۔

عمارت کا مرکزی دروازہ چھاگلہ اسٹریٹ کی طرف لمبائی والے حصے میں ہے چھاگلہ اسٹریٹ اور نیو نہام روڈ دونوں جانب سے چھ سات فٹ کے فاصلے پر لوہے کا جنگلہ بنا ہے پہلے عمارت کی سیڑھیاں باہر کی طرف تھیں بعد میں یہ سیڑھیاں اندر دائیں جانب دیوار کے ساتھ بنائی گئیں اور اس طرح دوسری منزل پر کمروں کی ترتیب ذرا تبدیل ہوگئی۔

عمارت میں داخل ہوتے ہی پہلی منزل پر کتب خانہ و ریڈنگ روم ہے، ہوسکتا ہے پہلے یہاں کمرے ہوں مگر اب یہ ایک وسیع ہال ہے جو پوری عمارت کی لمبائی چوڑائی پر محیط ہے یہ حصہ اخبار بینی اور لائبریری کے لیے مخصوص ہے اور روزانہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد یہاں مطالعہ کے لیے آتی ہے یہاں ملک بھر کے چیدہ چیدہ اخبارات آتے ہیں ہال میں چار بڑی میزیں ملا کر رکھی گئی ہیں جن کے گرد کرسیاں موجود ہیں کرسیوں کے پیچھے الماریاں رکھی گئی ہیں جن میں قائداعظم مسلم لیگ کانگریس، تحریک آزادی اور مشاہیرے سے متعلق کتب کا ذخیرہ ہے جسے نہایت قرینے سے سنبھال کر رکھا گیا ہے اس کے علاوہ اخبارات، ڈان، پاکستان آبزور، پاکستان ٹائمز، جنگ اور مارننگ نیوز، کے (70-1955) کے اخبارات کو چمڑے چرمی جلدوں میں محفوظ کر کے رکھا گیا ہے۔

دوسری منزل

سیڑھیاں چڑھتے ہی دائیں جانب دوسری منزل کا دروازہ ہے یہ منزل برآمدے کے ساتھ لائن میں سے تین کمروں پر مشتمل ہے کمروں کا رخ چھاگلہ اسٹریٹ کی جانب ہے پہلے کمرے میں ایک صوفہ سیٹ، ایک سائیڈ ٹیبل اور ایک قالین رکھا ہے یہ چیزیں آپ نے گورنر جنرل کی حیثیت سے استعمال کیں دوسرے کمرے میں ایک مسہری ہے جس پر قائداعظم نے آخری سانسیں لیں یہاں پر بھی ایک صوفہ سیٹ رکھا ہوا ہے جو پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے آپ کے زیر

استعمال رہا۔ تیسرا اور آخری کمرہ جو عمارت کے نیونہام روڈ اور چھاگلہ اسٹریٹ کے سنگم پر کونے میں ہے۔ یہاں قائداعظم محمد علی جناح پیدا ہوئے کمرے میں قائداعظم کی پیدائش کی تاریخ 25 دسمبر 1876ء کندہ ہے اس کمرے میں قائداعظم کی ذاتی استعمال و مطالعہ کی کتب الماری میں رکھی ہوئی ہیں یہ کتب آپ کے دوران وکالت زیر مطالعہ رہیں اور زیادہ تر قانون سے متعلق ہیں۔ کمرے میں وہ میز اور کرسی بھی رکھی ہوئی ہے جو آپ نے گورنر جنرل کی حیثیت سے استعمال کی ان تمام کمروں کو شیشے کے فریم لگا کر محفوظ کر دیا گیا ہے۔ شائقین صرف ان چیزوں کو دیکھ سکتے ہیں چھونہیں سکتے۔

تیسری منزل

اس منزل پر کمروں کو ختم کر کے وسیع ہال بنا دیا گیا ہے۔ یہاں پر مجموعی طور پر 9 شوکیس ہیں جن میں تین بڑے شوکیس ہال کے درمیان میں رکھے ہوئے ہیں اور چھ چھوٹے شوکیس تین دیواروں پر نصب ہیں ایک شوکیس میں قرآن پاک کا ایک قلمی نسخہ رکھا ہے جو مطلا ہے سونے کے پانی سے آیات کو تحریر کیا گیا ہے اور خوبصورتی کے ساتھ جلد بندی کی گئی ہے دوسرے شوکیس میں پتھر کا ایک تراشا ہوا تین منزلہ ٹاور رکھا ہے جس سے قائداعظم کے تین زریں اصولوں ایمان، اتحاد اور یقین کو ظاہر کیا گیا ہے یہ ماڈل مسلم مارواڑی سلوات جماعت نے قائداعظم کو تحفتاً پیش کیا تھا ایک شوکیس میں قائداعظم کے یورپی طرز کے وہ لباس سجے ہیں جو آپ نے استعمال کیے قائداعظم خوب سیرت اور خوش اخلاق ہونے کے ساتھ ساتھ خوش لباس بھی تھے آپ کرتے پائجامے کے علاوہ تھری پیس سوٹ اور اس سے میچ کرتے ہوئے جوتے بھی استعمال کرتے تھے یہ لباس بھی شوکیس میں سجا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے زیر استعمال کرتے، قمیض، چوڑی دار پائجامہ، شیروانی، کلف لگے کچھ کالر بھی یہاں شوکیس میں رکھے ہیں ان اشیاء کے علاوہ ہال میں ایک طرف ڈرائنگ روم کا فرنیچر بھی رکھا ہے جسے قائداعظم نے ذاتی طور پر آرڈر دے کر بمبئی آرٹ فرنیچر کمپنی سے تیار کروایا تھا۔ یہ فرنیچر اعلیٰ قسم کی لکڑی ٹیک وڈ کا بنا ہوا ہے اور بڑا ہی نازک و نفیس ہے۔

روایت کے مطابق 1919ء میں یہ فرنیچر آپ نے اپنی بیٹی کی پیدائش کی خوشی میں مریم جناح کو تحفہ میں دیا تھا۔ ہال کے درمیان میں رکھے ہوئے شوکیسوں میں قائداعظم کے زیر استعمال

نوادارت اور وہ تحفے رکھے ہیں جو مختلف مواقع پر آپ کو پیش کئے گئے ان شوکیسوں میں آپ کا ایک آنکھ والا چشمہ، کچھوے کی ہڈی کا بنا ہوا چشمے کا فریم، ایمرسن ریڈیو، سگریٹ پائپ، مسلم لیگ کے تحفے وغیرہ علاوہ ازیں چاندی کا ایک عدد تالا بمعہ چابی، تالا بنگال ائل ملز کے افتتاح کے موقع پر آپ کو پیش کیا گیا تھا۔ ایک گلدان، ایک جگ، مسلم لیگ کا مونو گرام، قائداعظم کے زیر استعمال رہنے والا ایک لیٹر پیڈ، ایک پین ہولڈر بھی آپ کو کسی نے تحفہ میں پیش کیا تھا۔ دیوار پر نصب ایک شوکیس میں سنگ مرمر پر ابھرا ہوا پاکستان کا نقشہ بھی سجا ہے۔ اس نقشہ میں مغربی پاکستان، بھارت اور مشرقی پاکستان دکھایا گیا (افسوس اب مشرقی پاکستان ہمارا حصہ نہیں رہا) دہلی کے معروف آرٹسٹ تجمل حسین دہلوی کے ہاتھ سے بنائی ہوئی قائداعظم کی ایک تصویر بھی دیوار پر آویزاں ہے ایک شوکیش میں قائداعظم کا عدالتی لباس بھی سجا ہوا ہے جسے آپ دوران وکالت زیب تن فرماتے اس لباس میں عدالتی گون، سبز رنگ کا ریشمی پھندے والا پٹکہ اور تتلی نما سفید عدالتی نشان بھی سجا ہوا ہے یہاں ایک ایرانی قالین بھی رکھا ہوا ہے جس پر پھول پتیاں بنی ہیں دیوار کے ساتھ نصب ایک شوکیس میں قائداعظم کی ایک کریم رنگ کی شیروانی اور ایک کالی شیروانی بھی رکھی ہے ایک واسکٹ بھی ہے جو چائنا سلک کی بنی ہوئی ہے ایک چھڑی، سویڈن کے بنے بوٹوں کے جوڑے بھی رکھے ہیں ان تمام اشیاء پر تعارفی تختیاں لگی ہوئی ہیں جس سے شائقین کو معلومات حاصل کرنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے تیسری منزل کے اوپر بعد میں تین کمرے بنائے گئے جس میں کسٹوڈین آفس دیگر کلیریکل سٹاف اور ریکارڈ ہے۔

قائداعظم کی جائے پیدائش وزیر مینشن اور یہاں قائم میوزیم میں داخلہ کا کوئی ٹکٹ نہیں۔

تحریر: انجم جاوید۔ ہفتہ روزہ ''فیملی میگزین'' لاہور

○

موہٹہ پیلس، کراچی

موہٹہ پیلس، حاتم علی علوی روڈ اور موتی لال گوردھن روڈ کے مقام اتصال پر واقع ہے اس عمارت کا مجموعی رقبہ 12 ہزار مربع گز کے لگ بھگ ہے۔ موہٹہ پیلس ایک دیدہ زیب عمارت ہے ستر برس کی دھوپ چھاؤں اور ایک مدت تک سربمہر رہنے کے باوجود عمارت کے اصل حسن پر کوئی فرق نہیں پڑا ہے۔

موہٹہ پیلس، بنیادی طور پر الشلیر گزری اسٹون(Ashlar Gizri Stone) سے تعمیر کیا گیا ہے تاہم جے پور کے سنگ سرخ کے جا بجا استعمال کی وجہ سے یہی تاثر ملتا ہے یہ عمارت سرخ رنگ کے پتھر سے تعمیر کی گئی ہے۔ جے پور کے سنگ سرخ کا استعمال عمارت کے چھجوں، ستونوں، بالکونیوں اور دوسرے آرائشی مقامات پر بڑا نمایاں نظر آتا ہے عمارت کو آر سی سی طریقہ تعمیر سے تعمیر کیا گیا ہے۔

موہٹہ پیلس کی عمارت اگرچہ ایک ہندو خاندان کی ملکیت تھی لیکن اس میں سندھ میں مکلی کے مقام پر موجود سمہ خاندان کے مقابر کے نقش و نگار، محرابیں اور گنبد جا بجا موجود ہیں۔

موہٹہ پیلس کی عمارت ایک مختصر تہہ خانے اور تین منزلوں پر مشتمل ہے پہلی اور دوسری منازل پر رہائشی کمرے ہیں جبکہ تیسری منزل پر ایک خوبصورت برساتی اور کارنر پویلین موجود ہیں۔ عمارت کو ایک اونچے پلیٹ فارم پر تعمیر کیا گیا ہے جس کی وجہ سے عمارت کی بلندی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں عمارت کے نیچے ایک سرنگ بھی ہوا کرتی تھی جو اسے ساحل سمندر پر واقع مندر سے ملاتی تھی مگر اب آس پاس بے شمار عمارتیں تعمیر ہو جانے کے باعث یہ سرنگ بالکل بند ہو چکی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد جب کراچی کو ملک کا پہلا دارالخلافہ قرار دیا گیا تو وزارت خارجہ کا دفتر بھی موہٹہ پیلس ہی میں قائم کیا گیا۔

اس پیلس کے بالائی منزل پر قائداعظم اور مادرملت سے تعلق رکھنے والی اشیاء بدستور سربمہر تھیں لیکن 1970ء میں مغربی پاکستان ہائی کورٹ نے محترمہ شریں بائی کو محترمہ فاطمہ جناح کی تمام املاک کا وارث قرار دے دیا گیا اور یوں قصر فاطمہ مکمل طور پر محترمہ شریں بائی کے تصرف میں آ گیا۔

محترمہ شریں بائی نے قائداعظم اور محترمہ فاطمہ جناح کے استعمال میں آنے والی تمام اشیاء کی مفصل فہرست تیار کروائی اور ان میں سے پیشتر محکمہء آثارقدیمہ کے حوالے کردی۔ 1980ء میں محکمہ آثارقدیمہ نے ان اشیاء کا ایک کیٹلاگ شائع کیا جس کا نام (Relics of Quaid) تھا۔

2 دسمبر 1980ء کو محترمہ شریں بائی کا انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال کے بعد قصر فاطمہ ایک بار پھر سربمہر کردیا گیا اور ان کے وارثوں کے درمیان ایک طویل قانونی جنگ کا آغاز ہوگیا۔

18 نومبر 1982ء کو حکومت پاکستان کے حکم کے مطابق قصر فاطمہ کے دروازے کھولے گئے۔ اس مرتبہ محکمہء آثارقدیمہ، محکمہ آرکائیوز اور کراچی کی انتظامیہ کے نمائندوں نے عمارت کا تفصیلی جائزہ لیا اور محکمہٗ آثارقدیمہ کے جناب ایم اے حلیم نے قائداعظم اور مادرملت سے تعلق رکھنے والی اشیاء کی ایک مفصل رپورٹ تیار کی جسے Relics of the Quaid -e- Azam Housed in Qasrr-e-Fatima کا نام دیا گیا۔ اس رپورٹ میں ان تمام نوادرات کی تصاویر بھی شامل تھیں۔ پلاٹ کی تیاری کے بعد عمارت کو ایک مرتبہ پھر سربمہر کردیا گیا۔

1994ء میں ایک طویل قانونی جنگ کے بعد سندھ ہائی کورٹ نے شیریں جناح چیری ٹیبل ٹرسٹ کو قصر فاطمہ کا قانونی وارث قرار دیا اور حکومت سے کہا کہ وہ عمارت کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر اسے خود خریدے۔ سندھ ہائی کورٹ نے عمارت کی قیمت 6 کروڑ 11 لاکھ 88 ہزار روپے متعین کی۔ حکومت نے یہ رقم شریں جناح چیری ٹیبل ٹرسٹ کو ادا کردی اور یوں وہ اس عمارت کی مالک بن گئیں۔

اگست 1994ء میں ایک طویل عرصہ کے بعد عمارت کے دروازے ایک مرتبہ پھر کھولے گئے مگر اب یہ عمارت بہت ہی خستہ حال ہوچکی تھی حکومت نے ایک کروڑ روپے سے عمارت کی ازسرنو آرائش اور زیبائش کا فیصلہ کیا اور یہ کام داؤد کالج آف انجینیرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کراچی کے

آرکیٹیکچر ڈیپارٹمنٹ کے سپرد کر دیا۔

یہ 1920ء کا واقعہ ہے جب ایک صاحب ثروت کروڑ پتی ہندو شیورتن موہاٹا نے موہاٹا پیلس تعمیر کرایا یہ ایک ایسی جگہ پر اس زاویئے سے تعمیر کیا گیا تھا کہ اس سے بحیرۂ عرب کا مسحور کن نظارہ ہوتا تھا آپ نے وہ کہاوت ضرور سنی ہوگی کہ کچھ عمارتیں اور کچھ گھر ایسے ہوتے ہیں جو انتہائی شوق سے تعمیر کیے جاتے ہیں مگر وہ بنانے والے کے نصیب میں نہیں ہوتے کچھ ایسا ہی معاملہ موہاٹا پیلس کے ساتھ ہوا۔ شیورتن موہاٹا نے انتہائی ذوق و شوق سے اس محل کو تعمیر کروایا جو اس وقت بھی آج کی طرح کراچی کی محبوب ترین اور خوبصورت عمارتوں میں سے ایک تھا مگر شیورتن کو زیادہ عرصہ اس محل میں رہنا نصیب نہ ہوا کیونکہ محض دو دہائیوں کے بعد برصغیر میں تقسیم کی لہر اٹھی اور شیورتن کو مجبوراً یہ محل چھوڑنا پڑا۔ نہ صرف شیورتن بلکہ تقسیم کے کافی سال بعد جب کلیم کے عوض اسے محترمہ فاطمہ جناح کو دے دیا گیا تو بذات خود فاطمہ جناح کو اس میں رہنا نصیب نہ ہو سکا ان کی موت بھی پراسرار حالات کا شکار رہی اکثر و بیشتر یہ کہا جاتا ہے کہ اس خوبصورت محل پر ''سایہ'' ہے جو کسی کو بھی مستقل ٹھہرنے کا موقع نہیں دیتا۔ موہاٹا پیلس کو ''قصر فاطمہ'' بھی کہا جاتا ہے۔

موہاٹا پیلس 18500 مربع گز کے رقبے پر محیط ہے جبکہ احاطے سمیت اس کا کل رقبہ 12000 مربع گز ہے موہاٹا پیلس میں آمدورفت کے لیے تین بڑے گیٹ ہیں بیرونی دیوار کسی فصیل کی طرح سے گھومتی ہے اندر اصل عمارت سے پہلے کافی جگہ اوپن ہے جہاں درخت ہوا کرتے تھے جو اب کاٹ دیئے گئے ہیں گیٹ سے داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ پر دفاتر نما عمارت کا حصہ ہے۔ موہاٹا پیلس کو احمد حسین آغا نے تعمیر و ڈیزائن کیا جو پہلے مسلمان آرکیٹیکٹ تھے موہاٹا پیلس کے کمرے بہت کشادہ ہیں گراؤنڈ فلور پر موجود کمرے تفریح طبع و مہمان نوازی کے لیے ہیں پہلی منزل پر خواب گاہیں اور ایک استقبالیہ کمرہ ہے پہلی منزل پر بہت بڑا ٹیرس ہے جہاں سے بحیرۂ عرب کا نظارہ ہوتا ہے موہاٹا پیلس مغل انداز کی عمارت ہے جسے بہت احتیاط کے ساتھ منتخب کردہ خام مواد سے تیار کیا گیا ہے۔

موہاٹا پیلس کی تعمیر میں زیادہ تر مقامی طور پر گذری سے حاصل کردہ پتھر استعمال کیا گیا ہے بریکٹ، چھجے، بالکونی وغیرہ کی تعمیر میں جودھ پور کا پتھر استعمال میں لایا گیا اور اس تعمیراتی انداز سے پوری عمارت گلابی رنگ کی ہوگئی۔ احمد حسین آغا نے موہاٹا پیلس کی تعمیر میں ان بہت سے کاموں کو بہت کامیابی کے ساتھ اختیار کیا جنہیں وہ اس سے قبل بنائے جانے والی عمارتوں میں

استعمال کر چکے تھے اس سے قبل احمد حسین آغا نے اپنی ہندو جم خانہ کی عمارت میں کشادگی کو مدنظر رکھا تھا، اسے موھاٹا پیلس میں اختیار نہیں کیا بلکہ اس میں گھر کی خلوت فراہم کی گئی ہے اس عمارت سے قبل بنائی جانے والی عمارتوں میں کھڑکیاں بنانے کا جو ہنر اختیار کیا گیا تھا اسے یہاں زیادہ وضاحت و ترتیب کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے اس طرح سے عمارت کی تعمیر کی غرض سے منقش آرائشی پتھر اور محرابی (مکلی) سندھ کے قبرستان سے حاصل کی گئی جہاں سمہ دور حکومت کے مقابر ہیں۔

موھاٹا پیلس کے مرکزی گیٹ سے داخل ہوتے ہی طویل تخی نما کمرہ 32.6X32 ملتا ہے جو انٹرنس کے بعد واقع ہے اس کھلے کمرے میں لکڑی کا خوبصورت کام کیا گیا ہے یہ کام ایسے کیا گیا ہے جیسے الماریاں دیواروں میں نصب ہوتی ہیں۔ آتش دان بھی ایک کونے میں واقع ہے اس کے دائیں جانب استقبالیہ روم ہے جبکہ اس استقبالیہ کمرے سے آگے سائیڈ انٹری گیٹ ہے جو ایک طویل صحن میں کھلتا ہے۔

لیونگ روم کے بائیں طرف بیڈ روم، ڈائننگ روم، باتھ، پینٹری روم اور سائیڈ انٹری گیٹ ہے لیونگ روم سے آگے رئیل لوبی اور گیمز روم واقع ہیں اوپر جانے کے لیے 3 سیڑھیاں ملتی ہیں اوپر کی تعمیر بھی تقریباً گراؤنڈ فلور سے ملتی جلتی ہے اوپر دائیں جانب واقع کمرے میں محترمہ فاطمہ جناح کا قیام رہا ہے عمارت میں لکڑی کے دروازے اور کھڑکیاں ملتی ہیں جو اپنی جگہ خوبصورتی پیدا کرتی ہیں اوپر پہلی منزل پر دو چھوٹی گیلریاں اور ایک بڑی گیلری واقع ہے جس کا رخ ساحل سمندر کی طرف ہے۔

چھت پر چاروں اطراف چار خوبصورت دل کش سایہ دار کھلے گنبد واقع ہیں دو گنبدوں کے درمیان ایک تعویذ یا کیپسول نما جگہ بنائی گئی ہے یہ بھی غالباً بیٹھنے کے لیے استعمال کی جاتی رہی ہوگی انہی گنبدوں اور تعویذ نما بیٹھک کے اطراف سیدھے اور الٹے ہاتھ پر سیمنٹ کی صوفہ نما بینچیں بھی ملتی ہیں ان چاروں گنبدوں کے درمیان مزید ایک پرشکوہ قلعہ نما چھوٹی سی عمارت ہے یہ اپنی تعمیر کے لحاظ سے تو متاثر کرتی ہے لیکن اس میں نصب نیلے رنگ کے شیشے اس کے حسن کو اور بھی بڑھا دیتے ہیں جو ماحول کو تازگی بخشنے کا ذریعہ ثابت ہوتے ہیں دونوں اطراف ویسٹ اوپن کمرے واقع ہیں۔ نیچے واقع کمروں میں ہوا اور روشنی پہنچانے کی غرض سے اس عمارت کے چھجے اور کھڑکیاں نصب ہیں جو اوپر سے ہوا لے کر نیچے پہنچانے کا ذریعہ بنتی ہیں ان کھڑکیوں کے اوپر

سیمنٹ کی شلٹر ہے جو دھوپ کی تمازت وتختی کو نیچے جانے سے روکنے کا ذریعہ بھی بنتے ہیں۔

یہ آرام دہ کمرے سکون عطاء کرنے کے ساتھ ساتھ آپ کو چاروں اطراف کا نظارہ فراہم کر کے سکون بہم پہنچاتے ہیں۔ موہاٹا پیلس کے تہہ خانے میں ایک وسیع سوئمنگ پول بھی قائم ہے اس سوئمنگ پول سے چند قدم آگے ایک سیف تجوری نما کمرہ بھی ہے جس میں مضبوط لوہے کا دروازہ نصب ہے موہاٹا پیلس کو قصر فاطمہ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ عمارت مادر ملت سے بھی منسوب رہی ہے۔

مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح 1967ء تک (انتقال ہونے تک) اسی محل میں رہیں ان کی وفات کے بعد عمارت کی پہلی منزل سیل کر دی گئی تھی چونکہ اس میں محترمہ فاطمہ جناح کے قیمتی زیورات واشیاء کے ساتھ ساتھ حضرت قائداعظم کی قیمتی یادگار موجود ہیں یہ یادگاریں محترمہ فاطمہ جناح فلیگ اسٹاف ہاؤس (حالیہ قائداعظم میوزیم) کے ساتھ لے آئی تھیں۔ فاطمہ جناح کی ہمشیرہ محترمہ شیریں بائی کو یہ اجازت دی گئی کہ وہ صرف گراؤنڈ فلور استعمال کر سکتی ہیں بعد ازاں ایک عدالتی حکم کے ذریعے 1970ء میں پہلی منزل بھی ان کے استعمال کے لیے کھول دی گئی۔ 1980ء میں شریں بائی کے انتقال کے بعد یہ عمارت پھر بند رہی سنا ہے کہ اس عرصے میں قائداعظم کی بہت سی اشیاء یہاں سے غیر قانونی طور پر ہٹادی گئیں یا ان کو نقصان پہنچا باقی ماندہ یادگاروں کو 1990ء میں قائداعظم ھاؤس میوزیم کراچی میں منتقل کر دیا گیا۔ کراچی کے لوگوں کو یہ عمارت بہت پسند ہے بذات خود آرکیٹیکٹ آغا کے کیریئر میں یہ ایک شاندار کارنامہ ہے لیکن افسوس کی بات تو یہ ہے کہ یہ عمارت ایک عرصے تک نظر اندازی کی جاتی رہی ہے جس سے اسے نقصان پہنچا اس عمارت کی اہمیت وافادیت کو محسوس کرنے کے بعد گورنر سندھ کی ہدایات پر اسے سندھ کے محکمہ ثقافت نے اپنی زیر نگرانی لے کر میوزیم و پارک بنانے کے مقصد سے اس پر کام شروع کر دیا اس کی تزئین و آرائش، بجلی کی فٹنگ، دروازوں، کھڑکیوں، چھتوں کی مرمت سمیت وسیع پیانے پر کام ہو رہا ہے۔ موہاٹا پیلس موجود نسل بلکہ آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی ایک تہذیبی تمدن کی علامت ہے۔

ہفتہ روزہ ''فیملی میگزین'' ۔تحریر: انجم جاوید
23 تا 29 مئی 1999ء

○

باغ بن قاسم، کراچی

کراچی کے ساحل پر حکومت نے خوبصورت پارک تیار کرنے کا منصوبہ شروع کیا ہے جس میں بیچ پارک کا افتتاح کچھ عرصہ قبل ہو چکا ہے اس پارک کا پہلا مرحلہ 9 کروڑ روپے کی لاگت سے مکمل ہو چکا ہے یہ چار مراحل میں مکمل ہوگا جس پر کل 26 کروڑ روپے خرچ ہوں گے یہ پارک پونے چھ کلومیٹر طویل ہوگا اس طرح یہ پاکستان کا سب سے لمبا پارک ہوگا جو کہ کلفٹن سے کیماڑی کی ساحلی پٹی پر محیط ہوگا۔ بیچ پارک سے کچھ فاصلے پر کے پی ٹی نے دنیا کا بلندترین فوارہ تعمیر کیا ہے جس پر 22 کروڑ روپے لاگت آئی ہے اس طرح کراچی کا ساحل بیک وقت دو منصوبوں کی تکمیل کے باعث شہریوں کی توجہ کا مرکز بن گیا ہے۔

بیچ پارک میں بچوں کے لیے جلد ہی مونوریل چلنا شروع ہو جائے گی۔ یہ ٹرین 10 فٹ بلندی پر چلے گی اور اس میں سو مسافروں کی گنجائش ہوگی کلفٹن کا ساحل ساؤتھ ایشیاء کا واحد تفریحی مرکز ہوگا جہاں یہ ٹرین چلے گی اور ساحل کے ساتھ ساتھ بیس منٹ کا سفر طے کرے گی اس دوران بچے سمندر کی موجوں سے لطف اندوز ہو سکیں گے بچوں کے لیے یہ ٹرین جرمنی سے درآمد کی جائے گی۔ جو لوگ کلفٹن کے ساحل پر جاتے رہتے ہیں انہیں ایک برس میں وہاں واضح تبدیلی محسوس ہوگی اب وہاں باغِ اس ابن قاسم بن چکا ہے جس نے وہاں کا منظر یکسر تبدیل کر دیا ہے 130 ایکڑ پر محیط اس باغ کا افتتاح 27 فروری 2007ء کو ہوا یہ باغ اس وقت سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے شہری حکومت کے مطابق اس باغ کی تعمیر پر 65 کروڑ روپے خرچ آیا ہے اس کی تعمیر کے دوران اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ یہ جہانگیر کوٹھاری پریڈ کا حصہ معلوم ہو۔

کراچی کی مخیر شخصیت سر جہانگیر ایچ کوٹھاری نے شہر کے باسیوں کی تفریح کے لیے ذاتی زمین اور تین لاکھ روپے اس پرومنیڈ اور پریڈ کی تعمیر کی غرض سے اس وقت کراچی کی میونسپلٹی کو عطیہ دیا تھا۔ 10 فروری 1920ء کو یہ پریڈ مکمل ہوئی اور لیڈی لائیڈ نے اس کا افتتاح کیا۔ 21

مارچ 1921ء کو لیڈی لائیڈ نے اس کی راہداری کا افتتاح کیا اس وقت کراچی کی آبادی صرف دو لاکھ نفوس پر مشتمل تھی لیاقت علی خان کے مطابق اس کی تعمیر میں جے پور کا سرخ پتھر استعمال کیا گیا۔ باغ ابن قاسم کی تعمیر میں لسبیلہ کا پنک اسٹون استعمال ہوا ہے کیونکہ جے پور اسٹون دستیاب نہیں تھا۔ جہانگیر پویلئن مغلیہ طرز تعمیر کا شاہکار ہے باغ ابن قاسم بھی اسی طرز پر تعمیر کیا گیا ہے۔

کراچی کی شہری حکومت کے مطابق باغ ابن قاسم میں لگانے کے لیے ایسے ایسے پودے منتخب کئے گئے ہیں جو ساحلی پٹی پر باسآنی نمو پاتے ہیں۔ باغ میں معذوروں اور بوڑھوں کے لیے متعدد ریمپس بنائے گئے ہیں ٹرٹل پونڈز، خواتین اور مردوں کے لیے 12-12 واش رومز، واکنگ اور جاگنگ ٹریکس تعمیر ہوئے ہیں۔ پتھر کی 2500 اور لکڑی کی 2000 بنچز 1000 کوڑے دان چھوٹی لائٹس 30 لائٹنگ ٹاورز اور پتھروں سے چار بڑے دروازے تعمیر کئے گئے ہیں۔ شہری حکومت باغ میں فوڈ کورٹس، آئس اسکیٹنگ کی سہولت، ڈولفن پول، میوزیکل فاؤنٹین بنانے مونوریل چلانے، ہارٹ ایئر بلون اور موونگ ڈائنوسار نصب کرنے کا بھی ارادہ رکھتی ہے باغ میں جمعہ ہفتے اور اتوار کو تقریباً دو لاکھ اور عام دنوں میں بیس تا پچیس ہزار افراد تفریح کرنے کو آتے ہیں۔ یہاں صرف خاندان کے ساتھ آنے والوں کو داخلے کی اجازت دی جاتی ہے دن کے چار بجے سے صبح سات بجے تک یہ باغ عوام کے لیے کھلا رہتا ہے اس کی دیکھ بھال اور یہاں حفاظتی انتظام کی ذمہ داری نجی اداروں کو سونپی گئی ہے اور شہری حکومت ان کی کارکردگی پر نظر رکھتی ہے۔

شہری حکومت کے ناظم مصطفیٰ کمال کے مطابق یہ پاکستان کا سب سے بڑا پارک ہے۔

گورنر سندھ ڈاکٹر عشرت العباد نے اس علاقے کو خوبصورت بنانے کے احکامات جاری کئے اور باغ کی تعمیر میں خصوصی دلچسپی لی۔ شہری حکومت نے ان کی رہنمائی میں یہ منصوبہ مکمل کیا۔ باغ میں تین لاکھ افراد کی گنجائش ہے یہ نہ صرف کراچی بلکہ پورے پاکستان کے عوام کے لیے کراچی شہری حکومت کا تحفہ ہے۔

بیچ پارک کو مرکزی تفریح گاہ کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے ساحل کی رعنائیوں میں اضافہ ہوا سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ نے ہنگامی بنیادوں پر کام کرتے ہوئے اس بیچ کو مکمل کر لیا اور شہریوں کو حیرت میں ڈال دیا کہ اتنا بڑا اور اس معیار کا کام اتنی جلدی کس طرح ممکن ہوا۔

تحریر: ساجد علی

ہفتہ روزہ ”فیملی میگزین، 30 مارچ تا 5 اپریل 2008ء

○

امیر خسرو پارک، کراچی

کراچی کی ساحلی تفریح گاہ کلفٹن سے چند فرلانگ قبل کلفٹن ایکسچینج اور موھاٹا پیلس کے درمیان واقع کراچی میونسپل کارپوریشن کا پارک امیر خسرو پارک کراچی کا ایک جدید اور ماڈل پارک ہے۔ یہ کراچی کے حاتم علوی روڈ پر واقع ہے یہ پارک ہنگامی بنیادوں پر صرف پانچ ماہ کی قلیل مدت میں مکمل ہوا۔

امیر خسرو پارک کسی باقاعدہ منظور شدہ نقشے کے مطابق نہیں بنایا گیا اس کا ڈیزائن و تکمیل تک پہنچانے کا کام ڈائریکٹر پارکس بلدیہ عظمیٰ کراچی لیاقت علی خان نے سرانجام دیا۔

امیر خسرو پارک جنوری 1997ء میں مکمل ہوا اور سابق وزیر اعلیٰ سندھ ممتاز علی بھٹو نے اس کا افتتاح کیا۔ عین شاہراہ پر واقع امیر خسرو پارک تین ایکڑ پر مشتمل ہے اس پارک کی نمایاں خوبیوں میں اس کا جوگنگ ٹریک اور ایکسرسائز مشینوں کا ہونا ہے اس پارک کے اندر زیرو میٹر سے جوگنگ ٹریک شروع ہوتا ہے جب اس پر آپ جوگنگ کرتے ہوئے پارک کا چکر لگا کر پلٹتے ہیں تو 431 میٹر جوگنگ ٹریک کا فاصلہ بنتا ہے صبح اور شام کے بعد آس پاس سے آئے ہوئے کئی افراد اس جوگنگ ٹریک کو آزماتے ہیں اس کے علاوہ اس پارک کے ایک کونے میں مختلف اقسام کی ورزش کرنے والی مشینیں نصب ہیں جہاں مرد حضرات اور بچے سب ایک ہجوم کی شکل میں ورزش کرتے نظر آتے ہیں۔

75 لاکھ روپے کی لاگت سے مکمل ہونے والا امیر خسرو پارک کئی لحاظ سے دوسرے پارکوں سے مختلف ہے اس میں باقاعدہ طور پر خواتین و مرد حضرات کے لیے علیحدہ علیحدہ ٹوائلٹ و واش روم کا انتظام رکھا گیا ہے جس کا معیار کسی فائیو سٹار ہوٹل سے کم نہیں یہاں پر کموڈ، واش روم، بیسن اور تولیئے وغیرہ رکھے گئے ہیں اس میں ٹھنڈے پانی کے لیے کولر کا بھی اہتمام ہے۔

پارک کے اندر رنگ برنگے مہکتے پھولوں سے مزین ایک الگ ہی سماں نظر آتا ہے جو کہ مختلف اقسام کی کیاریوں میں نظر آتے ہیں پارک میں حوض بھی ہیں دو عدد فوارے نصب ہیں یہ فوارے جب چلتے ہیں تو دیکھنے والوں کو ایک لطف سا حاصل ہوتا ہے حوض میں پانی بھرا جاتا ہے پارک میں آخری کونے پر ایک پرانی طرز کی چھتری نما بیٹھک سی بنی ہے جو اس پارک کے حسن میں خوبصورت اضافہ ہے لکڑی سے تعمیر شدہ بینچیں، ماربل کے تراشیدہ راستے، جگہ جگہ نصب ڈسٹ بین علاوہ ازیں حوض کے اردگرد نصب کرسیاں اس باغ کی دل فریبی میں اضافہ کرتی ہیں یہ کرسیاں اس طرح نصب کی گئی ہیں کہ ان پر بیٹھ کر بہ آسانی گفت وشنید یا میٹنگ کی جاسکتی ہے رات گئے روشنی کے امتزاج سے پارک اور پارک کے اندر چلنے والے فوارے کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے بظاہر انتہائی سادہ نظر آنے والے اس پارک میں کئی اقسام کی آسانیاں بہم پہنچائی گئی ہیں۔

ہفت روزہ ''فیملی میگزین'' لاہور۔تحریر: انجم جاوید

○

گلشن جناح پارک، کراچی

پولوگراؤنڈ کا شمار کراچی کے قدیم تفریحی باغات میں سے ہوتا ہے جس کا نام تبدیل کر کے گلشن جناح رکھ دیا گیا ہے۔ یہ کراچی کے اہم محل وقوع میں قائم ہے ڈاکٹر ضیاء الدین احمد روڈ پر واقع اس پارک سے ایک سمت گورنر ہاؤس کی دیوار ملی ہوئی ہے تو دوسری سمت کراچی کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کی دیوار منسلک ہے اس سے قریب تر دیگر فائیو اسٹار ہوٹل کے علاوہ وزیر اعلیٰ ہاؤس کمشنر ہاؤس اور چیف سیکرٹری ہاؤس بھی واقع ہیں۔

یہ گراؤنڈ تقسیم سے قبل پولو کے کھیل کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے اس سے منسلک گورنر جنرل ہاؤس تھا اور کراچی میں واقع آرمی یونٹس مثلاً جیکب لائن، جیٹ لائن، پنیر بیرکس، بریگیڈ کے علاقے سے فوجی افسران و دیگر اعلیٰ عہدے داران یہاں پولو کھیلا کرتے تھے جس کی وجہ سے اسے پولو گراؤنڈ کہا جانے لگا تھا۔

رفتہ رفتہ اس کی حیثیت و مقام میں تبدیلی پیدا ہوتی چلی گئی اور اس کا کچھ حصہ پی سی ہوٹل کی تعمیر کے لیے علیحدہ ہو گیا بقیہ حصے میں ایک بارہ دری اور پارک بنایا گیا۔

پاکستان کے قیام کے فوراً بعد اس گراؤنڈ کو فوجی پریڈ کے لیے استعمال کیا جانے لگا اور اس سلسلے کی پہلی پریڈ غالباً دسمبر 1947ء میں ہوئی جب ایک سو منتخب تربیت یافتگان کی جنگی کمان اسکواڈرن لیڈر عمر کر رہے تھے اس گراؤنڈ میں مسلح افواج کی مشترکہ پریڈ میں حصہ لیا جس کی سلامی بانی پاکستان قائداعظم محمد جناح نے لی ان کے پیچھے ڈائس پر نیوی کے ایڈمرل جے فورڈ، بری فوج کے میجر جنرل اکبر خان اور رائیر فورس کے گروپ کیپٹن ایس سی ایل وردی بھی موجود تھے۔

1965ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد اس گراؤنڈ میں فخر ہند نامی ٹینک اور دیگر اسلحہ وغیرہ رکھا گیا تھا جو انڈیا سے قبضے میں لیے گئے تھے ایک عرصہ تک لوگ جوق در جوق اسے دیکھنے کے لیے آتے رہے اس واقعہ پر فخر ہند نامی ٹینک کے حوالے سے ان دنوں مختلف کالم بھی لکھے گئے۔

پولو گراؤنڈ یا گلشن جناح کی ایک اور نمایاں اور اہم خوبی اس کا عیدگاہ کے طور پر استعمال کیا جانا بھی ہے۔ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کے مواقع پر یہاں نماز عید ادا کی جاتی ہے اس میں ہر بار گورنر سندھ، وزیر اعلیٰ سندھ، وزراء، چیف سیکرٹری اور دیگر تمام اعلیٰ آفیسران کثیر میں شریک ہوتے ہیں۔ کے ایم سی نے سرکاری کاغذات پر اسی کا نام گلشن جناح رکھ دیا ہے مگر اس نام سے اسے کوئی بھی نہیں پہچانتا۔

پولو گراؤنڈ 26 ایکڑ پر مشتمل ہے۔ 76-1975 میں اسے گلشن جناح میں تبدیل کیا گیا اور اس پر ہریالی وغیرہ اگانے کے اقدامات کیے گئے۔ اس وقت پولو گراؤنڈ میں داخلے کے دو راستے ہیں جن میں سے ایک گورنر ہاؤس روڈ پر واقع ہے یہ مرکزی گیٹ ہے جبکہ دوسرا گیٹ ڈاکٹر ضیاالدین روڈ پر گورنمنٹ کالج آف کامرس کے مقابل ہے صبح سے لے کر رات گئے تک مختلف اوقات میں مختلف طبقات کے لوگ یہاں ستانے کے لیے آتے ہیں۔

پی سی سے منسلک اس گلشن جناح پولو گراؤنڈ میں بارہ دری و شیر پاؤ گارڈن کا افتتاح 23 مارچ 1975ء کو اس وقت کے وزیر اعلیٰ سندھ جناب غلام مصطفیٰ جتوئی نے کیا تھا یہ بارہ دری، پولو گراؤنڈ کا ایک حصہ ہوتے ہوئے بھی اس سے علیحدہ لگتی ہے یہ بارہ دری و پارک نہایت خوبصورتی سے تعمیر کیا گیا ہے بارہ دری کی چھت منقش و دیدہ زیب ہے اس کے پیچھے کے ایم سی کی نرسری بھی واقع ہے۔

گلشن جناح میں سبزہ و درخت تمام مناسب تعداد میں ہیں اس کے باوجود مزید شجرکاری کی گنجائش بھی ہے۔ کے ایم سی کے ڈائریکٹر باغات اور ان کی ٹیم نے خصوصی توجہ دی اس باغ کا سبزہ بحال کرایا یہاں پھول لگائے بینچیں بچھائی گئی ڈسٹ بین اور ٹری گارڈز لگوائے اور پانی کے لیے سیوریج کی لائن کو یہاں تک لایا گیا اور گراؤنڈ کو سرسبز کیا گیا۔

اس باغ کا سب سے خوبصورت گوشہ جاپانی طرز کا ایک ہٹ اور اس سے منسلک سبزہ ہے جو نہایت دلفریب ہے چھوٹے بچوں کے لیے پارک کا ایک حصہ مختص ہے جہاں ان کے کھیلنے کے لیے کچھ آئٹم موجود ہیں اس سے ان کی جسمانی استعداد بڑھتی ہے۔ فٹ بال اور ہاکی کھیلنے کے لیے بھی پارک میں ایک علیحدہ گراؤنڈ ہے اس پر شام کے بعد فلڈ لائٹ کی روشنی میں میچ کھیلے جاتے ہیں۔ گلشن جناح میں حال ہی میں ایک نیا اضافہ ہوا ہے یہ اضافہ ''جاپانی ماڈل'' ہے۔

ہفت روزہ ''فیملی میگزین'' 26 مارچ تا یکم اپریل 2008ء۔ تحریر: انجم جاوید

○

ٹرانس لیاری پارک، کراچی

کراچی کے ضلع غربی (ویسٹ) میں پرانا گولیمار کے مقابل ٹرانس لیاری پارک واقع ہے۔ قیام پاکستان سے قبل کراچی میں گندے پانی کی نکاسی اور بہاؤ کے لیے سیوریج فارم بنائے گئے تھے اس میں سے ایک سیوریج فارم یہاں واقع ہے اسے سیوریج فارم نمبر 1 کا نام دیا گیا جو بعدازاں گڑ باغیچہ کے نام سے معروف ہوا یہ ایک وسیع و عریض فارم تھا جہاں زرعی کاشت کی جاتی تھی اور پھل دار درختوں کا تو کوئی شمار ہی نہ تھا منگھوپیر روڈ حافظ ٹیکسٹائل ملز سے لے کر ایکسر لائن اور میوہ شاہ قبرستان اور بکرا پیری تک اس کی حدود ملتی تھیں جس میں رفتہ رفتہ کمی آتی چلی گئی۔ 8 مارچ 1957 میں جاری کردہ میونسپل کارپوریشن کے خط کے حوالے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس وقت اس کی پیمائش 1200 ایکڑ تھی۔ یہ صورتحال اب بھی 200 ایکڑ پر رکی ہوئی ہے اس گڑ باغیچہ پر ایک طویل عرصہ تک چارہ کی فصل بوئی جاتی رہی لوگ یہاں سے سبزیاں، بھٹے اور پھل لے کر جایا کرتے تھے اس میں ایک بڑے رقبے پر امرودوں کا باغ تھا اس کے ساتھ ایک وسیع رقبے پر گلاب اور سدا بہار پھول کھلا کرتے تھے یہ علاقہ ایک تاریخی و فوجی اہمیت کا حامل قیام پاکستان سے قبل اور بعدازاں رہا ہے چونکہ قیام پاکستان کے کافی سالوں تک یہاں آبادی نہیں ہوئی پھر رفتہ رفتہ آس پاس کے علاقے بننے لگے اور اس وقت حسرت موہانی کالونی، زبیری کالونی، ولایت آباد، آصف کالونی کے گھیرے میں ٹرانس لیاری پارک آچکا ہے۔

ان کالونیوں کے آباد ہونے کے بعد باقی ماندہ علاقے کے اردگرد دیوار کھینچی گئی۔ یہاں 1970ء کی دھائی تک امرود کے درخت اور گلاب و سدا بہار کے پھولوں کے قطعات ہوا کرتے تھے۔ کھیا اور کچری نامی پھل بھی یہاں ہوتے تھے خودرو جھاڑیوں کی کثرت تھی اور حکیم یہاں سے بوٹیاں چنا کرے تھے درختوں کی بہتات کی وجہ سے یہاں حلال و حرام پرندوں کی کثیر تعداد نظر آتی رہتی تھی جسے شکار کرنے والے بھی آیا کرتے تھے تیتر، بیٹر طوطے خاص کر ملا کرتے تھے اس علاقے

سے جہاں کئی روایات مشہور ہیں وہاں یہ بھی مشہور ہے کہ بڑا بورڈ پر بارود خانہ نامی ایک کارخانہ ہوا کرتا تھا جس سے سرنگ دہلی تک جاتی تھی اور یہ سرنگ دور برطانیہ میں تیار کی گئی تھی تاہم کسی طرف سے اس ضمن میں ثبوت نہیں مل سکے۔ وہاں کے رہنے والے اس سرنگ سے قطعی لاعلم ہیں البتہ گڑباغیچہ میں امرود کے درخت، کیکر و دیگر اقسام کے درخت، مکئی کی فصل، ایک دیہاتی ماحول، سادگی، گلاب کے پھول پرندے بزرگ افراد کی حسین یادوں میں محفوظ ہیں۔

گڑباغیچہ کی زمین سے منسلک ٹرانس لیاری پارک ساڑھے 14 ایکڑ پر مشتمل ہے اور اس کا شمار بھی قیام پاکستان سے قبل تعمیر شدہ قدیم پارکوں میں ہوتا ہے مین روڈ پر واقع یہ پارک ہر آنے جانے والے کی نگاہ کا مرکز ٹھہرتا ہے دور سے نظر آنے والے ناریل کے پیڑ اندازاً 150 کے قریب ہیں۔ قیام پاکستان سے قبل اور بعد تک ناریل باقاعدہ اتارے اور نیلام کیے جاتے تھے۔ اس میں ناریل کے پیڑ ''بغیر سر'' کے ایستادہ ہیں۔

ٹرانس لیاری پارک کا آدھا حصہ سرسبز ہے اور آدھا حصہ خشک پڑا ہوا ہے۔ بچوں کے کھیلنے کے لیے انگسیلز بنی ہوئی ہیں۔ فیملی پارک ہونے کے باوجود عام حالات میں یہاں خواتین نظر نہیں آتیں قریبی سکولوں کے بچے بھی پکنک پر آتے رہتے ہیں۔

ہفتہ روزہ ''فیملی میگزین'' لاہور۔ تحریر: انجم جاوید

○

سفاری پارک، کراچی

سفاری پارک، کراچی میونسپل کارپوریشن کا ایک بڑا منصوبہ ہے اور اس پارک کا افتتاح جون 1970ء میں جنرل عتیق الرحمٰن مرحوم نے کیا تھا اس کا کل رقبہ 350 ایکڑ ہے جبکہ کے ایم سی کی معلومات کے مطابق اس کا کل رقبہ 407 ایکڑ ہے کے ایم سی کے مطابق سفاری 182 ایکڑ پر، زد 176 ایکڑ پر مشتمل ہے جبکہ 156 ایکڑ وہ بنجر علاقہ ہے جو زیر استعمال نہیں کیونکہ اس جگہ سے پانی اور گیس کی بڑی پائپ لائنیں گزرتی ہیں۔

کراچی میں تفریح کے ذرائع بہت کم ہے اس لیے سفاری پارک ایک اہم تفریحی پارک کی حیثیت اختیار کر چکا ہے سفاری پارک کراچی شہر سے ہٹ کر یونیورسٹی روڈ پر گلستان جوہر کے علاقے میں واقع ہے اس پارک کے دو تین اطراف گلشن اقبال کا علاقہ ہے جبکہ ایک طرف کراچی یونیورسٹی پھر منصورا گوٹھ وغیرہ۔ سفاری پارک اس وقت دو حصوں میں تقسیم ہے ایک حصہ وہ عام پبلک کے لیے ہے اور دوسرا حصہ وہ جو عام نگاہوں سے پس پردہ ہے۔ سفاری پارک جانے کے لیے آپ صدر سے آئیں تو گلشن اقبال نیپا کے سٹاپ کے بعد کراچی یونیورسٹی جاتے ہوئے یہ سٹاپ آتا ہے۔

سفاری پارک ایک طویل رقبے پر مشتمل ہے گیٹ پر نشان کے طور پر ہاتھی نصب ہے گیٹ پر عام افراد کا ٹکٹ تو نہیں تاہم ذاتی سواریوں مثلاً موٹر سائیکل رکشہ، کار، سوزوکی ہائی ایکس ویگن وغیرہ کی انٹری فیس مقرر ہے جسے ادا کرنے کے بعد گاڑی سمیت اندر جایا جا سکتا ہے گیٹ سے داخل ہونے کے بعد پارک نظر آئے گا یہاں بچوں کے لیے مختلف اقسام کے جھولے نصب ہیں اس سے منسلک سفاری کینٹین اور استقبالیہ بھی ہے بچوں کے پارک کے ساتھ ایک جھیل بنی ہوئی ہے جس میں خوبصورت پگوڈا تعمیر ہے اس کے ارد گرد جھیل میں بطخیں کثیر تعداد میں نظر آتی ہیں۔

جھیل کے اردگرد سبزہ نظر آتا ہے جہاں آنے والے گروپ کی شکل میں تقسیم ہو کر بیٹھے گپ شپ لگاتے اور کھاتے پیتے نظر آتے ہیں یہاں اچھی تعداد میں درخت اور شیڈز بھی ہیں۔

سفاری پارک اپنے ماحول کے حوالے سے نئے شادی شدہ جوڑوں کے لیے ایک اچھی تفریح گاہ ہے سفاری پاک میں ہر طبقہ فکر اور طرز رہائش رکھنے والے آزادانہ گھومتے اور لطف اندوز ہوتے نظر آتے ہیں بلندی پر مختلف پرندوں کی چہچہا، تازہ ہوا آپ کو سرور دے گی اردگرد خود رو جنگلی جھاڑیاں اور درخت آپ کو سکون بخشتے ہیں اس فضا کو کبھی کبھی جھیل سے اٹھنے والی بطخوں کی آوازیں توڑ دیتی ہیں یہ پتھروں کی سیڑھیاں آپ کو اتنا اوپر لے جاتی ہیں کہ آپ باآسانی سفاری پارک کے اردگرد کے علاقہ کا جائزہ لے سکتے ہیں اگر ایک طرف گلستان جوہر اور کراچی یونیورسٹی نظر آتی ہے، تو دوسری طرف گلشن اقبال، ایک طرف راشد مہناس روڈ سے ڈرگ روڈ ائیر پورٹ تک کے مناظر سامنے آتے ہیں بعض دور دراز کی نمایاں عمارات بھی نظر آتی ہیں۔

سفاری پارک آپ سے یہ تقاضا کرتا نظر آتا ہے کہ یہاں آ کر آپ کسی ذہنی دباؤ میں نہ رہیں بلکہ اس ماحول میں آپ ذہنی دباؤ سے آزاد ہو کر گھومیں اور ذہنی پریشانیوں سے چھٹکارا حاصل کریں۔ یہاں آپ کو عجیب سا سکون اور طمانیت محسوس ہوسکتی ہے۔

سفاری پاک کی بلندی طے کرنے والے راستے پتھر کی سیڑھیوں سے یا پتھروں سے پر گئے ہیں جو دل کش نظر آتے ہیں اس سفاری پارک میں کچھ پنجرے ملتے ہیں جن میں مور اور کچھ دیگر اقسام کے قیمتی پرندے نظر آتے ہیں۔ اس کے ساتھ ایک لمبا پنجرہ ہے جس کے اندر کچھ ہرن نظر آتے ہیں یہاں سے راستہ گھوم کر دوسری پہاڑی پر چلا جاتا ہے ان دونوں حصوں کے درمیان ایک لمبی کھائی ہے جو مٹی اور جھاڑیوں سے بھری ملتی ہے دوسرا پہاڑی نما حصہ مکمل پارک ہے۔ آپ اس کی بلندی تک گاڑی سمیت جاسکتے ہیں سبزہ اور درخت اچھی تعداد میں نظر آتے ہیں اور خوشگوار تاثر چھوڑتے ہیں اس بلندی پر بھی پتھروں سے مختلف سیڑھیاں ہیں جو آپ چڑھ کر اوپر جاسکتے ہیں اور ایک روڈ نما راستہ بھی موجود ہے یہاں مصنوعی جھرنا نظر آتا ہے مگر خاموش! بلندی پر پہنچ کر چند سیڑھیاں اور طے کریں تو آپ ایک چبوترے پر ہوں گے اس جگہ سے کراچی کے اردگرد کا جائزہ کیا جاسکتا ہے ایک طرف کراچی ائیر پورٹ اور اس کے ہینگر نظر آتے ہیں تو دوسری طرف عمارتوں کا طویل سلسلہ نظر آتا ہے کبھی اس کے اردگرد جگہ خالی ہوا کرتی تھی اب فلیٹس نظر آتے ہیں۔

سفاری پارک کا ایک حصہ عام افراد کی نظروں سے فی الحال دور ہے یہ وہ حصہ ہے جہاں جانوروں کو آزاد چھوڑا گیا ہے جس میں مختلف اقسام کے ہرن، نیل گائے، گھومتی نظر آتی ہیں یہ چار انکلورژ پر مشتمل ہے اس حصے میں 28 غزال رکھے گئے تھے جن کی تعداد اب 69 کے قریب ہے اس طرح سے 6 نیل گائے تھیں جن کی تعداد اب بڑھ کر 18 ہو چکی ہے یہاں جس کثیر تعداد میں پودے لائے گئے ہیں اور جس طرح سے ان کی دیکھ بھال ہو رہی ہے اگر یہی سلسلہ رہا تو یہاں اچھا خاصا جنگل نظر آئے گا۔

اس پارک کی حدود میں نیل گائے، چتیل، کالا ہرن، امریکی سرخ ہرن، جاپانی سیکا ہرن، امریکی فیلو ہرن، سفید فیلو ہرن، بہ لحاظ قد طویل القامت دوے پٹی ہرن، یورپی بھیڑیں، غزال، واٹر بک، فلیمنگوز، سائبر ہرن اور دیگر اقسام کے نایاب ہرن نظر آتے ہیں۔

ہفتہ روزہ ''فیملی میگزین'' لاہور۔ تحریر: انجم جاوید

22 تا 28 فروری 1998ء

O

ہل ویو پارک، کراچی

شاہراہ فیصل اور شہید ملت روڈ کے درمیان عثمان عیسیٰ بھائی میمن روڈ پر واقع ہل ویو پارک کا شمار کراچی کے چند اہم ترین تفریحی مقامات میں کیا جاتا ہے ہل ویو پارک کی وجہ شہرت یہ ہے کہ یہ شاہراہ فیصل سے اندازاً 50 سے 80 فٹ بلند ہے اور اس کے اوپر سے سارے کراچی کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔

شہید ملت روڈ پر روہیلہ کھنڈ سوسائٹی اور میمن کوآپریٹو سوسائٹی کے درمیان ہل ویو پارک واقع ہے شہید ملت روڈ سے عثمان عیسیٰ بھائی میمن روڈ پر چلتے جائیں تو رفتہ رفتہ آپ کے سیدھے ہاتھ کی سمت واقع ہل ویو پارک کی بلندی بڑھتی جائے گی کچھ فاصلے پر دو مرکزی گیٹ ہیں جو گاڑیوں کی آمدورفت کے لیے مختص ہیں ہل پارک کی اونچائی کی آخری حد اول مسجد ہے اس مسجد کے ساتھ مٹی کے ٹیلوں سے پیدل راستہ اوپر جاتا ہے۔

ادارہ ترقیات کراچی، کے ڈی اے کے کراچی منصوبہ A/13 کے تحت سابق ڈائریکٹر جنرل کے ڈی اے مسعود نبی نور ستارہ خدمت نے اس پارک کی داغ بیل 66-1965 میں رکھی بنیادی طور پر اور کاغذات میں اس بلند و بالا پارک کا نام ''کوہسار'' ہے مگر ایک پہاڑی پر واقع ہونے کی وجہ سے اس کا نام ہل پارک پڑ گیا اور تب سے اب تک اس کا اصل نام کوہسار پس منظر میں چلا گیا اور ہل پارک ابھر کر سامنے آیا ہل پارک میں جہاں واضح اور خوبصورت سنگ بنیاد نصب ہے اس کے ساتھ دائیں ہاتھ پر پودوں کے ساتھ ایک چھوٹا سا پتھر نصب ہے جو غالباً سنگ بنیاد کے طور پر لگایا گیا ہوگا۔ 161 ایکڑ پر مشتمل ہل پارک کا شمار کراچی کے ان پارکوں میں کیا جاتا ہے جہاں زندگی شام کے بعد بام عروج پر پہنچتی ہے۔

اس پارک کو 1971ء میں کے ایم سی کے حوالے کیا گیا اس وقت اسے کے ڈی اے اور کے ایم سی دونوں مل کر چلا رہی ہیں۔ ہل ویو پارک، فیملی پارک ہے اس میں پیدل بھی آیا جا سکتا ہے

اور گاڑیاں لے کر بھی۔ گاڑیوں کی آمد پر ٹکٹ ہے ہل ویو پارک وسیع و عریض جگہ ہے جدھر دیکھیے سبزہ گل کا سماں نظر آتا ہے ہل ویو پارک میں جانے کے لیے دو راستے ہیں ایک تو شاہراہ فیصل سے فائن ہاؤس کے سٹاپ سے چند فرلانگ اگے صدر سے آتے ہوئے سگنل سے قبل بائیں ہاتھ پر عیسی بھائی روڈ اور کے ڈی اے ہل ویو پارک سکیم تیرہ الف کا بورڈ نظر آئے گا اسی راستے پر اندر گلی میں چلیں تو سامنے روال مسجد اور پارک کی بلند ٹیکری نظر آئے گی یہ قدرے آسان راستہ ہے دوسرا راستہ شہید ملت روڈ پر میمن کواپریٹو سوسائٹی اور روہیل کھنڈ ایسوسی ایشن کے درمیان عثمان بھائی عیسیٰ بھائی میمن روڈ پر واقع ہے یہاں ایک پمپنگ اسٹیشن ہے جس سے پانی پائپ کے ذریعے اوپر ہل ویو پارک تک فراہم کیا جاتا ہے مگر پانی کی یہ سہولت عام اشخاص کو نہیں مل پاتی۔

ہل پارک کی نمایاں اور واضح خوبیوں میں فوارہ آبشاروں، جھیل گولف کا چھوٹا میدان، بانو گارڈن، دوعدد کار پارکنگ زون، معراج پارک اور فن سٹی کے علاوہ بلند بالا ٹیکری ہے۔

ہل ویو پارک میں موجود نئی آبشار کا افتتاح سابق میئر کراچی ڈاکٹر فاروق ستار نے 23 دسمبر 1991ء کو کیا ہل پارک کے اندر کھانے پینے کے لیے کئی سٹالز ہیں پارک کے اندر خواتین اور مرد حضرات کے لیے علیحدہ علیحدہ ٹوائلٹ بھی بنے ہوئے ہیں۔

ہل پارک کا پرانا قدیم تفریحی پلے لینڈ ''معراج پارک'' ہے اس پلے لینڈ کا سب سے کامیاب تفریحی کھیل ''بھوت بنگلہ'' ہے یہ ایک دلچسپ کھیل ہے مدھم روشنیوں میں اس کھیل کو دیکھنے والے ایک مردہ شخص کو دیکھتے ہیں کہ اچانک مردہ اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے یہ حرکت اتنی اچانک ہوتی ہے کہ کئی لوگوں کی چیخیں نکل جاتی ہیں۔

معراج پارک کے دوسرے کونے پر واقع فن سٹی جدید جھولوں پر مشتمل ہے جن میں سپیڈ وے، ریڈ بیرو، علی بابا، ویڈیو گیمز وغیرہ شامل ہیں۔ کھانے پینے کی اشیاء چاٹ، دہی بھلے، کون آئس کریم اور بوتلیں وغیرہ یہاں آپ کو با آسانی مل سکتی ہیں۔

پارک میں بچوں کے لیے تفریح طبع اور جسمانی ورزش کے لیے ریلنگ بنی ہوئی ہے پورے پارک کے اندر چہار اطراف گھاس، پودے، درخت نظر آتے ہیں بعض جگہ سبزہ و پھول کثرت سے ہیں۔ سبزہ کے درمیان چلنے کے لیے پتھر کی راہ گذر دونوں اطراف آپ کو ملتی ہے۔

ہفتہ روزہ ''فیملی میگزین'' لاہور۔ تحریر: انجم جاوید

○

ساحل سمندر کی تفریح گاہیں

کراچی، بحیرۂ عرب کے ساحل پر تقریباً 168 کلومیٹر سندھ ڈیلٹا کے شمال مغرب میں 24.46 درجے شمال عرض بلند اور 68.58 درجے مشرقی طول بلد پر واقع ہے۔ کراچی کے جنوب مشرق میں ضلع ٹھٹھہ (دیبل) مغرب میں ضلع لسبیلہ، شمال میں ضلع دادو اور جنوب میں بحیرۂ عرب ہے۔ کراچی کے مغرب میں حب ندی ہے جو کراچی کو ضلع لسبیلہ سے جدا کرتی ہے۔

کراچی کا شہری علاقہ قیام پاکستان کے وقت کل 233 اسکوائر کلومیٹر تھا جو 1959ء میں بڑھ کر 1724 اسکوائر کلومیٹر ہو گیا۔

کراچی ڈویژن کا موجودہ رقبہ تقریباً 3365 اسکوائر کلومیٹر ہے جس میں سے 1800 کلومیٹر سے زائد شہری علاقہ ہے۔

کراچی کی موجودہ آبادی کے بارے میں دو کروڑ نفوس کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ قصہ مختصر آبادی کے لحاظ سے یہ پاکستان کا سب سے بڑا شہر بن چکا ہے۔

کراچی کا موسم متعدل اور مرطوب ہے یعنی گرمیوں میں کم گرم اور سردیوں میں کم سردی۔ شاذونادر ہی موسم شدت اختیار کرتا ہے۔ عام طور پر اگست سے دسمبر کے دوران ہوا میں نمی کا تناسب 50 سے 80 فیصد رہتا ہے۔ جولائی اور اگست میں شہر مون سون ہواؤں کی زد میں رہتا ہے اور خاصا پریشان کرتا ہے۔ عام طور پر موسم خوشگوار رہتا ہے ہوا میں نمی زیادہ ہونے کی وجہ سے گرمی محسوس نہیں ہوتی۔ خوشگوار سا احساس رہتا ہے۔ کراچی سیر وسیاحت کرنے والوں کے لیے بڑی دلکشی رکھتا ہے۔ یہ اپنے پہلو میں قدامت اور جدت دونوں کو یکساں رکھے ہوئے ہے۔ کراچی کی قدیم عمارات تاریخی اہمیت کی حامل ہیں۔

کراچی، ہاکس بے کا 35 کلومیٹر طویل سمندری کنارہ سیر وتفریح اور پکنک منانے والوں کے لیے بڑی کشش رکھتا ہے۔ اس جگہ پر نیلم پوائنٹ کے لیے موڑ وے سنہرا پوائنٹ اور چھوکرا بیچ

خاص طور پر دیکھنے کے لائق مقامات ہیں اور لوگوں کی کثیر تعداد ان مقامات پر پکنک منانے آتی ہے۔

سمندر جہاں سیر و تفریح کے لیے کشش رکھتا ہے۔ وہیں یہ بہت سے خطرات سے بھرپور بھی ہے کیونکہ بعض اوقات سمندر کی لہریں کنارے پر ٹہلنے والوں کو اپنے ساتھ کھینچ کر لے جاتی ہیں۔ ایسے واقعات آئے روز پیش آتے رہتے ہیں۔ اس لیے یہاں پر تفریح کے لیے آنے والے حضرات چوکنا رہتے ہیں۔ سمندر کی لہروں میں شوریدگی عام طور پر گرمیوں کے موسم میں زیادہ پائی جاتی ہے اور اس موسم میں ایسے واقعات زیادہ پیش آتے ہیں۔

رات کے وقت کلفٹن پر بڑی رونق ہوتی ہے۔ بجلی کے ٹاور کی روشنی عجب نظارہ پیش کرتی ہے۔ دور تک گاڑیاں کھڑی نظر آتی ہیں جس میں اکثر لوگ اپنے اہل خانہ کے ہمراہ سیر و تفریح کی غرض سے آتے ہیں یہاں پر اونٹ اور گھوڑوں کی سواری کا بہت اچھا انتظام ہے۔

ساحلوں پر تعینات پولیس گارڈ لوگوں کو مخصوص مقام سے آگے نہیں جانے دیتا۔ اس کے لیے پولیس کو سختی کرنے کے احکامات جاری ہو چکے ہیں اور اگر حادثہ پیش آ جائے تو اس کے لیے فوری امداد کا خاطر خواہ انتظام موجود ہوتا ہے۔

ھاکس بے کے ساحل کے قریب ماہی گیر کھلے سمندر میں کشتیوں پر سوار مچھلیاں پکڑنے میں مصروف رہتے ہیں۔ کراچی کے مضافاتی اور ساحلی علاقوں کی صدیوں سے قائم قدیم بستیاں جنہیں عرف عام میں گوٹھ کہا جاتا ہے۔ سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز ہیں۔

سٹی گورنمنٹ فائر ڈیپارٹمنٹ کے پاس لائف گارڈز کی سہولت موجود ہے۔ انتظامیہ نے ایمرجنسی کی صورت میں مدد کے لیے ہاکس بے ایمرجنسی ریسورس سنٹر قائم کیا ہے۔ لائف گارڈز رات 8 سے 9 بجے تک ٹاوروں کے ذریعے ساحل کی نگرانی کرتے ہیں۔ اس سنٹر میں پانچ بستر دل اور ضروری طبی آلات کے ساتھ ایک ڈسپنسری بھی بنائی گئی ہے۔

ساحل سمندر دنیا میں تفریح کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ وہ ساحل سمندر کو خوبصورت اور دلکش بنا کر کروڑوں روپے کما رہے ہیں۔ بھارت میں ساحل سمندر کو تفریح کے لیے بہتر مقام کا اعزاز حاصل ہے۔

پاکستان میں ساحلی پٹی 100 کلومیٹر پر مشتمل ہے۔ کیماڑی اور منوڑہ کے ساحل اتنے وسیع ہیں کہ اگر حکومت ان کو ترقی دے تو سیاحت کے ذریعے کروڑوں کی آمدنی ہو سکتی ہے۔

حکومت کو زیادہ سے زیادہ ساحل سمندر پر تفریح کا اہتمام کرنا چاہیے اور اس علاقے میں آنے والے افراد اور ان کے خاندان کو زیادہ سے زیادہ تحفظ فراہم کرنا چاہیے۔ اس طرح ایک تو شہریوں کو خوشی کے لمحات میسر آئیں گے اور کراچی میں پھیلی ہوئی بے چینی اور خوف کم ہوگا۔

منوڑہ

سمندروں میں بحری جہازوں کی رہنمائی کے لیے کئی ایک طریقے استعمال کیے جاتے ہیں جن میں سے کئی طریقے تو صدیوں سے رائج ہیں ان طریقوں میں سے ایک طریقہ روشنی کے ذریعے بحری جہازوں کی رہنمائی کا بھی ہے اہم سمندری راستوں اور بندرگاہوں پر ''لائٹ ہاؤسز'' کی تعمیر کا سلسلہ بھی بہت پرانا ہے جہاں سے نکلنے والی روشنی کی شعاعوں سے بحری جہاز کو اپنے راستے پر چلنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ ''لائٹ ہاؤسز'' کی تعمیر کا مقصد بحری جہازوں کو راستے کی رکاوٹوں سے آگاہ کرنا بھی ہوتا ہے۔

پاکستان کی سب سے بڑی بندرگاہ کراچی میں ہر وقت بحری جہازوں کی آمد روفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے جن کی رہنمائی کے لیے منوڑہ میں ایک بہت بڑا لائٹ ہاؤس موجود ہے یوں تو کراچی کو بندرگاہ کے طور پر اٹھارویں صدی میں ہی استعمال کرنا شروع کر دیا گیا تھا لیکن تب یہاں آنے جانے والوں کو بے تحاشا مشکلات کا سامان کرنا پڑتا تھا آج کی کراچی کی بندرگاہ کی ابتدائی تعمیر کا سہرا ایک انگریز انجینئر جیمز واکر کے سر ہے۔ 1889ء میں منوڑہ میں بحری جہازوں کی رہنمائی کے لیے لائٹ ہاؤس بھی تعمیر کر دیا گیا اور جب 1909ء میں اس لائٹ ہاؤس کو نئی روشنیوں سے آراستہ کیا گیا تو اسے دنیا کے سب سے طاقتور لائٹ ہاؤس ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہو گیا اس وقت تک کراچی، برصغیر کی تین سب سے زیادہ معروف بندرگاہوں سے ایک تھی اس کی اہمیت کے پیش نظر پہلی جنگ عظیم کے دوران اس کے اردگرد کچھ معرکوں سے لائٹ ہاؤس کو بہت نقصان پہنچا۔ جس کی بعد میں مرمت کی گئی۔

پتھروں سے تعمیر کردہ یہ لائٹ ہاؤس طاقتور لینز سے لیس ہے جن کے ذریعے نکلنے والی شعاعیں 14 لاکھ موم بتیوں کی روشنی کے برابر ہوتی ہیں اس کے کام کرنے کا طریقہ بہت آسان ہے اور اس کی دیکھ بھال بھی مشکل نہیں ہے یہ لائٹ ہاؤس بہت جدید ٹیکنالوجی سے آراستہ ہے اور یہاں جدید آلات نصب ہیں یہاں 1871ء میں بہت سے خوبصورت گھر بھی تعمیر کیے گئے

تھے۔ جن میں بیشتر اس وقت بہت بری حالت میں ہیں۔ ان کی کھڑکیاں اور دروازے ٹوٹ چکے ہیں اور ان سے میں سے بیشتر عمارتوں کے صرف ڈھانچے ہی باقی رہ گئے ہیں البتہ اب یک کمپنی ڈی سی ہاؤس اور پائلٹ ہاؤس ان کی بحالی کا کام کر رہی ہے۔

منوڑہ میں واقع تاریخی عمارتوں کی بحالی کا کام کرنے والی کمپنی ابتدائی طور پر یہاں واقع 21 تاریخی مکانوں کی حالت بہتر بنانے کے منصوبے پر عمل پیرا ہے ان عمارتوں کی بحالی کے بعد انہیں یہاں آنے والے سیاحوں کے لیے ٹورسٹ ہاؤسز کے طور پر استعمال کیا جائے گا اس منصوبے میں کمپنی کو کراچی پورٹ ٹرسٹ کا تعاون بھی حاصل ہے۔

اگر منوڑہ کی طرف تھوڑی سی توجہ دی جائے تو اسے سیاحوں کے لیے ایک بہت ہی پرکشش مقام بنایا جاسکتا ہے یہاں ویسے بھی سیاحوں کی دلچسپی کے لیے بہت سی چیزیں اور مقامات ہیں جن میں یہاں کا لائٹ ہاؤس، ایک بزرگ کا مزار، مسجد، چرچ، دو گردوارے، مندر اور بہت سی دوسری عمارتیں ہیں۔ منوڑہ کی بحالی کا کام کرنے والی کمپنی کا خیال ہے کہ اس کے منصوبے کی تکمیل کے بعد منوڑہ سیاحوں کی بڑی تعداد میں اپنی طرف کھینچ سکے گا۔ اس سلسلے میں کمپنی کی ایک مقامی فائیو سٹار ہوٹل سے بھی بات چیت جاری ہے اور ہوٹل کی انتظامیہ نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ اگر یہاں ہوٹل کی نئی شاخ تعمیر کی جائے تو یہاں سے بہت زیادہ منافع کمایا جاسکتا ہے کمپنی یہاں واقع کے پی ٹی آفیسرز کلب کی عمارت کی بحالی کے منصوبے پر بھی کام کر رہی ہے۔ یہاں 1871ء میں تعمیر کیا جانے والا ایک بڑا نیول ہاؤس واقع ہے لیکن اب اس کی حالت بہت خراب ہو چکی ہے اب اسے بہترین ریسٹورنٹ کی شکل دی جائے گی۔ نیول ہاؤس سے سمندر کا نظارہ بہت دلکش دکھائی دیتا ہے۔

منوڑہ کو ایک دلکش تفریحی مقام میں تبدیل کرنے کا کام ایک مغربی خاتون ''جیسی برنز'' کی نگرانی میں کیا جائے گا جو خود بھی ایک نیول آفیسر کی بیٹی ہیں۔ منوڑہ سے برنز کی کچھ دلکش یادیں وابستہ ہیں بہت عرصہ پہلے وہ منوڑہ رہ چکی ہیں۔ ایک طویل عرصے کے بعد جب انہیں دوبارہ منوڑہ جانے کا موقع ملا تو انہیں یہ دیکھ کر بہت حیرانی ہوئی کہ منوڑہ کا نقشہ ہی بدل چکا تھا اور وہ عمارتیں جو کبھی اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں اب ان میں سے بیشتر کھنڈرات کا ڈھیر بن چکی ہیں۔ برنز نے بہت سوچ بچار کے بعد یہاں کی تاریخی عمارتوں کی بحالی کے کام کا بیڑہ اٹھایا اور اب وہ اس کام میں مصروف ہیں۔ برنز کا خیال ہے کہ ایسے تاریخی پس منظر کی وجہ سے یہ مقام بہت اہمیت کا حامل ہے

اس کام میں برنز کو کراچی پورٹ ٹرسٹ، پاکستان نیوی اور کئی دوسرے پاکستانی اداروں کے علاوہ غیر ملکی اداروں کا تعاون بھی حاصل ہے۔

منوڑہ میں تاریخی عمارتوں کی بحالی کے کام سے یہ توقع پیدا ہوگئی ہے کہ جلد ہی منوڑہ سیاحوں کے لیے ایک دلچسپ تفریحی مقام بن جائے گا۔ یہاں کے مقامی رہائشی بھی یہاں کی بہتری کے لیے جاری اس پراجیکٹ میں خصوصی دلچسپی لے رہے ہیں اگر کمپنی کو مزید کچھ فنڈز مل جائیں تو یقیناً عمارتوں کی بحالی کے کام میں مزید تیزی اور بہتری پیدا کی جاسکتی ہے۔ بہرحال اس وقت جس پیمانے پر کام ہورہا ہے وہ بھی اطمینان بخش ہے۔

جہانگیر کوٹھاری پویلئین

ایک خوبصورت سرمئی شام کا ذکر ہے!

بمبئی کے گورنر جارج ایمر وس لائیڈ اور ان کی بیوی لیڈی لائیڈ کو سر جہانگیر کوٹھاری (افسر برائے برطانوی راج) نے کلفٹن پر واقع اپنے خوبصورت گھر میں چائے پر مدعو کیا۔ لیڈی لائیڈ، سر جہانگیر نے خوبصورت لان سے اس سرمئی شام میں سمندر کا دلفریب منظر دیکھ کر مسحور رہ گئیں۔ ان کی آنکھوں میں ایک خوبصورت خواب اتر آیا۔ انہوں نے سر جہانگیر کو تجویز پیش کی کہ سمندر کے کنارے ایک خوبصورت عمارت تعمیر کی جائے تاکہ کراچی کے دیگر شہری بھی سمندر کا دلفریب نظارہ ایک حسین ماحول میں کرسکیں۔

میزبان کو مہمان کی یہ تجویز پسند آئی اور 05 جنوری 1920ء کو لیڈی لائیڈ کی آنکھوں میں اترے اس خواب نے عملی جامہ پہنا اور لیڈی لائیڈ نے سمندر کی طرف جانے والی ایک خوبصورت گذرگاہ لیڈی لائیڈ پئیر کا سنگ بنیاد رکھا۔ 21 مارچ 1921ء کو جمشیدی نوروز کے دن لیڈی لائیڈ نے اپنے نام سے منسوب اس گذرگاہ کا افتتاح کیا۔ یہ خوبصورت گذرگاہ اور اس سے متصل دیگر دو عمارات کو مجموعی طور پر جہانگیر کوٹھاری کلیسٹر کہا جاتا ہے۔ مشرق میں ایک مختصر سی خوبصورت عمارت جہانگیر کوٹھاری پریڈ اس کے بیچ سمندر کی جانب جانے والی گذرگاہ لیڈی لائیڈ پئیر اور مغرب میں جہانگیر کوٹھاری پویلین ہے۔ جس کا گنبد ملک بھر میں کراچی کی پہچان بن چکا ہے۔

لیڈی لائیڈ پئیر: جہانگیر کوٹھاری پویلین اور جہانگیر کوٹھاری پریڈ کے بیچ واقع گذرگاہ جسے عام طور پر بارہ دری بھی کہا جاتا ہے کا اصل نام لیڈی لائیڈ پئیر ہے۔ اس کی تعمیر پر اس دور میں تین

لاکھ روپے خرچ ہوئے۔ اس تاریخی گذرگاہ کے خاکے اور نمونے ییشام لی کی نگرانی میں بنائے گئے۔ ییشام لی اس وقت کراچی میونسپلٹی کے چیف انجینئر تھے۔ اس کی تعمیر آرکیٹیکٹ ای بی ہور کی نگرانی میں ہوئی۔ تعمیراتی سامان (پتھر، اینٹیں، چونا اور ریت وغیرہ) کا ٹھیکہ مجیر جان سی کمن کو دیا گیا۔ تمام سفر ایس جی لائیٹل کی نگرانی میں تراشے گئے۔ جبکہ راج گیری کا ٹھیکہ میسرز ولیم جی مورار جی اور نصر الدین اینڈ کمپنی کو دیا گیا۔

شریں جناح کالونی، سے کلفٹن کی حدود میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے جہانگیر کوٹھاری پویلین کا گنبد آنے والوں کو خوش آمدید کہتا ہے موسم خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو اس پویلین میں آنے والے کو نہ ٹھنڈ کا احساس ہوتا ہے اور نہ وہ یہاں حبس محسوس کرتا ہے۔

جہانگیر کوٹھاری پویلین کے کل 13 کالم ہیں جن پر بڑے چوکور پتھر Padamint یا چبوترے بنے ہوئے ہیں۔

سلیمان عبداللہ۔NCS جریدہ

○

ہالیجی جھیل

ہالیجی جھیل، پاکستان کے آبی مقامات میں ایک بہترین تفریح گاہ ہے پرندوں حیوانات اور نباتات کی بہتات نے اسے قدرتی مناظر اور ماحول کے متلاشی لوگوں کے لیے اہم مقام بنادیا ہے کراچی سے قریب اور قومی شاہراہ سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہونے کی وجہ سے اس جھیل پر پہنچنا بھی آسان ہے اور یہ اس کی مقبولیت کی ایک اور بڑی وجہ ہے۔

ہالیجی جھیل کی ساری دلکشی اور تمام تر حسن اس کے نیلے پانیوں کے سکون اس کے رنگا رنگ مقامی اور مہمان پرندوں کی بہتات اور اس کے دلکش جزیروں کے باسیوں سے عبارت ہے۔

آج سے اٹھارہ ہزار سال قبل جب زمین کے موسمی حالات نے تبدیل ہونا شروع کیا اور زمین کا درجہ حرارت بتدریج بڑھنے لگا تو اس کے نتیجے میں قطبوں پر جمی برف پگھلنا شروع ہوگئی بلندی سے پگھلتی ہوئی یہ برف زمین پر پانی بن کر پھیل گئی جس کی وجہ سے زمین کئی خطوں میں بٹ گئی۔

چونکہ پاکستان میں کئی پہاڑی سلسلے ہیں لہٰذا ان پر جمی برف کے پگھلنے کے باعث یہاں بہت زیادہ آبی ذخائر بھی ہیں اور بہت سی آبی گزرگاہیں بھی ہمالیائی سلسلوں سے نکلنے والے آبی راستے شمال کے بلند و بالا پہاڑوں سے جنوب کی دلدلی علاقوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔

دریائے سندھ ہمارے ملک کا مرکزی دریا ہے جو شمال کے بلند و بالا ہمالیائی خطوں سے شروع ہوتا ہے اور پھر بحیرۂ عرب میں جا گرتا ہے کئی اور جھیلوں اور تالابوں کی طرح اس دریا کا پانی کنیھجر جھیل کو سیراب کرتا ہے جو بعد ازاں ہالیجی جھیل کو سیراب کرتی ہے۔

ہالیجی جھیل درحقیقت ایک تالاب تھا جہاں بارش کا پانی جمع رہتا تھا اس کے اطراف میں قسم قسم کے پرندے حیوانات اور نباتات پائے جاتے تھے لیکن اس صدی کی تیسری دھائی میں اس تالاب کو ایک وسیع ذخیرہ آب کی شکل دے دی گئی جس کے باعث یہ کراچی شہر کی آبادی کو پانی کی

فراہمی کا ایک بہت بڑا ذریعہ بن گیا اور پرندوں نباتات اور حیوانات کی بھی کثرت ہوگئی۔

محل وقوع کے اعتبار سے ہالیجی جھیل قومی شاہراہ پر واقع ہے کراچی سے با آسانی چند گھنٹے کی مسافت کے بعد بذریعہ سڑک وہاں پہنچا جاسکتا ہے۔ یہ کراچی سے 88 کلومیٹر اور ٹھٹھہ سے صرف 21 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے جب آپ کراچی سے ٹھٹھہ کی جانب قومی شاہراہ پر سفر کریں تو 88 کلومیٹر اور بائیں جانب ایک بورڈ نظر آتا ہے۔ جو ہالیجی جھیل جانے والے کچے راستے کی نشاندھی کرتا ہے اس راستے پر 5 کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد آپ ہالیجی جھیل کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔

ہالیجی دراصل آبی پرندوں اور خصوصاً مرغابیوں کی گزرگاہ بھی ہے اور جائے پناہ بھی! سرد خطوں سے ہجرت کر کے جمع ہونے والے پرندے جس مخصوص راستے سے گذرتے ہیں ہالیجی اس راستے پر واقع ہے اس کو ''انڈس فلائی وے'' کہا جاتا ہے ہر سال ہزاروں کی تعداد میں آبی پرندے خصوصاً مرغابیاں اسی راستے سے سفر کر کے یہاں پہنچتی ہیں یا آگے جاتی ہیں یہ پرندے سرما کا موسم یہیں گذراتے ہیں ان پرندوں کو چار اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

1۔ موسم سرما کے مہمان پرندے 2۔ موسم گرما کے مہمان پرندے

3۔ جزوی مہمان پرندے 4۔ اتفاقیہ مہمان پرندے

اسی جھیل کے چٹانی کناروں پر جو باہر کو نکلے ہوئے ہیں یہ مہمان پرندے اور مقامی پرندے اپنی رہائش رکھتے ہیں۔

ہالیجی جھیل ایک خوبصورت مقام ہے یہاں کے تین جزیروں کے باعث اس کی خوبصورتی اور کشش میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے یہ جزیرے جنگلی حیات اور پرندوں کے لیے حد درجہ پر لطف زندگی کا باعث ہیں۔

ان جزیروں کے نام یہ ہیں۔

1۔ پیلی کسن آئی لینڈ

2۔ کورمورنٹ آئی لینڈ

3۔ کروکوڈائل آئی لینڈ

ان جزیروں پر سینکڑوں پرندوں کی موجودگی کا مشاہدہ کسی بھی وقت کیا جاسکتا ہے خصوصاً شام کے اوقات میں جب یہ واپس اپنی رہائش گاہوں میں پہنچتے ہیں موسم سرما میں کروکوڈائیل آئی

لینڈ کے کناروں پر مگر مچھ بھی دھوپ سینکتے نظر آتے ہیں۔

ہالیجی جھیل کے اطراف کا پانی نمکین ہے جس کے باعث ہر قسم کے پرندے یہاں آتے ہیں یہاں جس نہر کے ذریعے پانی آتا ہے اس کے دونوں کناروں پر سر سبز و شاداب گھاس گھنی جھاڑیاں اور خوبصورت درخت واقع ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نہر کے کناروں کو درختوں یا گھاس سے ڈھانپ کر بنایا گیا ہے اس خوبصورت ماحول کے باعث پرندوں کی افزائش نسل پر بھی نہایت مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں در حقیقت یہ ایک دلکش اور قابل دید مناظر سے بھرپور جگہ ہے۔

ہالیجی کے گردو نواح میں بھی مزید خوبصورت جھیلیں واقع ہیں بائیں جانب جو جھیل ہالیجی سے ملحق ہے اس کا نام چینجی جھیل ہے اس جھیل میں موسم برسات کے بعد کافی عرصہ پانی جمع رہتا ہے جب اس میں پانی کی کثرت ہو تو یہاں پرندوں کی بھی بہتات ہو جاتی ہے۔

ہڈیرو جھیل ہالیجی کے نواح میں دوسری جھیل ہے یہاں نمکین پانی ہے پانی جب چٹانی کناروں سے ٹکراتا ہے تو ایک قابل دید منظر ہوتا ہے اس جھیل میں آبی پرندوں کی انتہائی نایاب اقسام بھی پائی جاتی ہیں ان میں بگلے، کونج، اور پیلی کسن نمایاں ہیں بیوک کے ہنس بھی صرف یہاں ہی دکھائی دیتے ہیں۔

ان دو جھیلوں کے علاوہ تیسری جھیل کینجھر جھیل ہے یہاں بھی انواع و اقسام کے پرندے پائے جاتے ہیں ایک خوبصورت تفریحی مقام ہے ہالیجی سے اس کا فاصلہ 50 کلومیٹر ہے کراچی کے باشندوں اور ملکی سیاحوں کے لیے اس پر فضاء مقام پر تیراکی پانی میں ڈبکیاں لگانا اور کھیل کود ایک پسندیدہ مشغلہ ہے لوگ یہاں کی سیر سے لطف اٹھاتے ہیں خصوصاً میٹھے اور نمکین پانی کے امتزاج سے لوگ حیران ہوتے نظر آتے ہیں چینجی جھیل کے سوا باقی تینوں جھیلوں کے علاقے میں ہر طرح کا شکار ممنوع ہے حکومت سندھ نے اس قدرتی ماحول کے تحفظ کے لیے قانونی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں یہاں پرندوں یا جانوروں کا شکار یا نباتات کو نقصان پہنچانا تین میل کے دائرہ میں سختی سے منع ہے حکومت نے ان تینوں مقامات کو جنگلی حیات کی تحفظ گاہیں قرار دیا ہے اس مقصد کے لیے سندھ وائلڈ لائف پروٹیکشن ایکٹ نافذ ہے۔

ہالیجی جھیل اور کینجھر جھیل دونوں بین الاقوامی اہمیت کے آبی مقامات قرار دیئے گئے ہیں ہالیجی پرندوں کے مشاہدے ان کی حرکات و سکنات اور ان کی عادات کے مطالعہ کے لیے ایک بھرپور اور مکمل جگہ ہے جہاں ان گنت اقسام کے پرندے اور دیگر حیوانات موجود ہیں۔

ایک اندازے کے مطابق پرندوں کے 222 مختلف اقسام ہالیجی اور اسکے اطراف میں پائی جاتی ہیں موسم سرما کی کسی شفاف دوپہر کو ہالیجی جھیل میں انواع واقسام کے پرندوں بطخوں اور دیگر آبی حیوانات کی سطح آب پر تیراکی کا دلچسپ نظارہ کیا جاسکتا ہے۔

یہاں پرندوں کے جھنڈ اور پودے ایک دوسرے میں مدغم نظر آتے ہیں شکاری پرندے مثلاً بازشکرے وغیرہ چھوٹے پرندوں پر بار بار حملہ کرتے نظر آتے ہیں سارس اور بگلے کبھی کبھار گھٹنوں پانی ہی کھڑے اپنی غذا سے لطف اندوز ہوتے دکھائی دیتے ہیں جھیل کے کناروں پر کنول کے پھولوں اور پتوں پر مینڈک ادھر ادھر پھدکتے نظر آئیں گے پرندوں کی زندگی کا یہ مشاہدہ انتہائی تفریح لیے ہوئے ہیں۔

ہالیجی اور ملحقہ علاقوں میں مہمان پرندے عموماً ماہ جنوری سے فروری کے اوائل تک کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں جس کے بعد رفتہ رفتہ سرد علاقوں کی جانب اپنا سفر شروع کردیتے ہیں اوائل مارچ تک تقریباً تمام پرندے واپس چلے جاتے ہیں ہالیجی اور ملحقہ علاقوں میں ان کی آمد ستمبر کے مہینے سے شروع ہوتی ہے۔

سندھ وائلڈ مینجمنٹ بورڈ نے ہالیجی کے مقام پر اپنا ایک اطلاعاتی مرکز قائم کیا ہے جو شائقین اور طالب علموں کو آبی ذخائر جنگلی حیات اور آبی پرندوں کے متعلق معلومات فراہم کرتا ہے جھیل کے بائیں کنارے پر دو کشادہ اور آرام دہ بنگلے بھی ہیں جہاں رہائش کی تمام سہولتیں موجود ہیں یہ بنگلے کراچی واٹر اینڈ سیوریج بورڈ کی زیر نگرانی ہیں انہیں سیوریج بورڈ کے مرکزی دفتر کراچی سے ہالیجی روانگی سے قبل بک کروایا جاسکتا ہے۔

جھیل کی اس پرسکون دنیا کے اوپر بھی ایک دنیا محو پرواز نظر آتی ہے جس میں Osprey، مچھلی خور شاہین، سارا اور چیلیں وغیرہ شامل ہیں کچھ پرندے ایسے بھی ہیں جو اس جھیل میں کبھی کبھی آتے ہیں ان میں خصوصاً راج ہنس کو دیکھ لینا خوش قسمتی ہوسکتا ہے راج ہنس کو محبت اور حسن کا نشان سمجھا جاتا ہے اور کسی بھی شخص کے لیے اس دیکھنا ایک خواہش ہوتی ہے راج ہنس کو جھیل کے پانی میں خاموش اور باوقار انداز میں متحرک دیکھنا فطرت کا سب سے حسین نظارہ ہے۔

مختلف اقسام کے آبی پرندے ستمبر کے اوائل میں نقل مکانی کر کے جھیل میں آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ ان کا مقصد نسبتاً کم سرد علاقوں کو اپنا مسکن بنانا ہوتا ہے سائبریا کی شدید سردی انہیں نقل مکانی پر مجبور کرتی ہے اور یہ قازقستان سے ہوتے ہوئے پاکستان اور بھارت جاتے

ہیں۔اس خوبصورت جھیل میں پائے جانے والی حیات کی مختلف النواع کوتحفظ فراہم کرنے کے لیے حکومت پاکستان نے 1971ء میں اسے گیم سنکچوری کے درجے پر مشتمل اس علاقے کا درجہ بڑھا کر وائلڈ لائف سینکچوری کر دیا تھا یہ کارروائی تحفظ جنگلی حیات کے سندھ آرڈی نینس مجریہ 1972ء کے تحت عمل میں لائی گئی جس کے تحت علاقے میں مقیم ہر فرد پر زمین کی کاشت نباتات کے استعمال اور جنگلی حیات کے شکار پر پابندی لگا دی گئی۔شروع میں جھیل کے اردگرد ایک میل کا علاقہ بفرزون رکھا گیا مگر 1965ء میں اسے تین میل کر دیا گیا لیکن حکومت کے ان اقدمات کے باوجود اب بھی یہ جھیل اور اس میں موجود حیات کی نادر انواع مختلف خطرات کی زد میں ہیں غیر قانونی طور پر مچھلی پکڑنے یہاں سے درخت کاٹنے اور پرندوں کا شکار کرنے کے واقعات اکثر ہوتے رہتے ہیں جھیل کی تہہ میں جمع ہوتی ہوئی مٹی اور دیگر کثافتیں مستقبل میں مسائل کا باعث بن سکتی ہیں کیا آئندہ نسلوں اور اپنے لیے پرندوں کی جنت کا مستقبل بنانا ہماری ذمہ دار نہیں کیا ہمیں فطرت کے کسی ایسی ایسے حسین شاہکار کی ضرورت نہیں رہی جو ہماری سوچوں اور تخیل کو نئی زندگی دے جو چند لمحوں کے لیے ہماری توجہ انسان کے ماضی سے ہٹا دے۔

کیونکہ یہاں کا قدرتی ماحول ایک خوبصورت دنیا بسائے ہوئے ہے جہاں قدم قدم پر تازہ ہوا قدرتی نظارے پرفضا ماحول امن وسکون خوشگوار ٹھنڈک پھول سبزہ اور درخت اور طرح طرح کے پرندے آنے والوں کے منتظر رہتے ہیں۔

○

منچھر جھیل

دنیا کی سب سے قدیم جھیل منچھر جھیل کراچی سے تقریباً 280 کلومیٹر (175 میل) کے فاصلے پر ضلع دادو کے تعلقہ جوہی کھیر تھر پہاڑ کے دامن میں واقع ہے یہ جھیل کب وجود میں آئی اس کے متعلق حتمی طور پر کوئی کچھ نہیں کہا جاسکتا البتہ یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ جھیل موہن جودڑو اور ہڑپہ کی تہذیبوں سے بھی قدیم ہے یعنی یہ قدیم ترین پتھر کے دور سے اسی جگہ پر موجود ہے۔

منچھر جھیل، دریائے سندھ سے قدرے بلندی پر واقع ہے اس لیے جب دریا میں سیلابی کیفیت ہوتی ہے تو دریا کا زائد پانی حفاظتی پشتے توڑ کر پورے علاقے میں پھیل جاتا ہے مگر جب دریا کی سیلابی کیفیت ختم ہو جاتی ہے تو جھیل کا زائد پانی دریائے سندھ میں واپس ہو جاتا ہے اور منچھر جھیل اپنی اصل حالت میں واپس آ جاتی ہے ان حالات کے پیش نظر گزشتہ صدی کے دوران سے دریائے سندھ کے ساتھ ملانے کے لیے ایک "اڑی" نامی نہر بنا دی گئی تھی۔ جس سے دریا کا سیلابی پانی منچھر جھیل میں محفوظ ہو جاتا ہے یہ جھیل 520 مربع کلومیٹر کے وسیع عریض علاقے میں پھیلی ہوئی ہے۔

منچھر جھیل سے لاکھوں لوگوں کی قسمتیں وابستہ ہیں اس جھیل کو دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی کوئی شہر آباد ہے اس شہر میں ہزاروں کشتیوں پر سوار پورے کا پورا خاندان نسل در نسل آباد ہے ان خاندانوں کو "میر بحر" کہا جاتا ہے ان کی صبح کہیں ہوتی ہے تو شام کہیں۔ میر بحروں کی تمام تر خوشیاں، مصائب اور تکالیف اس جھیل ہی سے وابستہ ہیں منچھر جھیل ان کے لیے ذریعہ آمدنی اور غذا کی فراہمی کا وسیلہ بھی ہے۔

جھیل میں تقریباً دو سے زائد اقسام کی مچھلیاں جو صدیوں سے منچھر جھیل میں پائی جاتی ہیں بالکل ختم ہو گئیں اب جو مچھلیاں اس جھیل میں ہیں ان میں سندھی حرگو، گندن، لوھر، سنگاڑا، پھندلی،

مورا کا اور کڑ وا وغیرہ شامل ہیں اس وقت مچھر جھیل مچھلیوں کی افزائش کا سب سے بڑا مرکز ہے۔
اس جھیل سے لاکھوں من مچھلیاں ہر سال پکڑی جاتی ہیں اس کے علاوہ اس جھیل میں کنول کافی مقدار میں پیدا ہوتا ہے لوگ کنول کے بیجوں کلیوں اور اس کی جڑوں کو بطور سبزی پکا کر کھاتے ہیں۔

جہاں ہری بھری گھاس اچھا موسم اور قدرتی جھیل ہو وہاں پرندوں کا دور دراز علاقوں سے آنا ایک فطری بات ہے سردیوں کے موسم میں منچھر جھیل ہر قسم کے پرندوں سے بھر جاتی ہے پرندے عارضی طور پر مختلف ممالک سے ہر سال یہاں آتے ہیں اکثر یہاں سائبریا اور اس قسم کے ٹھنڈے ممالک سے پرندے منچھر جھیل میں آتے ہیں اس جھیل میں آنے والے پرندوں کی متعدد اقسام ہوتی ہیں۔ مثلاً ہنس لاکو جانی، راج ہنس، آڑی (آری جل مرغی) نیگری (نیل سر) کانیرو (چونچ بزا) ڈگوش (چھوٹی بطخ) کنگھا (لنگور) چنچلوں (چکیکلو بطخ) گنگ مرغیاں اور مختلف بطخیں وغیرہ شامل ہیں اس کے علاوہ منچھر جھیل میں سندھی ہنس بھی کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں یہ ہنس تین طرح کے ہوتے ہیں ایک بھورے رنگ کے ہنس دوسرے سفید منہ والے اور تیسرے کلغی والے ہنس، کہا جاتا ہے کہ یہ ایک نایاب نسل ہے جو اس جھیل میں پائی جاتی ہے۔
آج کل تو ان پرندوں کو رائفل یا بندوق سے مارا جاتا ہے لیکن اس سے پہلے میر بحر یعنی زندہ اپنے ہاتھوں سے پکڑتے تھے۔
موسم سرما میں منچھر جھیل میں پانی کی سطح کافی کم رہتی ہے اور دور دور تک خشک سالی ہوتی ہے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میر بحروں کے یہ خاندان مختلف غذائی اجناس کی کاشت کرتے ہیں یہاں غذائی اجناس میں گندم، جوار، جو، سرسوں، کپاس اور چاول وغیرہ شامل ہیں میر بحر حضرات انہیں نہ صرف اپنی ضروریات کے لیے استعمال کرتے ہیں بلکہ قریبی منڈیوں میں فروخت کر کے اپنی ضروریات زندگی پوری کرتے ہیں۔
منچھر جھیل کو سیاحت کا مرکز بنایا جا سکتا ہے یہاں کے عوام کا عرصہ دراز سے مطالبہ ہے کہ منچھر پر ایک ڈیم بنایا جائے تاکہ جوہی تحصیل اور سیہونا کی لاکھوں ایکڑ زمین کاشت ہو سکے۔

○

کینجھر جھیل

کینجھر جھیل کئی لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے موسم سرما میں متعدل آب وہوا اور خوراک کی تلاش میں آنے والے آبی پرندوں کے لیے گوشہ وعافیت پاکستان کے سب سے بڑا شہر کراچی کے لیے پانی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اہم ذریعہ اور تفریح کے متلاشیوں کے لیے جھیل کے بیچوں بیچ سندھ کی لوک رومانوی داستان کے کردار نوری جام تماچی کا مزار مرجع خلائق ہے۔

کینجھر پاکستان میں میٹھے پانی کی ایک بڑی محفوظ آب گاہ ہے یہ کراچی سے 122 اور حیدر آباد سے 86 کلومیٹر دور قومی شاہراہ پر ضلع ٹھٹھہ میں واقع ہے یہ آب گاہ 1932ء میں دو جھیلوں کلری اور کینجھر کو ملا کر بنائی گئی۔ جھیل کا موجودہ رقبہ 13 ہزار چار سو 68 ہیکٹر ہے اس کی طوالت 24 کلومیٹر جبکہ چوڑائی چھ کلومیٹر رقبے کے قریب ہے۔ جھیل کو کوٹری بیراج سے نکالی گئی نہر کلری بھگار فیڈر (کے بی فیڈر) کے ذریعے دریائے سندھ کے پانی سے بھرا جاتا ہے جبکہ اس کے علاوہ شمال او رمغرب کی جانب سے یعنی موسمی برساتی نالے بھی جھیل میں گرتے ہیں اور موسم برسات میں ان کے ذریعے بارش کا پانی جھیل میں بھر جاتا ہے۔ جھیل کے اطراف کا موسم گرمیوں میں سخت گرم اور موسم سرما میں سخت سرد ہوتا ہے اور یہاں پر بارش کا سالانہ اوسط 175 ملی میٹر ہے۔

جھیل کو 1971ء میں پہلی مرتبہ مغربی پاکستان وائلڈ لائف پروٹیکشن آرڈیننس شق نمبر 15 کے تحت محفوظ گیم سنیکچری کا درجہ دیا گیا اور پھر 1977ء میں اسے سندھ لائف پروٹیکشن آرڈیننس کے وائلڈ لائف سنیکچری قرار دیا گیا۔ جھیل کا انتظام وانصرام حکومت سندھ کے صوبائی محکمہ انہار کے ذمہ ہے جبکہ محکمہ فشریز اور بعض دیگر محکموں پر بھی جزوی طور پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ کینجھر جھیل 23 جولائی 1976ء کو (امسر سائٹ (نمبر 99) قرار پائی اور اسے

عالمی طور پر بھی تحفظ حاصل ہوا۔

کینجھر جھیل کراچی اور ٹھٹھہ کو پینے کے پانی کی فراہمی کا ایک اہم ذریعہ ہے جبکہ جھیل میں تجارتی بنیادوں پر ماہی گیری بھی کی جاتی ہے جھیل پر کشتیوں میں زندگی بسر کرنے والے سینکڑوں ملاحوں کے علاوہ اس کے کنارے پر آباد پندرہ سے زیادہ گوٹھوں کے باشندوں کی گذراوقات کا اہم ذریعہ کینجھر سے پکڑی جانے والی مچھلی ہے جھیل موسم سرما میں آنے والے سرد ممالک کے آبی پرندوں کی مہمان گاہ اوران کی افزائش نسل کا کام بھی سرانجام دیتی ہے سندھ وائلڈ لائف مینجمنٹ بورڈ کے مطابق جھیل پر سرد ممالک سے آنے والے پرندوں کی 65 اقسام ریکارڈ کی گئی ہے جبکہ یہاں ہر سال لاکھوں پرندے معتدل آب وہوا اور افزائش نسل کے لیے رخ کرتے ہیں۔

○

ڈرگ جھیل، لاڑکانہ

ڈرگ جھیل سندھ کے ضلع لاڑکانہ کے شمال مغرب میں لاڑکانہ قمبر روڈ پر شہر سے 18 کلومیٹر دور ایک چھوٹے سے گوٹھ ڈرگ کے قریب واقع ہے اسی کی مناسبت سے آب گاہ کو بھی یہی نام ملا اس کا رقبہ 164 ہیکڑ ہے اس کی لمبائی 3 کلومیٹر، چوڑائی 2 کلومیٹر اور پانی کی گہرائی 10 میٹر تک ہے کسی زمانے میں یہ جھیل دریائے سندھ کا بازو ہوا کرتی تھی۔ جس میں سیلاب کے موسم میں دریائے سندھ کا پانی چڑھ آتا تھا لیکن اب دریائے سندھ اس سے 30 کلومیٹر دوری پر بہتا ہے پرانی قدرتی آب گاہ ہونے کی وجہ سے گرم پانی اور خوراک کی تلاش میں سرد ممالک کے پرندے عرصہ دراز سے موسم سرما میں سائبریا سمیت وسط ایشیائی ریاستوں سے انڈس فلائی وے کے ذریعے گذرتے ہوئے یہاں پر آتے ہیں۔ اور پھر موسم بہار میں کوچ کر جاتے ہیں پرندوں کی اس ہجرت اور یہاں آمد نے لوگوں کی توجہ اس جھیل کی طرف مبذول کرادی۔

اور 60ء کی دھائی کے نصف میں اسے ملک کی اعلیٰ ترین شخصیات کی تفریح طبع کے لیے شکار گاہ کا درجہ دے دیا گیا۔ 1972 میں ڈرگ جھیل کو سندھ وائلڈ لائف پروٹیکشن آرڈیننس کے سیکشن 14 کے تحت وائلڈ لائف سنیکچری قرار دے دیا گیا۔ 23 جولائی 1976ء میں ڈرگ جھیل کو مہمان پرندوں کی آمد کے باعث عالمی معاہدے رامسر کونشن کے تحت محفوظ آب گاہ کا درجہ دیا گیا۔ سندھ میں یہ تیسری محفوظ آب گاہ (رامسر سائٹ نمبر 100) ہے جھیل کو رامسر سائٹ قرار دیئے جانے کے بعد یہاں پر پرندوں اور مچھلیوں کے شکار پر پابندی عائد کردی گئی جھیل کے پانی کا سب سے بڑا ذریعہ دریائے سندھ کے سیلابی پانی اور مون سون کی بارشیں ہیں۔ ڈائریکٹری آف ایشین ویٹ لینڈز کے مطابق یہاں بارشوں کی اوسط 177 ملی میٹر سالانہ تھی۔

ڈرگ جھیل پر انڈس فلائی وے کے راستے سے ستمبر کے آخر میں ہی پرندوں کی آمد شروع ہو جاتی ہے اور پھر یہ پرندے موسم بہار میں ہی یہاں سے رخت سفر باندھتے ہیں اور الوداعی اڑان

بھرتے ہیں جھیل کے مہمان پرندوں میں بطخیں جل مرغی یا سیاہ مرغی کی تعداد دیگر پرندوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے جبکہ لق لق، سارس، پلیکون، کنگ فشر اور کونج بھی یہاں پر آنے والے پرندوں میں شامل ہیں اکثر پرندے یہاں کی متعدل آب وہوا میں انڈے دیتے ہیں اور پھر اپنے بچوں کو ڈرگ جھیل کے سینے پر اڑان سکھا کر انہیں اپنے ساتھ آبائی وطن لے جاتے ہیں۔ 1973ء میں 32 ہزار بطخوں اور جل مرغی کو جھیل پر ریکارڈ کیا گیا۔

پہلے پہل یہاں آنے والے پرندوں کی تعداد بہت زیادہ بلکہ ہزاروں میں ہوتی تھی لیکن رفتہ رفتہ ماحول بدلتا گیا۔ جھیل کی سطح آب میں کمی آتی گئی اور سرکاری مشینری کی غیر ذمہ داری کی وجہ سے خود رو آبی پودے اور جھاڑیاں بڑی تعداد میں پیدا ہوتی چلی گئیں جس سے نہ صرف آبی حیات بلکہ جو تھوڑے بہت پرندے آجاتے تھے ان کی خوراک کو بھی بڑی حد تک متاثر کیا اور ایک یہ صورتحال ہے کہ پرندوں کی اکثر تعداد یہاں نہیں ٹھہرتی بلکہ وہ بھارت ہی واقع آب گاہ بھرت پور کا رخ کر جاتے ہیں۔ اس وقت ڈرگ جھیل کے لیے بورڈ کے زیر اہتمام ایک گیم انسپکٹر اور تین گیم واچرز موجود ہیں۔

ڈرگ جھیل کے تحفظ کے لیے ایک تحقیقاتی مرکز کی ضرورت ہے۔ جھیل کے کنارے ایک ریستوران تعمیر کیا گیا تھا مگر یہ خالی پڑا ہوا ہے اس کے ایک حصے میں ریسرچ سینٹر قائم کیا جا سکتا ہے جھیل کے چاروں اطراف باڑھ لگا کر جنگلی درختوں اور پودوں کو تحفظ فراہم کیا جا سکتا ہے۔ ڈرگ کو شرف میزبانی بخشنے والے پرندوں کی افزائش نسل کے لیے مصنوعی گھونسلے بھی بنائے جا سکتے ہیں تا کہ باہر سے آنے والے پرندوں کو محفوظ ماحول ملے اور مقامی پرندوں کی گھٹتی ہوئی نسلوں کی تعداد بھی بڑھائی جا سکے۔

مختار آزاد۔ NCS جریدہ

○

دریائے سندھ

دریائے سندھ، جنوبی ایشیاء کا سب سے بڑا دریا ہے مختلف علاقوں میں اس کے الگ الگ نام ہیں مثلاً ببر شیر دریا، اباسین، انڈس اور مہران وغیرہ۔

اس دریا کے منبع کے بارے میں شروع سے اختلاف رہا ہے ہندو دیو مالائی کہانیوں میں اس کا منبع جھیل مانسرو درج ہے حالانکہ 1881ء میں انگریز مہم جو ولیم مور کرافٹ نے جھیل مانسرو کے گرد چکر لگایا اور اعلان کیا کہ اس جھیل سے کوئی بھی دریا نہیں نکلتا اس کے بعد مختلف مہم جو اس دریا کے منبع کو تلاش کرتے رہے اور سب نے اس بات پر اتفاق کیا کہ جھیل مانسرو کو دریائے سندھ کا منبع قرار دینا بہت بڑی غلطی ہے۔

1907ء میں سویڈن کے ایک مہم جو سیون ہیڈن نے جھیل مانسہرو کا دورہ کیا دریائے سندھ کے منبع کی تلاش میں وہ کیلاش پربت کے گرد چکر کاٹ کر جھیل مانسرو سے قریباً تیس میل کے فاصلے پر شمال میں ایک ایسے مقام پر پہنچا جسے تبت کے باشندے دریائے سندھ کا منبع قرار دیتے ہیں اس نے ایک چھوٹا سا تالاب دیکھا جس میں زیر زمین چشموں کا پانی اکٹھا ہوتا ہے پھر ایک چھوٹی سی ندی کی صورت میں شمال مغرب کی طرف بہنا شروع کر دیتا ہے یہ تالاب ہی دریائے سندھ کا منبع ہے اسے تبتی زبان میں سنگھے خاباب کہتے ہیں جس کا مطلب ہے ببر شیر کا منہ تبت کے باشندوں کے مطابق دریائے سندھ ببر شیر کے منہ سے نکلتا ہے یہی اس نام کی وجہ تسمیہ ہے تبت میں دریائے سندھ کو سینگے کہا جاتا ہے جس کے معنی ببر شیر ہے سنگے خاباب سے یہ دریا شمال مغرب کی طرف بہنا شروع کرتا ہے اور پھر ایک لمبا چکر کاٹ کر ایک مقام ٹاشی گانگ تک پہنچتا ہے ٹاشی گانگ سے کوئی پانچ میل پہلے اس میں اس کا پہلا بڑا معاون دریا دریائے شبوک شامل ہو جاتا ہے۔

وادی سکردو میں دریائے سندھ کا خاصا پھیلاؤ ہے اور دریا خراماں خراماں بہتا ہے سکردو کے مغرب میں اس میں شمال سے ایک دریا شگر شامل ہو جاتا ہے شگر کی شمولیت کے بعد دریا ایک تنگ

وادی سے ٹکرا کر مست ہاتھی کی طرح چنگھاڑتا اور جھاگ اڑاتا مغرب کی طرف رواں دواں ہو جاتا ہے گلگت کے جنوب مشرق میں بنجی کے مقام سے قریباً پانچ کلو میٹر اوپر اس میں دریائے گلگت اپنے معاون دریاؤں کا پانی لے کر آ شامل ہوتا ہے یہاں دریا کا رخ جنوب کی طرف ہو جاتا ہے۔

بنجی کے مقام سے ذرا نیچے بائیں جانب سے اس میں دریائے استور شامل ہو جاتا ہے یہاں سے جنوب کی سمت دریائے سندھ نانگا پربت 26660 فٹ کے شمال مغرب کا چکر کاٹ کر اپنا رخ مغرب کی طرف بدل لیتا ہے اور وادی چیلاس میں آہستہ آہستہ بہنا لگتا ہے اس وادی میں ایک مقام بھاشا ہے یہ تربیلا سے 314 کلو میٹر اوپر واقع ہے یہاں بھاشا ڈیم کی تعمیر کے سلسلے میں سروے ہو رہا ہے بھاشا سے مغرب کی طرف ایک سازین ہے یہاں سے دریا پھر جنوب کا رخ اختیار کرتا ہے اور تربیلا جھیل میں جا گرتا ہے۔

سنگھے خاباب سے تربیلا ڈیم تک دریائے سندھ کی لمبائی تقریباً ایک ہزار میل 1600 کلو میٹر ہے تربیلا ڈیم سے سات کلو میٹر دور جنوب میں غازی کے مقام پر ایک بڑا بیراج بنا کر دریائے کے پانی کو ایک نہر کے ذریعے بروتھا کے مقام پر جمع کیا گیا ہے جہاں ایک بڑا بجلی گھر بنانے کا منصوبہ ہے اس بجلی گھر کے تالابوں میں سے ہوتا ہوا نہر کا پانی دریائے سندھ میں شامل ہو جائے گا۔

تربیلا سے نیچے دریا کا پاٹ خاص چوڑا ہو جاتا ہے اور اس میں چھوٹے چھوٹے کئی جزیرے بن جاتے ہیں جنہیں مقامی زبان میں بیلہ کہا جاتا ہے ان بیلوں میں طرح طرح کے خودرو نباتات اور درخت ہیں۔ تربیلا سے قریباً تیس میل نیچے دائیں جانب سے دریائے کابل اپنے معاونوں دریائے چترال سوات، کلپانی وغیرہ کا پانی لا کر اس میں شامل کر دیتا ہے۔

یہاں ایک عجیب منظر دیکھنے میں آتا ہے دریائے سندھ کا پانی نیلا اور دریائے کابل کا پانی خاکستری رنگ کا ہے دونوں دریاؤں کا پانی ساتھ ساتھ بہتا ہے اٹک خورد سے نیچے کچھ فاصلے تک یہ دریا ایک تنگنائے میں بہتا ہے اور پھر تقریباً دس کلو میٹر جنوب میں اس میں بائیں جانب سے دریائے ہڑو شامل ہو جاتا ہے یہاں ایک مقام نیلاب باغ ہے جہاں ایک بزرگ کا مزار اور بڑا قبرستان ہے۔

گڑیالہ سے قریباً بارہ میل مغرب کی طرف بہتے ہوئے یہ دریا جنوب کا رخ اختیار کرتا ہے اور کالا چٹا پہاڑ کو کاٹ کر جنوب کی طرف بہنا شروع کرتا ہے خوشحال گڑھ کے قریب اس میں دائیں جانب سے کوہاٹ توئی اور پھر ٹبری توئی ندیاں آ کر شامل ہو جاتی ہیں پیر پہائی کے قریب

بائیں جانب سے دریائے سواں، دریائے سندھ میں شامل ہو جاتا ہے۔

سندھ اور سواں کے سنگم کے جنوب میں کالا باغ ڈیم کا منصوبہ ہماری ملکی سیاست کا شکار ہو رہا ہے کالا باغ کے قریب ہی جناح بیراج واقع ہے اس کے بعد دریائے سندھ پنجاب کے میدانی علاقے میں داخل ہو جاتا ہے اٹک خورد سے جناح بیراج تک دریائے سندھ ایک سو میل سے زیادہ فاصلہ طے کرتا ہے میدانی علاقے میں دریا کا پاٹ چوڑا ہو جاتا ہے اور اس میں پیچ وخم زیادہ نمایاں ہو جاتے ہیں۔

یہاں ایک بات واضح کرنا ضروری ہے کہ کالا باغ سے سندھ کے دھانہ تک کی لمبائی عام کتابوں میں نو سو میل کے لگ بھگ لکھی ہے اگر دریا کے پیچ وخم کی صحیح طور پر پیمائش کی جائے تو اس کی لمبائی بہت زیادہ بنتی ہے اس پیمائش کا جدید ترین ریکارڈ امریکہ میں مقیم ایک پاکستانی ڈاکٹر سید امجد حسین اور ان کے ساتھیوں کی کاوشوں کا مرہون منت ہے انہوں نے اٹک سے کراچی تک کشتی میں دریا کے پیچ وخم سمیت لمبائی کی پیمائش کی۔ یہ پیمائش تقریباً چودہ سو میل بنتی ہے اس طرح دریائے سندھ کی کل لمبائی دو ہزار چار سو میل بن جاتی ہے جو سابقہ ریکارڈ سے بہت زیادہ ہے عام طور پر دریائے سندھ کی لمبائی صرف ایک ہزار آٹھ سو میل تصور کی جاتی ہے جو نئی تحقیق کی روشنی میں درست نہیں۔

کالا باغ سے نیچے قریباً تیس میل کے فاصلے پر دریائے سندھ میں دریائے گومل کا پانی مل جاتا ہے یہ دونوں دریا دائیں جانب سے شامل ہوتے ہیں صوبہ بلوچستان کے دو دریا ناڑی اور بولان بھی ماضی میں دریائے سندھ میں دائیں جانب سے شامل ہوتے تھے مگر اب ان کا پانی کچھی کے علاقے میں زراعت میں استعمال ہو جاتا ہے اس طرح دریائے مولا اور کلاچی اب صرف برسات کے زمانے میں اپنا پانی دریا سندھ میں شامل کرتے ہیں۔

پنجاب کے جنوبی سرے پر بائیں جانب سے مٹھن کوٹ کے قریب اس میں پانچ دریاؤں ستلج، بیاس، راوی، چناب، اور جہلم کا پانی پنجند کی شکل میں شامل ہو جاتا ہے۔ اور دریا کا بہاؤ خاصا ست ہو جاتا ہے ٹھٹھہ کے قریب دریائے سندھ کئی شاخوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور کراچی کے قریب چھوٹی بڑی ندیوں کا جال بناتا ہوا بحیرہ عرب میں جا گرتا ہے۔

دریائے سندھ کے منبع کے بارے میں ابھی تک کوئی حتمی رائے قائم نہیں ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دریا کا آغاز تبت کے دور دراز اور دشوار گذار علاقے میں ہوتا ہے پرانی کتابوں میں

اس کا آغاز جھیل مانسرور سے خیال کیا جاتا تھا جسے مورو کرافٹ نے 1811ء میں غلط ثابت کر دیا اس کے بعد 1907ء میں سویڈن کے سیاح سون ہیڈن نے جھیل مانسرور کے شمال میں تقریباً 330 میل دور ایک مقام سنگھے خاباب کو ہی منبع تسلیم کیا ہے ان کی تحقیق کے مطابق دریائے سندھ کی کل لمبائی 2400 میل 3860 کلومیٹر ہے اس میں 400 میل تبت اور لداخ میں اور باقی 2000 میل پاکستان میں ہے۔

چین سے جو نقشے چھپ کر آ رہے ہیں ان میں دریائے سندھ کا منبع ایک جھیل نگالگلا رنگ کو ظاہر کیا گیا ہے یہ جھیل سینگے خاباب سے قریباً ایک سو میل شمال مشرق میں واقع ہے کہیں اس جھیل سے صرف گرمیوں میں پانی مہیا ہونا شروع ہوتا ہے اور مشہور مقولے کے مطابق قطرہ قطرہ مے شو دریا کی صورت اختیار کر لیتا ہے سینگے خاباب سے اس کا براہ راست رابطہ نہیں ہے البتہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کا پانی زیر زمین چشموں کی صورت میں سینگے خاباب سے مل جاتا ہے اس طرح دریائے سندھ کی لمبائی 2500 میل بن جاتی ہے جو 4000 کلومیٹر کے قریب ہے اس کا مطلب ہے کہ دریائے سندھ کی سابقہ لمبائی 1800 میل میں سات سو میل کا اضافہ ہو گیا ہے جو حیران کن ہے۔

دریائے سندھ، پاکستان کا دریائے نیل کہلاتا ہے یہ پاکستان کا سب سے بڑا دریا ہے اس کی لمبائی 1800 میل ہے یہ کشمیر کی پہاڑیوں سے نکلتا ہے اور سمندر تک جاتے جاتے اس میں کئی دریا اور مل جاتے ہیں یہ کراچی سے ذرا نیچے بحیرہ عرب میں جا گرتا ہے اسے تاریخ کے ہر دور میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے یہ دریا پہاڑوں کو توڑتا پھوڑتا میدانوں میں بل کھاتا ہوا اور ڈیلٹا تعمیر کرتا ہوا بحیرۂ عرب میں جا گرتا ہے دریا کی تخریبی انتقامی اور تعمیری کارگزاری کی وجہ سے اس کی گذرگاہ تین منزلوں میں تقسیم ہوتی ہے۔

کوہستانی منزل: یہ منزل عرض بلد 15-31 شمالی اور طول بلد 40-81 مشرق اس عرض بلد اور طول بلد پر دریائے سندھ کا منبع ہے سے شروع ہوتا ہے اور کالا باغ پر ختم یہ کوہستانی منزل کہلاتی ہے اس منزل میں دریا بہت تیز بہتا ہے اور نیچے کی طرف کاٹتا ہے تنگ اور گہری وادی بناتا ہے جوں جوں یہ پاکستان میں داخل ہوتا جاتا ہے اس میں پانی کی مقدار بڑھتی جاتی ہے اور اس کی وادی کشادہ ہوتی جاتی ہے اس کے معاون دریا کابل، شیوک، گلگت، ہنزہ، اور شگر ہیں جو اس کے پانی کی مقدار کو بڑھا دیتے ہیں کوہستانی منزل میں دریائے سندھ کافی تراش خراش کرتا ہے اور

اپنے ساتھ بڑے بڑے پتھر بہالے جاتا ہے کشادہ وادی بناتا ہے سکردو اور کالاباغ کے مقامات پر وہ بہت تنگ گھاٹیوں سے گذرتا ہے اس کے علاوہ جگہ جگہ چھوٹی آبشاریں بھی بناتا ہے۔

میدانی منزل: یہ منزل کالاباغ سے شروع ہوتی ہے اور حیدرآباد پر ختم اس منزل کی کل لمبائی تقریباً سات سو میل ہے اس منزل میں دریائے سندھ میں پانی کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے کیونکہ اس میں ستلج، بیاس، راوی، چناب، جہلم اور دیگر بہت سے چھوٹے چھوٹے دریا اور ندی نالے آکر ملتے ہیں پانی کی زیادہ مقدار اور گذرگاہ کی ہموار سطح کی وجہ سے اس کی رفتار بہت سست ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں دریا عمودی کٹاؤ کے بجائے پہلو یعنی اطرافی کٹاؤ کرتا ہے اور اپنی وادی کو گہرا کرنے کی بجائے چوڑا کرتا ہے۔ جس جگہ اس کی رفتار بہت سست ہو جاتی ہے وہاں یہ باریک ریت اور مٹی کو تہہ نشین کرتا ہے اور اس تہہ نشین کی وجہ سے ایک بہت بڑا میدان بن گیا ہے جسے سندھ کا میدان کہتے ہیں یہ میدان اپنی زرخیزی کے لحاظ سے دنیا بھر میں مشہور ہے اس میدان کو سیراب کرنے کے لیے کالاباغ گدو اور سکھر وغیرہ کے مقامات پر بڑے بڑے بیراج بنائے گئے ہیں جن سے نہریں نکالی گئی ہیں۔

ڈیلٹائی منزل: یہ منزل حیدرآباد سے شروع ہوتی ہے اور ساحل سمندر پر ختم جس طرح دریائے نیل کا ڈیلٹا قاہرہ سے شروع ہوتا ہے اس طرح دریائے سندھ کا موجودہ ڈیلٹا حیدرآباد سے شروع ہوتا ہے حیدرآباد سے گذرنے کے بعد اس دریا کی رفتار بہت ہی کم ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی قوت بار برداری بھی بہت گھٹ جاتی ہے پس وہ اپنے بہت سے مواد کو اپنی گذرگاہ میں تہہ نشین کرتے ہوئے کئی شاخوں میں منقسم ہو کر سمندر میں جاگرتا ہے اور ایک وسیع ڈیلٹا تعمیر کرتا ہے اس میں جگہ جگہ ریگ بار پانی کی جھیلیں اور قدرتی بند ہیں جب سیلاب آتا ہے تو دریا ان قدرتی بندوں کو توڑ کر سارے ڈیلیٹے کو زیرآب کر دیتا ہے چونکہ بحیرۂ عرب میں بحری رووں موجوں اور مدوجزر کی لہروں کی وجہ سے ہر وقت طوفانی صورت برپا رہتی ہے اس لیے دریائے سندھ کا ڈیلٹا اتنا وسیع نہیں ہے جتنا کہ دریائے نیل کا تو یہ ہے دریائے سندھ کی تعریف جو اختتام پذیر ہوئی۔

NCS جریدہ، اُردو ڈائجسٹ

○

انڈس ڈیلٹا

دریا، تغیر اور ثبات کی ایک حقیقت ہے اور یہ دونوں سچائیاں بہتے پانی میں تحلیل ہو کر لمبا سفر طے کرتی ہوئی بالآخر سمندر کی آغوش میں سو جاتی ہیں لیکن دریا کے بہتے پانی کے ہر قطرے کے ساتھ ریت اور مٹی کے ننھے ننھے ذرات بھی رفیق سفر ہوتے ہیں جو کنارے پر ہی ٹھہر کر اپنے بعد آنے والے ساتھی پانی کا انتظار کرنے لگتے ہیں ان کے اکٹھے ہونے سے وجود پانے والی چیز کو ہی ہم ''ڈیلٹا'' کہتے ہیں۔

یہ ننھے ننھے ریت و مٹی کے ذرے جنہوں نے اپنے وجود سے دریائے سندھ کے کھو جانے والے پانیوں کی یاد میں انڈس ڈیلٹا قائم کیا تھا اور ہزاروں برس سے سمندر سے اپنے ساتھیوں کی واپسی کا مطالبہ کرتے کرتے اتنے تھک چکے ہیں کہ خود سمندر کی گود میں میٹھی نیند سو رہے ہیں اور دریائے سندھ کی عظیم الشان یادگار انڈس ڈیلٹا پر انسانی زندگی رفتہ رفتہ سمندر کی ہیبت سے مرعوب ہو کر کوچ کر رہی ہے سمندر آگے اور آگے بڑھتا چلا آ رہا ہے زندگی پیچھے اور پیچھے ہٹتی جا رہی ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ ہاتھ کی ہتھیلی اور انگلیوں کی شکل والے ڈیلٹا میں سے سترہ کھاڑیاں نکلتی تھیں یہ کھاڑیاں کراچی سے لے کر زیریں سندھ کی ساحلی پٹی تک پھیلی ہوئی تھیں اور ڈیلٹا کی حدود پاکستان میں کراچی سے لے کر بھارتی سرحد ان آف کچھ تک پھیلی ہوئی تھیں۔

انڈس ڈیلٹا کے علاقوں میں متعدد میٹھے پانی کی جھیلیں بھی موجود تھیں۔ دریائے سندھ کے مون سون سیزن کے دوران یہ جھیلیں پانی سے بھر جاتی تھیں جہاں نہ صرف مقامی پرندے بلکہ موسم سرما کے دوران، ہجرت کر کے آنے والے پرندوں سارس کونج، پلیکن مرغابی اور کئی اقسام کے آبی پرندے یہاں ٹھہرتے تھے مقامی لوگ بتاتے ہیں کہ ڈیلٹا کے علاقے میں میٹھے پانی کی گیارہ جھیلیں تھیں ان جھیلیوں میں کاجری، جھم، کاٹھوڑ، تل، وس، کلمکان چھانی، تلی، سیر، چوبتی ماور اور کڑمک جھیلیں بھی شامل ہیں لیکن سمندر کے آگے بڑھ آنے سے یہ تمام جھیلیں آج کھارے پانی کے

بڑے بڑے تالابوں کی شکل اختیار کرگئی ہیں۔

انڈس ڈیلٹا کے خطے میں پیداوار کی شرح سندھ بھر میں سب سے زیادہ تھی اور یہ اضافی پیداوار سندھ کی بندرگاہوں سے مسقط، دوارکا، عدن گومتی اور خلیج فارس کی بندرگاہوں کو برآمد کی جاتی تھی۔ دریائے سندھ کے ڈیلٹا پر لیے جانے والے مطالعے اور تجزیئے ایک ایسے سنگین قومی معاملے کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی اور تلخیص کرتے ہیں جو آگے چل کر اور بھی سنگین ہوسکتا ہے حالات کے پیش نظر ڈیلٹا کے علاقے کی پہلے ہی سے تشویش ناک صورتحال اور یہاں سے قدرتی ماحول اور دیہی معیشت کی بہتری کے لیے بہت ہی اہم اور ہنگامی اقدامات انتہائی لازمی حیثیت اختیار کرتے جارہے ہیں مطالعاتی جائزوں اور ان سے حاصل ہونے والے اعداد وشمار کی روشنی میں حالات کی بہتری کے لیے بعض اہم سفارشات بھی تجویز کی گئی ہیں۔

انڈس ڈیلٹا میں ایسے ایسے مقامات اور موضوعات بکھرے پڑے ہیں جن پر اگر باقاعدہ تحقیق کی جائے تو تاریخ کے کئی نظریات باطل اور کئی نئی نئی باتیں سامنے آجائیں گی انڈس ڈیلٹا کو جہاں سمندر کے آگے بڑھنے سے مسلسل خطرہ ہے وہیں یہ آثار قدیمہ بھی اپنی ان کہی کہانیوں کے ساتھ پانی کی تہہ میں ڈوب کر ہمیشہ کے لیے صفحۂ ہستی سے مٹتے چلے جارہے ہیں کیا ہم ان کی اہمیت کے پیش نظر انہیں بچانے کے لیے سنجیدہ کوششوں پر غور کرسکتے ہیں۔ پاکستان ٹیلی ویژن کے سابق پروڈیوسر معروف ادیب ومحقق اور سینکڑوں دستاویزی فلموں کے خالق عبید اللہ بیگ نے برسوں پہلے انڈس ڈیلٹا پر چار مختلف دستاویزی فلمیں بھی تیار کی تھیں جو پی ٹی وی سے نشر ہوچکی ہیں۔

آج انڈس ڈیلٹا کی حالت ہماری سنجیدہ توجہ کی متقاضی ہے انڈس ڈیلٹا بقاء کے خطرے سے دوچار ہے اس کی سترہ کھاڑیاں کھارے پانی سے بھر چکی ہیں اور خود اس کا مجموعی رقبہ بھی اب کم ہوکر صرف دس فی صد ہی رہ گیا ہے اگر چہ نہ صرف پاکستان بلکہ پوری دنیا اس وقت قلت آب کے مسئلے سے دوچار ہے لیکن انڈس ڈیلٹا کے مسائل کے ساتھ ساتھ اس کے بقاء ہمارے شاندار ماضی کی روایتوں کی امین اور ہماری پہچان ہے ہمیں بحیثیت قوم اپنے اس طرز عمل پر غور کرنا چاہیے ڈیلٹا ہمارا مشترکہ قومی ورثہ ہے اسے بچانے کے لیے قربانیاں اور وسائل بھی ہمیں مشترکہ طور پر فراہم کرنے پڑیں گے۔

NCS جریدہ

○

تیمر کے جنگلات

اگر صرف تیمر اور اس سے متعلق ماحولیاتی نظام کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پاکستان کے ساحلی علاقوں جہاں جہاں یہ قدرتی جنگلات موجود ہیں تقریباً بارہ لاکھ افراد آباد ہیں ان میں سے نوے ہزار افراد صرف دریائے سندھ کے ڈیلٹا کے علاقے میں بستے ہیں اس دیہی آبادی میں سے ایک لاکھ پینتیس ہزار سے زیادہ افراد اپنی ضروریات زندگی تیمر اور ان سے متعلق ذرائع سے حاصل کرتے ہیں ڈیلٹا کے علاقے میں آباد لوگوں میں کم سے کم تین چوتھائی کا ذریعہ معاش ماہی گیری ہے اور پاکستان کی کل سمندری ماہی گیری کا زیادہ تر حصہ تیمر کی کھاڑیوں سے حاصل ہوتا ہے جو سندھ کے ساحلی علاقوں میں واقع ہیں۔

ان قدرتی جنگلات کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ بہت سی آبی حیات اپنی زندگی کا خاصا حصہ ان ہی علاقوں میں گزارتی ہیں ان میں مچھلیاں، کیکڑے اور خول دار جانور (جھینگا) وغیرہ شامل ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق دریائے سندھ کے ڈیلٹا کے علاقے میں موجود تیمر کے جنگلات سے جو مختلف قسم کی مچھلیاں حاصل کی جاتی ہیں ان کی مالیت تقریباً بیس ملین یا دو کروڑ ڈالر سالانہ ہے انہی علاقوں سے چھوٹا جھینگا بھی خاصی مقدار میں حاصل کیا جاتا ہے اور اس کی مالیت کا تخمینہ ستر ملین یا سات کروڑ ڈالر ہے جبکہ اس کی برآمدی قیمت اس سے بھی ڈیڑھ گنا بڑھ جاتی ہے اس کے علاوہ کیکڑے کی برآمد سے بھی کوئی تیس لاکھ ڈالر کی آمدنی ہوتی ہے اور یہ سب علاقائی اقتصادیات کے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

یہ جنگلات یہاں کی بیشتر دیہی آبادی کے لیے گھریلو ایندھن کا بھی کام دیتے ہیں اور اندازہ ہے کہ ان سے اٹھارہ ہزار ٹن ایندھن جلانے کی لکڑی حاصل ہوتا ہے جس کی مالیت کا اندازہ چار

لاکھ ساٹھ ہزار ڈالر سالانہ ہے تیمر کی لکڑی کے علاوہ اس کے پتے اور ٹہنیاں بھی گائے بھینسوں او بھیڑ بکریوں کے لیے چارے کے طور پر استعمال ہوتی ہیں اس طرح اگر تیمر سے علاقائی ماحول اور معاشیات کو ہونے والے فوائد کو دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ کوئی 67000 ٹن پتیاں اور بیس ہزار ٹن گھاس (جنگلی چاول جو گھاس کی شکل میں اگتے ہیں) وغیرہ ہر سال مویشیوں کے چارے کے طور پر حاصل ہوتا ہے اور اس کی مالیت کا اندازہ ساڑھے تیرہ لاکھ ڈالر ہے۔

ایک اور مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان ہی علاقوں میں تیمر کو پہنچنے والے نقصانات سے کوئی ایک لاکھ پینتیس ہزار 135000 نفوس کا روزگار متاثر ہوا ہے اور یوں ایندھن، چارہ اور ساحلی اور آبی حیات کے نقصانات کا سالانہ اندازا اٹھارہ لاکھ ڈالر کے قریب ہے ان علاقوں سے صرف مچھلی کی برآمدی مالیت ساڑھے بارہ کروڑ ایک سو پچیس ملین ڈالر ہے جو موجودہ حالات میں ایک بڑا نقصان تصور کیا جاتا ہے۔

سمندر کو آگے بڑھنے میں تیمر کے ساحلی جنگلات کا بھی بہت بڑا کردار ہے انڈس ڈیلٹا میں لاکھوں ایکڑ رقبے پر تیمر کے جنگلات واقع تھے تاہم میٹھے پانی کے اخراج میں کمی کا اثر ان پر بھی پڑا ہے اور اندازہ کیا جاتا ہے کہ ان جنگلات کی تعداد میں 40 فی صد سے زائد کمی ہوئی ہے 1978ء میں ڈیلٹا کا کل مجموعی رقبہ جو تیمر کے درختوں سے ڈھکا ہوا تھا وہ دو لاکھ 63 ہزار ہیکٹر تھا جو 90 کی دہائی کے اختتام تک سمٹ کر صرف ایک لاکھ 58 ہزار 300 مربع ہیکٹر ز تک رہ گیا اور اب یہ باقی ماندہ رقبہ بھی مسلسل تنزلی کا شکار ہے 1998ء میں سٹیلائٹ کی مدد سے کیے گئے ایک مشاہدے کے نتیجے میں یہ معلوم ہوا کہ ڈیلٹا کے علاقے میں تیمر کے جنگلات کم ہو کر 4 لاکھ ایکڑ رہ گئے ہیں۔ ان میں سے بھی صرف ایک لاکھ 25 ہزار ایکڑ پر واقع درخت بہتر حالت میں ہیں جبکہ مزید ایک لاکھ 25 ہزار ایکڑ پر مشتمل جنگلات زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں ماہرین کا یہ بھی کہنا ہے کہ 1999ء میں زیریں سندھ میں آنے والا خوفناک سمندری طوفان صرف تیمر کے جنگلات کی وجہ سے کراچی تک نہیں پہنچ پایا تھا۔

عالمی بینک کی ایک رپورٹ کے مطابق تیمر کے یہ جنگلات ڈیلٹا میں رہائش پذیر ایک لاکھ

20 ہزار نفوس کی ضروریات پوری کرنے کے لیے لکڑی اور ایندھن فراہم کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے تقریباً 16 ہزار اونٹوں کے لیے تیمر کے پتوں سے چارہ حاصل کیا جاتا ہے آبی حیات کی مختلف انواع کو تحفظ فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ تیمر کے یہ جنگلات 44 اقسام کی تجارتی سمندری غذا کے لیے نرسری کا کام بھی سرانجام دیتے ہیں۔ اس علاقے میں ٹائیگر، شرمپ، پلہ مچھلی، ڈانگری، اور بڑا منڈی سمیت مختلف انواع جو پہلے نہایت وافر مقدار میں پائی جاتی تھیں اب ان کی تعداد دن بدن کم ہو رہی ہے۔ یہ ہمارا اولین فرض ہے کہ تیزی سے معدوم ہوتے ہوئے ان قدرتی جنگلات اور انواع و اقسام کے حامل خزانوں کو مزید دست برد ہونے سے بچایا جا سکے تا آنکہ ہم یہ ورثہ اور اثاثہ بلاشبہ آئندہ آنے والی نسلوں کو منتقل کر سکیں۔

جریدہ NCS

○

صحرائے تھر، تھرپارکر

1993ء تک تھرپارکر، سندھ کا سب سے بڑا ضلع تھا لیکن اسی سال علاقے کو چار ضلعوں میر پور خاص، سانگھڑ، عمرکوٹ، اور تھرپارکر میں تقسیم کر دیا گیا۔ نئی تقسیم سے قبل علاقہ دو حصوں میں منقسم تھا ایک حصہ بیراج کہلاتا جو سکھر بیراج سے نکلنے والی نہروں سے سیراب ہوتا ہے اور دوسرا صحرائی حصہ، جو بارش پر انحصار کرتا ہے صحرائی علاقے کے دو ذیلی حصے تھے شمال مغربی حصہ تھر اور جنوب مشرقی حصہ پارکر کہلاتا ہے تھر میں چھوٹی پہاڑیوں جیسے مٹی کے بھٹ (ٹیلے) ہیں جبکہ پارکر میں ہموار میدان ہیں سارا علاقہ صحرائی ہے کہیں کہیں جھلیں ہیں جن میں صرف بارش کے ذریعے پانی جمع ہوتا ہے یہ علاقہ اکثر قحط کا شکار رہتا ہے نامساعد حالات اور پانی کی عدم موجودگی سے تھر میں رہنا جان جوکھوں کا کام ہے یہاں آباد زیادہ تر لوگ خانہ بدوش ہیں جہاں پانی اور سبزہ دیکھتے ہیں ٹھہر جاتے ہیں آباد گاؤں بہت کم ہیں جن میں گھر کچی یا پکی اینٹوں سے بنے ہیں کھاتے پیتے لوگ پکے گھروں میں رہتے ہیں اور اطاق رکھتے ہیں جہاں مہمان ٹھہرتے ہیں۔

تھر میں دور جدید کے منفی اثرات نہیں پہنچے اور یہاں اب تک مقامی روایات اور ثقافتی تدریس پہلے کی طرح موجود ہیں نقل و حمل کا ذریعہ اونٹ، گھوڑے یا گدھے ہیں ریتلی سڑکوں پر کیکڑے پرانے ٹرک چلتے ہیں اس سواری پر انسان، حیوان، اور سامان سبھی ایک ساتھ لدے ہوتے ہیں۔

صحرائی ہونے کے باوجود تھر اپنی مخصوص بعض خصوصیات مخصوص قسم کے موسم اپنی فطری زندگی اور آبادی کے انداز رہائش کی بناء پر مطالعے کے لیے جاذب توجہ جگہ ہے۔

ماہرین کے مطابق لفظ تھر سنسکرت زبان کے لفظ رتھل، بنجر علاقہ نکلا ہے جس سے لفظ ہل صحرائی علاقہ نکلا یہ لفظ بگڑ کر تھر بن گیا تاہم بیشتر کا خیال ہے کہ یہ تھل سے نکلا ہے جس کا مطلب

ریگستانی علاقہ ہے، مقامی لوگ نیوں کو تھاری کہتے ہیں لہٰذا اپنے وطن کو تھاری کے نام سے پکارتے ہیں بلند ٹیلے 150 میٹر تک اونچائی رکھتے ہیں صحرا موسمی تبدیلیوں اور جغرافیائی خصوصیات کی بناء پر بنے ہیں مثلاً ہوا کا نظام، سمندری لہریں اور زمین کی ساخت، صحرائے تھر کی گرینائٹ جیسی متغیر چٹانیں تقریباً چار ارب سال پہلے اور رسوبی چٹانیں ڈھائی ارب سال پہلے وجود میں آئیں۔ علاقے میں پھیلی ریت تقریباً سولہ لاکھ سال پرانی ہے جو ہواؤں نے اڑا کر یہاں جمع کی۔

صحرائے تھر جنوبی ایشیا کے عظیم صحرا کا حصہ ہے پنجاب میں اس صحرا کا حصہ چولستان کہلاتا ہے جس کا بڑا حصہ مشرق میں بھارتی راجپوتانہ یا راجستھان کے علاقے ہیں مغرب میں سندھ کے بقیہ صوبے ہیں عظیم صحرا کا کل رقبہ پونے دو لاکھ مربع میل ہے صحرا کا بیشتر حصہ بھارت میں ہے۔

پاکستانی صحرائی علاقہ سات تعلقوں میں منقسم ہے جو 23 ٹپوں، 62 دیہوں اور دو ہزار سے زائد گوٹھوں (چھوٹے دیہات) پر مشتمل ہیں۔ شمال مشرق سے ریتلی پہاڑیاں شروع ہوتی ہیں جو لہروں کی طرح جنوب مغرب کی سمت جاتی ہیں اس وقت صحرا میں کوئی نہر یا دریا نہیں بہتا تاہم کئی علاقوں میں خشک دریاؤں کے تختے موجود ہیں جنہیں مقامی ندی کہتے ہیں۔

کسی زمانے میں صحرا سے دریا سندھ یا گم شدہ دریا ھاکڑا گزرتا تھا اور یہاں کی بنجر زمین سرسبز و شاداب تھی دریا ان کچھ کی دلدلی زمین سے ہوتے ہوئے سمندر میں جا گرتا تھا دریا کا ایک نام ''گاگھر'' بھی تھا اور خیال ہے کہ وہ ہماچل پردیش میں شوالک پہاڑی سلسلے سے نکلتا ہریانہ میں دریائے سرسوتی سے ملتا پھر تھر میں داخل ہو جاتا گاگھر ایک زمانے میں دریائے سندھ کی طرح رواں دریا تھا اور متفرق علاقوں میں اس کے مختلف نام تھے مثلاً ہاکڑا، کاکڑا، وہندہ ہین اور ونارا۔ تھر میں پھیلی سیلابی مٹی بھی دریاؤں کی موجودگی کا ناقابل تردید ثبوت ہے چند ماہرین کا خیال ہے کہ یہ دریا ستلج تھا جس نے صدیوں پہلے اپنا راستہ تبدیل کر لیا تھا۔

تھر میں بارش کا موسم سیلانی ہے یعنی اپنی مرضی سے آتا ہے اکثر علاقے پر قحط چھایا رہتا ہے بارش ہو تو کم ہی ہوتی ہے نوے فیصد بارش جولائی تا ستمبر میں ہوتی ہے اور مئی اور جون میں سب سے زیادہ گرمی اور جنوری میں سردی پڑتی ہے مئی اور جون میں ریتلے طوفان عام ہیں ان کی رفتار 150 کلومیٹر تک ہو سکتی ہے۔

مون سون کے موسم میں جنوبی علاقوں میں پانی کے تالاب جنم لیتے ہیں خشک موسم میں چھتا بارہ فٹ گہرائی میں گدلا پانی مل جاتا ہے پانی حاصل کرنے کے لیے موزوں علاقے میں کنوئیں کھودے جاتے ہیں تاہم صحرا کے مرکزی علاقوں میں کنوئیں کی گہرائی 92 میٹر تک ہوسکتی ہے۔

بدقسمتی سے تھر پر سائنسی تحقیق نہیں ہوئی لہٰذا یہاں کی ابتدائی تاریخ کے بارے میں علم کم ہے خیال ہے کہ قدیم زمانے میں تھر میں بھی انسانی آبادیاں تھیں جن کے آثار اب مٹ چکے ہیں۔

مقامی روایات کے مطابق تھر کے ابتدائی حکمران پارمر (راجپوتوں کی ایک شاخ) تھے تاریخ کے مطابق سومرہ خاندان نے سب سے طویل عرصے تک سندھ پر حکمرانی کی یہ قبیلہ پہلے تھر کا حاکم بنا۔

سندھ کے دو مشہور عشقیہ لوک روایات اور کہانیاں عمر ماروی اور مومل رانو نے بھی صحرائے تھر ہی پر جنم لیا۔ تھر کے علاقے میں سب سے پہلے راجپوت قبائل آباد ہوئے یہ لفظ راجہ پتر راجہ کا بیٹا سے نکلا ہے ان کے ساتھ ساتھ مارواڑ سے بھیل اور گجرات سے کولئی قبائل کے باشندے یہاں آ کر بسے۔ ان دونوں کے مرد راجپوت فوج میں بھرتی ہوتے تھے راجپوت کھشتری تھے اور یہ دونوں کھتری، رفتہ رفتہ اچھوت بھی آئے جو جوگی، لکڑہارے، موچی، مزدور، اور معمار وغیرہ تھے۔

اسلام کی آمد کے بعد چند راجپوت قبائل مثلاً سومرہ، سمہ نے بعد میں اسلام قبول کرلیا اس دوران بلوچ مسلمان قبائل مثلاً رند، چانڈیو، کھوسہ وغیرہ یہاں آ کر مقیم ہوئے ایک زمانے میں جین مت کے پیرکار بھی یہاں بڑی تعداد میں مقیم تھے لیکن 1971ء کی جنگ کے بعد زیادہ تر راجھستان چلے گئے مگر پارکر کے مرکزی بازار میں ان کی چند دکانوں پر آج تک تالا لگا ہوا ہے۔

صحرائے تھر کے نام سے لگتا ہے کہ علاقے میں چاروں طرف ریت ہے اور کوئی سبزہ نظر نہیں آتا لیکن تھر میں درخت پودے اور جھاڑیاں عام ملتی ہیں اکثر جنگل پودے بارشوں کے موسم میں اگ کر مر جاتے ہیں۔ تاہم کئی موسم کی سختی کا مقابلہ کرتے زندہ رہتے ہیں تھر کے زیادہ تر علاقے میں بارشوں کے بعد گھاس اگتی ہے جو جانوروں کا بہترین چارہ ہے اگر بارش نہ ہو تو تھاری تھر کا باشندہ اپنے مویشی سندھ کے سرسبز علاقوں کی طرف لے جاتا ہے راستے میں کئی جانور ہلاک ہونے سے اسے نقصان ہوتا ہے۔

تھر کی مخصوص مٹی اور موسم کی وجہ سے مخصوص قسم کے درخت اور پودے وغیرہ ہی جنم لیتے ہیں جھاڑیوں کے جھنڈ کے علاوہ صحرا میں کہیں جنگل نہیں لہٰذا حیوانات کم ہی ملتے ہیں۔گھروں میں پالتو جانور مثلاً اونٹ گائے، بکری، مرغیاں وغیرہ ملتی ہیں جو دودھ، لسی، دہی گھی اور کھالوں وغیرہ کے لیے پالے جاتے ہیں اونٹ گھوڑا، اور گدھا نقل وحمل میں بھی کام آتے ہیں تھر میں گائیں زیادہ ہیں کیونکہ بھینسوں کو زیادہ پانی اور چارے کی ضرورت ہوتی ہے۔

تھر میں متفرق قبائل آباد ہیں جن کی اپنی روایات رسوم ورواج ہیں تاہم یہ پسماندہ علاقہ ہے لہٰذا طرز زندگی، لباس حتی کہ غذا سادہ ہے صاحب حیثیت اور غربا کا لباس تقریباً ایک جیسا ہے مرد شلوار قمیض، کرتا اور دھوتی پہنتے ہیں خواتین کے کپڑے رنگ برنگے ہوتے ہیں ان کے زیورات دھاتی یا شیشے سے بنتے ہیں ہندو خواتین کے زیور عموماً مسلم خواتین سے مختلف ہوتے ہیں تاہم ہر عورت چوڑیاں پہننے کی شوقین ہوتی ہے جو متفرق جسامت میں ملتی ہیں بعض عورتیں چوڑیاں پورے بازو پر چڑھا لیتی ہیں۔

صحرا کا جہاز یعنی اونٹ ہر عام تھاری کا خاندانی رکن ہے کیونکہ یہ روزمرہ کے مختلف کاموں میں ان کا مددگار ہوتا ہے مثلاً وزن ڈھوتا ہے ہل چلاتا ہے کنوئیں سے پانی نکالتا ہے اور سب سے بڑھ کر انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا ہے تھاری اپنے اونٹ کو مختلف زیورات اور لباس کے ذریعے سجاتے ہیں۔

پانی کم ہونے کی وجہ سے تھاری مہینے میں ایک دفعہ نہاتے ہیں اس کے باوجود، عموماً امراض کا شکار نہیں ہوتے کیونکہ ان کی زندگی سخت جان ہے سب اپنا کام خود کرتے ہیں اور قدرتی غذا دودھ، مکھن، اور اناج کھاتے ہیں خوب پیدل چلتے ہیں خواتین بھی مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں۔تھر میں غربت ہے چوری یا ڈکیتی کی شرح کم ہے۔ بڑے جانور مثلاً اونٹ، گھوڑے، بیل، یا گائے کا مالک اس کے جسم پر مخصوص نشان لگاتا ہے جانوروں کو یہ داغ لگانے کا منظر بڑا دلچسپ لیکن دردناک ہوتا ہے تاہم درد کا مرحلہ ایک آدھ منٹ ہی کا ہوتا ہے البتہ جانور ساری عمر کے لیے چوری یا اغوا ہونے کے خطرے سے محفوظ ہو جاتا ہے اگر جانور گم بھی ہو جائے تو مخصوص داغ کے ذریعے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ کس کا ہے۔

ہندوؤں اور مسلم الگ محلوں میں رہتے ہیں تاہم ایک دوسرے کی تقریبات میں شرکت کرتے ہیں مہمان نواز ہیں گاؤں کا مکھیا مہمانوں کو اوطاق میں بٹھاتا ہے۔

تھر وادی موت کہلاتا ہے تاہم اس میں قدیم عمارات کے کھنڈر ملتے ہیں یعنی یہ علاقہ ایک زمانے میں شادو آباد تھا اور خشک دریا ھاکڑا اور دیگر ندیوں کے کنارے انسانی بستیاں تھیں۔

جدید دور کے ذرائع نقل وحمل اب تک تھر میں نہیں پہنچے لہٰذا صحرا کی حقیقی مہک اب تک باقی ہے لیکن دانش وروں کے نزدیک ترقی کی سست رفتار دراصل تھر کے لیے رحمت ہے کیونکہ اب تک صحرا کی تہذیب اور ثقافت برقرار ہے حال ہی میں اسلام کوٹ کے علاقے میں کوئلے کے ذخائر دریافت ہوئے ہیں شاید وہاں ترقی کی نئی راہیں کھلیں لیکن ضروری ہے کہ پہلے تھر کے مخصوص علاقوں کو محفوظ علاقہ قرار دیا جائے تاکہ صحرا کی ثقافت، تہذیب فطری، خوبصورتی، نباتات اور جمادات دور جدید کی دست برد سے محفوظ رہیں۔

اُردو ڈائجسٹ۔ سیاحت نمبر۔ مئی 2002ء
تحریر: احسان ندیم، سید عاصم محمود

○

صوبہ سرحد

پشاور

صوبہ سرحد کا مرکزی دارالخلافہ ہے پاکستان کا یہ آخری بڑا تاریخی شہر ہے جس کی سرحدیں افغانستان سے ملتی ہیں یہ شہر وسطی ایشیاء افغانستان اور پاکستان کے درمیان ہمیشہ رابطے کا شہر رہا ہے یہاں کا درہ خیبر وہ تاریخی مقام ہے یہ شہر قدیم تاریخی تہذیب گندھارا کا مرکز ہے پشکالاوتی، پشاور کا پرانا نام ہے۔ کشن بادشاہ کنشکا نے اپنا دارالسلطنت پشاور بنایا۔ سب سے قدیم دستاویز میں اٹک کے قریب اراء کے مقام پر فروشتی چٹان پر لکھی گئی وہ تحریر ہے جس کا زمانہ 19 قبل از مسیح بتایا جاتا ہے یہاں پر اس کا نام پوشاپورہ ہے جس کے معنی ''پھولوں کا شہر'' کے ہیں مغل حکمران اکبر اعظم نے اس کا نام بدل کر پشاور رکھا جس کے معنی سرحدی قصبہ کے ہیں۔ اس شہر کے اندر بدھ دور کے کئی آثار موجود ہیں۔ جس میں ''شاہ جی کی ڈھیری'' بڑی اہم ہے جو بدھ راہبوں کا مسکن اور عبادت خانہ تھا۔ کنشکا کے زوال کے بعد پشاور پر ساسانیوں کا تسلط ہو گیا لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد کیدار کشن حکمران نے یہ علاقہ دوبارہ قبضے میں لے لیا۔ پانچویں صدی عیسوی میں سفید ہن قابض ہوئے جن کو ترکوں نے مار بھگایا۔ چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی میں ترک اور ہندو حکمرانیاں رہیں۔ گیارہویں صدی عیسویں میں محمود غزنوی نے حملہ کر کے یہ تمام علاقے فتح کر لیے۔ مغل دور حکومت میں بھی اس شہر کو مرکزی حیثیت حاصل رہی مغلوں کے بعد کچھ عرصہ تک افغانستان کے درانی حکمرانوں کا یہاں پر تسلط رہا۔ جن کو رنجیت سنگھ نے شکست دے کر یہ علاقہ اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس شہر کو روشنیوں کا شہر بھی کہا جاتا ہے اب موٹروے کے ذریعے اس شہر کو اسلام آباد اور لاہور سے ملایا جا رہا ہے اور اس طرح سے یہ شہر وسطی ایشیاء اور افغانستان کے علاقوں سے تجارت اور سیاحت کا ایک بڑا اہم راستہ بنے گا۔

طورخم

صوبہ سرحد کا پاک افغان سرحد پر موجود آخری شہر ہے یہ پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے

اور یہاں پر سرحد کے تاریخی تہذیبی آثار کی تلاش میں آنے والے سیاحوں وسطی ایشیا اور افغانستان سے ہونے والی تجارتی اشیاء کی آمدروفت میں دلچسپی رکھنے والے لوگوں کا بڑا ہجوم رہتا ہے۔

پشاور چھاؤنی

برطانوی حکومت نے جب سکھوں کو شکست دے کر صوبہ سرحد پر قبضہ کیا اور افغانستان تک اپنی پالیسی پھیلائی تو ان کا پہلا کام صوبہ سرحد اور آزاد قبائل کے اندر چھاؤنیاں اور قلعے بنانا تھا ان میں پشاور چھاؤنی کو بھی منصوبہ بندی کے تحت بنایا گیا پشاور میں انگریزی دور 1849ء سے لے کر 1947ء تک رہا۔

پشاور صدر

ایک کشادہ اور صاف ستھرا شہر (چھاؤنی) ہے جس میں پھلدار اور پھولدار لمبے لمبے درختوں کی قطاریں ہیں۔ چوڑی تارکول کی سڑکیں ہیں۔ پشاور چھاونی کی مال روڈ، فورٹ روڈ اور سرکلر روڈ وغیرہ بہت خوبصورت سڑکیں ہیں جن میں وسیع وعریض باغات کے ایک منزلہ بنگلے ہیں کئی چھوٹے بڑے چرچ ہیں اور بہت سی فوجی بیرکیں بھی ہیں۔

صدر کے وسط میں خالد بن ولید (کمپنی باغ) ہے یہ مغلوں کا قدیمی باغ ہے اس کے تناور درخت اور گلاب کے بڑے بڑے دلکش پھول بھلائے نہیں بھولتے۔ شمال مشرق میں شاہی باغ اور شمال جنوب میں وزیر باغ دو اور بڑے قدیمی باغ ہیں۔ پشاور کو ان ہی کی بدولت باغوں کا شہر بھی کہا جاتا تھا۔

چھاؤنی کے وسط میں ایک عالیشان گورنمنٹ ہاؤس ہے جو اپنی پرشکوہ عمارت اور بیحد وسیع سبزہ زاروں کے لیے مشہور ہے جدید ہوٹلوں اولڈ مشنری ایڈورڈ کالج، نوادرات سے بھرپور عجائب گھر، بھرپور بازار اور عین وسط میں سیاحوں کے لیے معلوماتی مرکز ہے۔

قیام پاکستان کے بعد پرانا قدیم پشاور وسیع ہو کر چھاؤنی سے آملا اور چھاؤنی کئی میل آگے مکمل ہو کر یونیورسٹی سے مل گئی ہے اب پشاور یک جا ہو کر ایک بہت بڑا شہر بن چکا ہے جنوبی جانب درہ خیبر کی طرف جانے والی سڑک پر جہاں ماضی میں قبائلی حملوں کا بھی زور رہا تھا اب پرسکون اور پرامن شہر ہے یہاں اب درسگاہوں اور تحقیقی مراکز کی ایک قطار ہے جن میں دیہی ترقی کی اکادمی،

ٹیچرز ٹریننگ کالج، کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ اور دیگر دوسری سرکاری عمارتوں کا ایک جال بچھا ہے۔

پشاور شہر اپنی شکستہ سی قدیم چار دیواری سے باہر پھیل کر بہت بڑا شہر بن گیا ہے اور میلوں تک پھیلا ہوا ہے۔ خوش ذائقہ میوہ جات کی بھینی بھینی خوشبوں بھنے ہوئے گوشت اور کبابوں کی سوندھی سوندھی مہک، تمباکو اور نسواروں کی بہتات، فن کاروں کے ہتھوڑوں، کی مدبھری آواز، گھوڑوں سے کھینچی جانے والی سست رو سواریاں، بلند و بالا مکانات کی سایہ دار تنگ گلیاں مکانوں کے ابھرتے ہوئے چھجے فوراً گھل مل جانے والے ہجوم، قبائلی تاجر اور سیاح یہ سب مل کر پرانے شہر پشاور کا نظارہ پیش کرتے ہیں۔

مشہور قصہ خوانی بازار

قصہ خوانی بازار بہت سی اہم تاریخی روایات کا حامل ہے۔ پشاور کے قدیم بازاروں میں سب سے زیادہ مشہور کابلی گیٹ تھا۔ اور خیبر کے راستے کابل جانے والوں کو اسی دروازے سے گذرنا پڑتا تھا چونکہ یہاں سراؤں اور قہوہ خانوں میں افسانوی طرز پر قصہ خوانی کا رواج تھا لوگ یہاں پیشہ ور قسم کے لوگوں سے کہانیاں سن کر محظوظ ہوا کرتے تھے ان دنوں قہوہ خانے کافی دیدہ زیب نظر آتے تھے ان میں پیتل کے بڑے بڑے سماوار ہوا کرتے تھے اور چائے دانیاں و پیالیاں بڑے سلیقہ سے لٹکی ہوئی نظر آتی تھیں اب تو ایسے قہوہ خانے باقیات ہی کہے جاسکتے ہیں اور خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ پشاور کے باغوں کے رنگ برنگے پھل اب بھی اس بازار کی دوکانوں کی رونق ہیں لیکن پرانے طرز کے قہوہ خانوں میں کوئلے کی آگ پر مخصوص قسم کی چینکوں پر پکی ہوئی چائے کے مزے کا کہیں اور جواب نہیں ہے موجودہ دور میں پشاور نے بھی خاصی ترقی کی ہے یہاں کے نان اور گیس کے چولہوں پر سینکے ہوئے دنبوں کے گوشت کی سوندھی خوشبو سیاحوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرتی ہے یہاں پشاوری چپل، پٹیاں، پستول کے چرمی بیگ اسپیشل قسم کے ہلکے و مضبوط سوٹ کیس چمڑے کی مصنوعات کے طور پر کافی مقبول و مشہور ہیں گوشت کی اقسام میں یہاں چپل کباب بہت پسند کیے جاتے ہیں۔

○

پاکستان کے شمالی علاقہ جات

پاکستان کے شمالی علاقہ جات 27000 مربع میل تقریباً 6800 مربع میٹر میں گھنے جنگلوں سے بھرے پہاڑوں کے وسیع تر سلسلہ میں پھیلے ہوئے ہیں جس کی مثال شاید ہی دنیا کے کسی ملک میں موجود ہو۔ اسی طرح انہی شمالی علاقوں کو خوبصورت بنانے میں پرکشش گلیشیئر بھی موجود ہیں جو پورے خطے میں اپنی خاص حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ عظیم الشان کوہ ہمالیہ کا سلسلہ ہندوستان سے شروع ہوکر پاکستان میں شمالی علاقوں تک پہنچتا ہے اور ان علاقوں کو اپنی شان و شوکت اور بلند چوٹیوں سے خوبصورت بنانے میں اضافہ کرتا ہے۔ کوہ ہمالیہ کا سلسلہ تبت، نیپال کو بھی چھوتا ہوا قراقرم کے ساتھ ساتھ شمالی مغربی سمت میں دریائے سندھ کے ساتھ پیش قدمی کیے ہوئے ہے۔ دریائے سندھ کے آس پاس طویل ترین راستے میں بہت ساری خوبصورت وادیاں ہیں۔ دریائے سندھ کو اپنے ساتھ کئی ایک معاون دریاؤں کو بھی راستے میں ملاتا ہوا شان وشوکت سے بہتا چلا جاتا ہے۔ ان علاقوں میں اونچے پہاڑوں کی چوٹیاں، گہرائی والے تنگ راستے، چمکتے ہوئے پانی کی جھیلیں، ٹھنڈے پانی کی ندیاں، تیز بہاؤ والے دریا، بلند ترین درختوں سے بھرے جنگلات، گلیشیئرز اور سرسبز چراگاہیں اپنی بے پناہ خوبصورتی اور جاذبیت لیے سیاحوں کو اپنی جانب کھینچتی ہیں۔ اس زمین پر قدرتی نظاروں سے بھرے ہوئے خوبصورت اور شاندار پہاڑ اگر دیکھنے میں آئے ہیں تو وہ پاکستان کے شمالی علاقوں میں ہیں۔ 8000 میٹر سے زائد پہاڑی چوٹی ہو یا درجنوں ایسی چوٹیاں جو 7000 میٹر بلند، دنیا میں دوسرے نمبر پر اونچی چوٹی ہے۔ نانگا پربت جس کی چوٹی دنیا میں نویں نمبر پر ہے۔ اس کی بلندی 8126 میٹر ہے۔ بہت ساری توہم پرست کہانیاں اور قصے اس پہاڑی کے بارے میں مشہور ہیں جو کہ من گھڑت ہیں لیکن عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ یہ پہاڑ موت کا سبب ہے۔

سوات اُونچے پہاڑوں کی زمین

سوات کی سرزمین نہایت دلکش اور تاریخی اعتبار سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ سوات میں سرسبز وادیاں بلندترین پہاڑوں کی چوٹیاں، تیز بہاؤ والی ندیاں آبشاریں، برفانی پانی کی جھیلیں، پھلوں کے باغات یہ سب قدرت کی وہ خاص نعمتیں ہیں جو اس قدیم زمین کو عطا ہوئی ہیں۔ شمال کی طرف پہاڑی سلسلہ بلند ہوتا جاتا ہے اور دریائی راستے تنگ ہو جاتے ہیں۔ فلک سیر جو کہ 5918 میٹر بلند اپنی خوبصورتی اور پرکشش نظاروں کی وجہ سے سیاحوں کو اپنی طرف راغب کرتا ہے۔ سوات کے علاقے میں چند ایک بہترین ٹریکنگ راستے میں اسی طرح چند جگہیں مچھلی پکڑنے کے لیے مشہور ہیں یہاں کی تہذیب 35 صدیاں پرانی ہیں اور آثار قدیمہ کی نشانیاں تاریخی غاروں سے لےکر آریا و بدھ مت کے دور کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ یہاں پر بدھ مت اور ہندومت کی پرانی عبادت گاہیں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔

سوات کی اکثر وادیاں حملہ آورں کی نظر ہوتی رہیں اور یہاں تلوار، ڈھال اور گھوڑے اپنا جنگی کردار ادا کرتے رہے۔ سوات ہی کی زمین پر دنیا کا مشہور سپہ سالار سکندر اعظم اور اس کے علاوہ محمود غزنوی، مغل شہنشاہ بابر، اکبر اعظم اپنی اپنی فتح کی جنگ لڑتے رہے۔ سوات کی زمین کو ہر طبقہ فکر کے لوگوں نے خوب پسند کیا آج یہی زمین پاکستان کے دوسرے حصوں سے ہوائی اور زمینی راستوں سے منسلک ہے۔ سوات کے عجائب گھر جو (سیدو شریف میں ہے) گندھارا دور کی قدیم اشیاء موجود ہیں۔

سوات کی خوبصورتی میں مزید اضافہ اس کی وادیوں نے خوب کیا ہے۔ ان وادیوں میں کالام جو 7000 فٹ بلند ہے دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ مہوڈنڈ، اتروڑ اور گبرال سوات کے چند خوبصورت وادیوں میں سے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سوات کی مزید خوبصورتی کو جاننے کے لیے کئی ایک جگہیں ابھی مزید ڈھونڈنے کے انتظار میں ہیں۔

چترال: قبیلوں کی سرزمین

چترال کی خوبصورت وادی جو کہ افغانستان کی سرحدں کے ساتھ واقع ہے۔ اپنے شایان شان پہاڑوں کے وسیع سلسلہ کی وجہ سے ایک خاص توجہ کا مرکز ہے اور آنے والے سیاح حضرات

یہاں کی قدیم تہذیب و ثقافت اور بھرپور میزبانی سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ کافر کیلاش قبیلہ، یہاں کی پرسکون برف سے ڈھکی چوٹیوں والے پہاڑوں کے دامن میں پرکشش وادیوں میں رہ رہے ہیں۔ یہ پہاڑی سلسلہ کوہ ہندوکش سلسلہ ہے۔ جوکہ چترال کو افغانستان سے ملاتا ہوا آگے نکلتا ہے۔ اس طرح یہ رابطہ روسی ریاستوں تک جاملتا ہے۔ حقیقت میں مشہور واخان کے مقام سے چترال اور تاجکستان کا راستہ ملتا ہے۔ جو صرف 25 کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔

چترال کے لوگ نہایت امن پسند اور پرخلوص محبت کرنے والے ہیں یہاں کے لوگوں کو اپنے راویتی رسم ورواج، تہذیب وتمدن پر بہت فخر ہے یہ موسیقی اور ڈانس کے شوقین ہیں۔ مشہور زمانہ پولو کا کھیل اس علاقے سے شروع ہوا اور آج تک بڑے شوق سے کھیلا جاتا ہے۔ جولائی کے پہلے ہفتہ میں شندور کے مقام پر پولو کا مشہور میچ ہوتا ہے۔ یہ پولو گراؤنڈ سطح سمندر سے دنیا میں سب سے اونچی گراؤنڈ ہے۔ اس میچ میں گلگت اور چترال کی پولو کھیلنے والی ٹیمیں اپنی اپنی برتری دکھانے کے لیے گراؤنڈ میں اترتی ہیں۔ شائقین لطف اندوز ہوتے ہیں۔ چترال کے پہار ٹریکنگ کے شائقین کے لیے بہت مواقع فراہم کرتے ہیں۔ ترچ میر پہاڑ جو 7772 میٹر بلند ہے اور یہ بھی انہیں پہاڑوں میں سے ایک ہے جسے ابھی تک کسی نے سرنہیں کیا۔ چترال سے بہت سارے ٹریکنگ راستے کوہ ہندوکش کو گلگت کے قراقرم پہاڑی سلسلے سے ملاتے ہیں۔

گرم چشمے کی وادی جوکہ چترال سے 40 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور کیلاش وادی کے ساتھ واقع ہے۔ یہاں پر گندھک کے پانی کے چشمے ہیں اور لوگ یہاں نہانے کے لیے آتے ہیں تاکہ جسمانی بیماریوں، درد خارش اور چنبل وغیرہ سے چھٹکارا حاصل ہو سکے۔ اس جگہ پر ٹراؤٹ مچھلی کا شکار بھی لوگ ذوق وشوق سے کرتے ہیں۔ وادی کیلاش میں تقریباً 4100 کافرز (غیر مسلم) آباد ہیں اور تقریباً 20 مختلف گاؤں آباد ہیں۔ کافر کا مطلب ہے بے دین اور کیلاش کا مطلب (کالا) چترال کے لوگوں کو عام طور پر (کافر کیلاش) بیان کیا جاتا ہے اس کی وجہ یہ غیر مسلم ہیں اور ان قبائل کی عورتیں زیادہ تر کالے کپڑے پہننا پسند کرتی ہیں۔ عورتیں سرخ اور کالے رنگ کے موتیوں کے ہار اور سر پر اچھی قسم کی کالے رنگ کی ٹوپی بھی استعمال کرنے کو پسند کرتی ہیں۔ کیلاشی عورتیں پردے کی پابندی نہیں کرتیں۔

وادی کاغان

وادی کاغان جوتقریباً 160 کلومیٹر لمبے رقبے پر پھیلی ہوئی وادی ہے۔اپنی بے پناہ کشش اور قدرتی نظاروں کی وجہ سے اپنی مثال آپ ہے۔گھنے جنگلات ہونے سے پہاڑوں کی ہریالی ہر طرف نظر آتی ہے جو ہمالیہ سلسلہ کے ساتھ ساتھ پھیلے ہوئے ہیں۔بابوسر جو کہ وادی کاغان میں بلندی پر واقع ہے صرف یہی ایک راستہ تھا جس سے بقیہ شمالی علاقے پاکستان کے ساتھ منسلک تھے جس کا استعمال قراقرم ہائی وے بننے کے بعد بند ہوگیا۔وادی کاغان پاکستان کا سب سے زیادہ تفریحی مقام پسند کیا جاتا ہے اور زائرین چھٹیاں گزارنے کے لیے اس جگہ کا رخ کرتے ہیں۔ یہاں ٹریکنگ راستے بہت سے ہیں۔اس کے علاوہ سیر کرنے کے لیے راستے بنے ہوئے ہیں جہاں بآسانی چلا جاسکتا ہے۔

پھولوں سے لدی پہاڑیاں اور جھیلیں شائقین کے لیے خاص توجہ کا مرکز ہیں۔کاغان کی زیادہ توجہ کا مرکز (ناران) کا مقام ہے۔ناران کا شہر دریائے کنہار کے ساتھ آباد ہے اور سطح سمندر سے 2495 میٹر بلند ہے۔یہاں سے وادی کاغان کی چوڑائی زیادہ نظر آتی ہے۔یہاں پر دریا خاموش نظارہ دیتا ہے اور کافی چوڑا بھی ہے۔

ناران شہر سے 10 کلومیٹر کے فاصلے پر جھیل سیف الملوک 3500 میٹر بلندی پر واقع ہے۔ یہ بھی خوب نظارہ دیتی ہے ایک قصبہ جو ایک شہزادے کے بارے میں بہت زیادہ مشہور ہے جس کا نام سیف الملوک تھا اور جھیل کی پری کی محبت کا شکار ہوگیا تھا۔یہ جھیل اس شہزادے کے نام سے مشہور ہے۔

بلتستان

بلتستان کا علاقہ ایک وسیع وعریض پہاڑوں کے سلسلے میں پھیلا ہوا ہے جو کہ پاکستان کے شمالی علاقے میں ہے۔بلتستان کا خطہ قراقرم کے پہاڑوں اور دیوسائی کے بلند ہموار مقام پر واقع ہے جس کے ساتھ ساتھ دریائے سندھ بہتا ہے اسے چھوٹا تبت بھی کہا جاتا ہے۔سکردو امن کا دارالخلافہ ہے۔جہاں سے دوسری جگہوں پر بآسانی جایا جاسکتا ہے کوہ پیما لوگوں کے لیے ہر جگہ بہت اہم ہے یہاں کے مقامی لوگوں کو بالتی کہا جاتا ہے جو کہ دوتین منزلہ گھروں میں جو پتھروں اور

لکڑی سے بنے ہیں ان میں رہنا پسند کرتے ہیں۔یہاں کے گھروں اور ان کے اردگرد آڑو، ناسپاتی، شہتوت، انار اور سیب کے درختوں کی بھرمار ہے۔ان کے علاوہ انگور کی بیلیں ہر جگہ تاروں کی طرح لٹکی نظر آتی ہیں۔

بلتستان کے علاقے میں پاپولر اور بید کے درختوں کی بہتات ہے۔بلتستان کے علاقے میں پانچ مشہور وادیاں ہیں جن میں شیگار، سکردو، کاپورا، روندو اور پاسوا اپنی خوبصورتی اور قدرتی نظاروں میں اپنی مثال آپ ہیں۔بلتستان کی مشہور جھیل ''ست پارہ'' کے نام سے مشہور ہے اور سکردو سے 8 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ست پارہ جھیل کے اردگرد پہاڑوں کی برفانی چوٹیاں بخوبی نظر آتی ہیں اور اس کا پانی شفاف شیشے کی مانند دکھائی دیتا ہے۔جھیل کے درمیان میں پریوں کی کہانیوں سے مشہور ایک جزیرہ ہے۔اس جزیرہ تک کشتی کے ذریعے بآسانی پہنچا جا سکتا ہے۔ دوسری خوبصورت جھیل سکردو شہر سے تقریباً 38 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے جو''اپر کچورا'' کے نام سے مشہور ہے۔

گلگت

گلگت جو ریشم کی سرزمین مشہور ہے دلکش نظاروں کی وجہ سے بے نظیر ہے یہاں کے قبائلی لوگ نہایت ملنسار، گرم جوش اور بھرپور میزبان ہیں۔یہ فوجی اعتبار سے اہم خطہ سمجھنے کے ساتھ ساتھ آب رسانی اور کئی ایک پہاڑوں کے درمیان ہے اور اپنی دلکشی انفرادیت پیدا کیے ہوئے ہے۔گلگت شہر چونکہ چائنہ کے قریب ہے۔اس وجہ سے چائنہ کی مصنوعات کا یہ مرکز بھی ہے۔ جہاں خرید وفروخت ہوتی ہے۔چائنہ کا مشہور زمانہ ریشم اور مصالحہ جات گلگت کے شہر میں دستیاب ہوتے ہیں۔یہاں کے بازاروں میں ہر وقت گہما گہمی رہتی ہے۔منگول، تاجک، چینی اور افغانی لوگ یہاں بازاروں اور گلیوں میں گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔تھوڑے بہت وسطی ایشیا کے لوگ بھی موجود ہیں۔یہ تمام روایتی لباس پہنتے ہیں۔گلگت ہی ایک شہر ہے جہاں ابھی تک پرانے روایتی انداز میں پولو کھیلی جاتی ہے۔تیسری صدی سے گیارہویں صدی تک گلگت بلور کے بدھا بادشاہت کا حصہ تھا۔بدھ مجسموں کی کندہ کاری اس تمام خطے میں ابھی تک دیکھی جاسکتی ہے جس طرح مشہور ''کارتھا بدھا'' کی کندی کاری موجود ہے۔آٹھویں صدی کے اوائل میں تین بڑی طاقتیں چائنہ، عرب اور تبت اس خطہ کی طرف مائل ہوئے۔بہت ساری لڑائیوں کے بعد آخر یہ

خطہ سات بادشاہتوں جن میں پانچ مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں میں بٹ گیا۔ تیرہویں صدی میں مارکو پولو نے اس علاقے کو شوروغل کی بادشاہت کا علاقہ کہہ دیا تھا۔ یہاں پہنچنے والے شائقین اسلام آباد سے پندرہ گھنٹے کی قراقرم شاہراہ پر مسافت طے کرنے کے بعد پہنچتے ہیں۔ شاہراہ قراقرم بھی دنیا کی آٹھویں عجوبہ میں شامل ہو چکی ہے جو کہ پرانی شاہراہ ریشم کی افسانوی کہانیوں کی یاد دلاتی ہے۔اس کے علاوہ صرف ایک گھنٹہ کی ہوائی پرواز سے اس دلکش خوصورت علاقہ میں پہنچا جا سکتا ہے۔

وادی ہنزہ

افسانوی کہانیوں کی سرزمین وادی ہنزہ 100 کلومیٹر کے علاقے میں پھیلے ہوئے بلندترین پہاڑی سلسلوں میں گھری ہوئی ہے۔ یہاں پر پہاڑی سلسلوں کی اونچائی 1500 میٹر سے 800 میٹر تک بلند ہے۔ دائمی برفباری سرسبز پھلوں کے باغات، خاموش ندیاں اور اچھلتے کودتے دریا سبزہ زار اور چراگاہیں یہ سب ایسی خصوصیات ہیں جن سے اس علاقے کو پوری دنیا میں مشہور کیا ہوا ہے اور سیاح سیروتفریح کے لیے یہاں پہنچتے ہیں۔ پوری ہنزہ وادی اپنی چوٹی جوراکاپوشی کے نام سے مشہور ہے اور 7788 میٹر بلند ہے۔ راکاپوشی کی چوٹی نیلے آسمان کے سائے میں ہیرے کی طرح چمکتی ہے۔ ہنزہ کی وادی کو امن کی سرزمین کہا جاتا ہے اور یہ ایک پرسکون ماحول پیش کرتی ہے جو کہ پھلوں کے باغات اور افسانوی کہانیوں کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔

روزنامہ ''نوائے وقت'' سنڈے میگزین، ایڈیشن 2008ء

○

چترال گول نیشنل پارک

سیاحتی نقطۂ نظر سے پاکستان کے شمالی علاقے بالخصوص گلگت، چترال، وغیرہ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ چترال سے تقریباً تین کلومیٹر مغرب میں چترال گول نیشنل پارک ہے 7750 ہیکٹرز تقریباً 77 مربع کلومیٹر کے رقبے پر پھیلے ہوئے اس علاقے کو 1984ء میں نیشنل پارک کا درجہ دے کر جنگلی حیات اور قدرتی ماحول کے لیے محفوظ علاقہ قرار دے دیا گیا۔ چترال گول نیشنل پارک صنوبر کے گھنے جنگل پر مشتمل ہے اس کی وجہ سے یہاں جنگلی جانوروں اور پرندوں بالخصوص مارخور ایک قسم کا پہاڑی بکرا، آئی بیکس، (سراح بکرا) اڑیال، کالے ہرن، پہاڑی تنیدوے، ہمالیائی برفانی مرغ، برفانی تیتر، وغیرہ بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ چترال کے مہتروں (حکمرانوں) نے اس پورے علاقے کو 1880ء میں اپنی ذاتی شکارگاہ کی حیثیت دی ہوئی تھی اس کی وجہ سے اس علاقے میں نایاب اقسام کے جانور اور پرندے بچ گئے کیونکہ حکمران یہاں کسی اور کو شکار نہیں کھیلنے دیتے تھے لیکن ریاست ختم ہونے کے بعد اس علاقے میں اندھادھند شکار کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ جانوروں اور پرندوں کی تعداد خطرناک حد تک کم ہوگئی تھی بلکہ یہاں کا پورا قدرتی ماحول اس کی وجہ سے متاثر ہو رہا تھا اس قدرتی ماحول اور جنگلی حیات کو تحفظ دینے کی خاطر اسے نیشنل پارک کا درجہ دے دیا گیا اور یہاں شکار اور درختوں کی اندھادھند کٹائی پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی۔

چترال گول نیشنل پارک اس لحاظ سے بڑی منفرد حیثیت کا حامل ہے کہ یہاں نسبتاً ہموار میدانی علاقے بھی ہیں اور بلند و بالا پہاڑ بھی اس نیشنل پارک کے مختلف علاقے سطح سمندر سے ڈیڑھ ہزار میٹر سے تقریباً پانچ ہزار میٹر تک بلند ہیں۔ یہاں چوبیس پہاڑ ایسے ہیں جن کی بلندی تین ہزار میٹر سے زیادہ ہے اس نیشنل پارک میں لاتعداد پہاڑی ندی نالے اور آبشار ہیں جن کا نیلگوں پانی آگے جا کر دریائے کہنار میں شامل ہو جاتا ہے۔ دسمبر سے لے کر مارچ تک یہ پورا علاقہ شدید برف باری کی لپیٹ میں رہتا ہے۔

چترال گول نیشنل پارک میں سیاحوں کے قیام کے لیے ایک ریسٹ ہاؤس بھی ہے۔

NCS جریدہ

○

خنجراب نیشنل پارک، گلگت

شمالی علاقوں میں واقع دوسرا نیشنل پارک خنجراب نیشنل پارک ہے یہ نیشنل پارک گلگت سے 269 کلومیٹر شمال مشرق میں دو لاکھ چھبیس ہزار نوسو تیرہ ہیکٹرز پر پھیلا ہوا ہے اس علاقے کو اپریل 1979ء میں نیشنل پارک کا درجہ دیا گیا یہ پورا نیشنل پارک چونکہ سطح سمندر سے بہت زیادہ بلند (3200 میٹر سے لے کر 600 میٹر تک) ہے اس لیے سال کے بیشتر مہینوں میں پورا پارک برف سے ڈھکا رہتا ہے پورے علاقے میں وسیع عریض گلیشئرز اور برفانی جھیلیں ہیں اس علاقے میں زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت 14 درجے سینٹی گریڈ اور کم سے کم منفی 12 درجے سینٹی گریڈ رہتا ہے خنجراب نیشنل پارک کے علاقے میں سبزہ بہت کم ہے کیونکہ برفانی موسم سبزے کو نمو نہیں پانے دیتا اس علاقے کو نیشنل پارک قرار دینے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ یہاں پائے جانے والے جنگلی جانوروں کی نایاب اقسام کو تحفظ فراہم کیا جائے بالخصوص بھیڑوں کی ایک نایاب نسل مارکو پولو شیپ کی نہ صرف حفاظت کی جائے بلکہ ان کی افزائش نسل کے لیے موزوں ماحول فراہم کیا جائے۔ مارکو پولو شیپ کے علاوہ یہاں برفانی تیندوے، لومڑی، برفانی ریچھ، سراح بکروں، (آئی بیکس) اور سنہرے چوہوں کی بھی متعدد اقسام موجود ہیں۔

شاہراہ قراقرم بن جانے کی وجہ سے عام لوگوں اور سیاحوں کی یہاں تک رسائی آسان ہوگئی ہے۔ اس لیے ہر سال کافی تعداد میں سیاح خنجراب نیشنل پارک آتے ہیں۔ شاہراہ قراقرم "پھسو" کے قریب و جوار میں کافی ہوٹل ہیں جہاں سیاح قیام کر سکتے ہیں۔

NCS جریدہ

خیبر سفاری ریلوے

خیبر ریلوے کی اپنی منفرد تاریخ ہے جسے 1925ء میں برطانوی حکومت نے اپنے فوجیوں کی نقل وحرکت کے لیے سستے ذریعہ سفر کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ انگریزوں نے ریلوے لائن کی نگرانی کے لیے شاہ گئی اور لنڈی کوتل میں دو اہم قلعے اور کئی واچ اسٹیشن بنوائے۔ ریلوے لائن کی تعمیر انجینئرنگ کا غیر معمولی کارنامہ ہے شروع میں ہفتے میں ایک بار عوام کے لیے ریل چلتی تھی پشاور سے جمرود تک سفر کا پہلا مرحلہ آسان ہے کیونکہ یہاں زیادہ تر میدانی پہاڑی علاقہ ہے لیکن جمرود سے آگے طورخم سرحد تک 27 میل کا سفر انتہائی دشوار گزار چڑھائی پر مبنی ہے اس دوران ٹرین 34 سرنگوں سے گذرتی ہے جن میں ایک کامرہ تنگی سرنگ بہت طویل ہے سفر کے دوران خوبصورت وادیاں بھی آتی ہیں اور سنگلاخ چٹانیں بھی۔ انتہائی بلندی کی وجہ سے یہاں ٹرین کے آگے اور پیچھے دو انجن لگائے جاتے ہیں۔ شروع میں پیدل یا خچر اور اونٹ پر سواری کے علاوہ ٹرین ہی درہ خیبر کو پار کرنے کا واحد راستہ تھا۔ درہ خیبر کے سفر کا آغاز پشاور کینٹ کے ریلوے اسٹیشن سے ہوتا ہے۔

ریل یا سڑک کے راستے سنگلاخ پہاڑوں میں درہ خیبر کا سفر ایک ولولہ انگیز تجربہ ہے آپ کو جگہ جگہ کندھے پر بندوق رکھے آفریدی یا شنواری نظر آئیں گے۔ صدیوں پرانے سنگلاخ نشیب وفراز پر مقامی قبائلی خچروں پر سامان لادے آج بھی رواں دواں دیکھے جاسکتے ہیں راستے میں بلند وبالا دیواروں اور حفاظتی ٹاوروں میں گھرے گاؤں بھی آئیں گے جبکہ نیچے شفاف پانی کی شور مچاتی ندی بہتی ہے جو قبائلیوں کی جنگوں اور حملہ آوروں کے زخموں کی کہانی سناتی ہے حفاظتی ٹاوروں میں موجود خاصہ دار (لیوی گارڈ) مسافروں کے محفوظ سفر کے ضامن ہیں اور ان کی موجودگی قبائلیوں اور برطانوی حکومت کے معاہدے کی یاد دلاتی ہے سفاری ٹرین کے آخری سٹیشن لنڈی خانہ سے طورخم بارڈ کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔

عالمی سطح پر معروف امریکہ کے ٹائم میگزین کے ٹوکیو سے شائع ہونے والے ایشیا ایڈیشن میں پاکستان میں پشاور سے لنڈی کوتل تک چلنے والی ''خیبر سفاری ٹرین'' کو دنیا کی سب سے پروقار ٹورریسٹ ریل گاڑیوں میں سے ایک قرار دیا گیا ہے یہ بات میگزین کے رپورٹر پال تھیروکس نے اپنے ایک آرٹیکل میں ذاتی تجربات بیان کرتے ہوئے بتائی جو ٹائم میگزین کے سالانہ شمارے میں چھپا ہے مضمون نگار کے مطابق ایشیا کی پانچ پروقار گاڑیاں بالترتیب ''خیبر سٹیم سفاری پاکستان'' ''پیلس آن دی وہیلز، بھارت، فسیٹری کوئین، انڈیا'' ''ایسٹرن اینڈ اورنٹیل ایکسپریس، نیوزی لینڈ'' اور ''شنکانس، جاپان،'' شامل ہیں۔ خیبر سٹیم سفاری، دلچسپی کے اعتبار سے اپنی نوعیت کا منفرد سفر ہے جس کا اہتمام پاکستان ریلوے سرحد ٹورازم کارپوریشن اور صحرائی ٹریولز پشاور کے مشترکہ اشتراک سے کیا جاتا ہے اب تک اس ٹرین سے سینکڑوں بین الاقوامی اور مقامی سیاح سفر کر چکے ہیں۔

○

صوبہ بلوچستان

کوئٹہ

صوبہ بلوچستان کا صدر مقام ہے اور سطح سمندر سے 1700 میٹر کی بلندی پر پہاڑی سرزمین پر آباد یہ شہر بلوچی تہذیب و ثقافت کا امین ہے۔ پشتو لفظ ''کواٹہ'' جس کے معنی قلعہ کے ہیں سے یہ نام دیا گیا ہے۔ قدیم دور میں اسے ''شالکوٹ'' کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ اس شہر کو ایران اور افغانستان کی سرحدات کے مقام کے قریب ہونے کی وجہ سے ان ملکوں سے رابطے کے مرکز کی حیثیت حاصل ہے یہ شہر پہاڑوں کے دامن میں نہایت پرفضا مقام پر واقع ہے سردیوں میں شدید سردی پڑتی ہے تاہم باقی سارا سال یہاں موسم خوشگوار رہتا ہے 31 دسمبر 1935 کو یہاں پر شدید زلزلہ آیا جس نے اس شہر کو مکمل طور پر تباہ کر دیا۔ تقریباً تیس ہزار لوگ جان بحق ہو گئے تھے چنانچہ اس شہر کو دوبارہ تعمیر کیا گیا۔

اس علاقے کو 3500 قبل از مسیح کی پرانی تہذیب کا حامل قرار دیا جاتا ہے۔ یہاں پر موجود بلوچستان آرکیالوجیکل میوزیم یہاں کے تہذیبی آثار کو محفوظ کیے ہوئے ہے۔ یہ میوزیم 1906ء میں قائم کیا گیا اور اسے میک موہن میوزیم کا نام دیا گیا۔ 1935ء کے زلزلہ میں یہ میوزیم بھی تباہ ہوا چنانچہ 1972ء میں اسے دوبارہ منظم کیا گیا۔

یہاں پر فوج کی تربیت کا بہت بڑا مرکز ہے یہ برصغیر کا سب سے قدیم فوجی کالج ہے۔ یہاں پر ہزار گنجی چلتن پارک بھی دیکھنے کے لائق ہے جو کہ کوئٹہ سے 20 کلومیٹر کے فاصلے پر چلتن رینج میں بنایا گیا ہے اس کے علاوہ یہاں پہاڑوں میں گھری حنا جھیل بھی قابل دید ہے۔

○

زیارت ریذیڈنسی

بانی پاکستان بابائے قوم حضرت قائداعظم محمد جناح کی زندگی کے آخری ایام بلوچستان کے پر فضا مقام زیارت میں بسر ہوئے یہ حقیقت ہے کہ یہاں چند ہفتے گذار کر حضرت قائد نے زیارت کو شہرت دوام بخشی جس عمارت میں ان کا قیام رہا وہ ''قائداعظم ریذیڈنسی'' کے نام سے آج بھی اپنے پورے وقار اور تمکنت کے ساتھ ہر خاص و عام کے لیے دعوت نظارہ دے رہی ہے۔

زیارت جانے والے راستے کے اردگرد سیب، چیری اور اخروٹ کے باغات پھیلے ہوئے ہیں۔زیارت شہر کے آغاز میں باب خیبر کی طرح باب زیارت بنایا گیا ہے یہ بلوچستان کے عام شہروں کی نسبت بھر پور شہر ہے اور دیکھنے میں ایوبیہ کی طرح دکھائی دیتا ہے زیارت، پہلے سبی ضلع میں تھا اب خود زیارت ضلع بن چکا ہے اور سبی اس کا ڈویژن ہے گرمیوں میں سبی ڈویژن کے تمام دفاتر زیارت منتقل ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ سات ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر واقع ایک سرد مقام ہے جبکہ سبی ملک کے گرم ترین علاقوں میں شمار ہوتا ہے پاکستان کے ایک معروف سیاستدان نواب محمد اکبر خان بگٹی کا حلقۂ انتخاب بھی یہی ہے ان کے حلقۂ انتخاب میں زیارت کو ہلو اور ڈیرہ بگٹی وغیرہ شامل ہیں۔

زیارت میں جونیپر کے درخت کثیر تعداد میں ہیں۔قائداعظم ریذیڈنسی کے راستے میں ایک بورڈ آویزاں ہے جس پر لکھا ہے کہ ''جونیپر کے جنگلات کا شمار دنیا کے قدیم ترین جنگلات میں ہوتا ہے جونیپر کا درخت سال میں صرف ایک انچ بڑھتا ہے اس کا کاٹنا قانونی جرم ہے۔

قائداعظم ریذیڈنسی، کو زیارت یذیڈنسی بھی کہا جاتا ہے یہ کوئٹہ سے 133 کلومیٹر کے فاصلے پر سبی ڈویژن ضلع زیارت میں سطح سمندر سے سات ہزار دو سو فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔اس کی تعمیر برطانوی عہد میں 92-1791 کے دوران انتالیس ہزار بارہ روپے کی لاگت سے ہوئی۔ قیام

پاکستان سے قبل گورنر جنرل کے ایجنٹ اور بلوچستان کے چیف کمشنر موسم گرما میں یہاں قیام کیا کرتے تھے۔ بابائے قوم سے تعلق کی بناء پر اسے قومی یادگار کا درجہ دے دیا گیا۔ 1975ء کے اینٹی کوئٹی ایکٹ کے حوالے سے یہ عمارت ملک کے محفوظ آثار قدیمہ کی فہرست میں شامل کر دی گئی۔

فروری 1978ء میں اس کا نام "قائداعظم ریذیڈنسی" رکھا گیا۔ قائداعظم ریذیڈنسی کی عمارت دومنزلہ ہے جس کے فرش اور چھجے لکڑی سے بنائے گئے ہیں۔ صنوبر کے جنگلات سے بھری دنیا کی عظیم وادی کا منظر یہاں سے صاف دکھائی دیتا ہے رنگارنگ پھولوں کی کیاریوں سے آراستہ سرسبز و شاداب سبزہ زار، لمبے لمبے چنار اور اخروٹ کے درخت اس کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں ریذیڈنسی کی عمارت نوفٹ چوڑے برآمدے سے شروع ہوتی ہے اس کے بعد تقریباً 14X20 فٹ کی نشست گاہ، اس سائز کا کھانے کا کمرہ، حمام اور سنگھار خانے کے ساتھ دو مستطیل کمرے ہیں۔ جن میں سے ایک کا رقبہ سترہ فٹ گیارہ انچ ضرب تیرہ فٹ دس انچ ہے۔ اس منزل میں باورچی خانہ، نعمت خانہ اور سامان رکھنے کا کمرہ وغیرہ شامل ہے بالائی منزل چار کشادہ کمروں اور نوفٹ چوڑے ایک دالان پر مشتمل ہے ہر کمرے کے ساتھ غسل خانہ ملحق ہے بالائی منزل پر جانے کے لیے درمیانی راستہ پر ایک چوبی زینہ بنایا گیا ہے ریذیڈنسی کے جنوب مشرقی اور جنوب مغربی کناروں پر بھی لکڑی کے جنگلے کے ساتھ ایک ایک زینہ ہے عمارت کی دیواریں ناہموار، کھردرے مربع نما پتھر کے بلاکوں کی ہیں جن کی چنائی سیمنٹ سے ہوئی ہے۔ فرش، چھت، کنارے اور سامان کے دالان اور ڈیوڑھی میں صنوبر کی لکڑی استعمال ہوئی ہے اوپری ڈھلوان چھت لوہے کی نالی دار چادر سے بنائی گئی ہے۔

قدرتی حسن، پرسکون فضاء، صحت بخش آب و ہوا اور خوشگوار ماحول کا حامل ہونے کی وجہ سے قائداعظم، زیارت کو بیحد پسند کرتے تھے۔ مسلسل کام اور تھکن کے باعث ان کی صحت ابتر ہو چکی تھی یہی وجہ ہے کہ یکم جولائی 1948ء کو سٹیٹ بنک آف پاکستان کی رسم افتتاح کے بعد اپنے علاج اور آرام کی غرض سے کچھ عرصہ کے لیے زیارت میں قیام کا فیصلہ کیا۔ اس طرح زیارت ریذیڈنسی کو بابائے قوم کی آخری رہائش گاہ ہونے کا شرف حاصل ہوا اور یہاں سے کراچی واپسی پر آپ 11 ستمبر 1948ء کو خالق حقیقی سے جا ملے اور یوں زیارت ایک تاریخی نوعیت کا مقام بن گیا۔

ریذیڈنسی کے باہر برآمدے اور دالان کی لکڑی پر سبز رنگ کیا گیا ہے جبکہ کمروں وغیرہ کے دروازے براؤن ہیں۔ برآمدوں میں سرخ قالین بچھا ہوا ہے بالائی منزل میں بائیں طرف

دالان میں تین بڑی الماریاں رکھی ہوئی ہیں اور دائیں طرف دو بڑی الماریاں ہیں ایک طرف گول میز پڑا ہوا ہے سال میں ایک بار فرنیچر کو پالش کی جاتی ہے تا کہ خراب نہ ہو جبکہ چادریں موقع بہ موقع بدلی جاتی ہیں۔

قائداعظم کے آرام کمرے میں ایک سنگل بیڈ اور دو عدد ٹیبل لیمپ رکھے ہوئے ہیں مغربی دیوار کے ساتھ ایک قلعے کی تصویر آویزاں ہے الگ الگ کونوں میں تین میز اور کرسیاں پڑی ہیں۔انگھیٹی پر قائداعظم کی جوانی کی تصویر رکھی ہوئی ہے جبکہ محترمہ فاطمہ جناح کے کمرے میں فرنیچر کی قریباً یہی ترتیب ہے البتہ انگھیٹی پر دونوں بہن بھائیوں کی تصویر پڑی ہوئی ہے۔

زیارت میں قائداعظم کی رہائش گاہ ریذیڈنس کو قومی ورثہ قرار دے دیا گیا ہے سابق صدر جنرل پرویز مشرف کی ہدایت پر جاری ہونے والے ایک نوٹیفکیشن میں کہا گیا ہے کہ آئندہ زیارت ریذیڈنسی کو گورنر ہاؤس، سرکٹ ہاؤس یا ریسٹ ہاؤس کے طور پر استعمال نہیں کیا جاسکے گا۔

روزنامہ ''پاکستان'' لاہور۔تحریر: رانا شفیق پسروری

○

صنوبر کے جنگلات، زیارت

صنوبر کا یہ بے مثال جنگل ہزاروں سال پرانا ہے اور ماہرین نباتات کے مطابق کچھ درخت تو پندرہ ہزار سال سے بھی زیادہ قدیم ہیں۔ صنوبر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ دنیا کا سب سے زیادہ سست رفتاری سے بڑھنے والا درخت ہے یعنی یہ سو سال میں ایک سے تین انچ تک بڑھتا ہے اس رفتار کو ذہن میں رکھ کر جب درختوں کے قد کاٹھ کا مشاہدہ کیا جائے تو جنگل کی عمر کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایک امریکن خاتون نے اس جنگل کے درختوں کے حوالے سے تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا دراصل یہ درخت نہیں فاسلز ہیں۔

صنوبر Junipir کو کرۂ ارض کی حیاتیاتی تاریخ کے ارتقائی سفر کا ایک قدیم اور زندہ مسافر سمجھا جاتا ہے اسی بناء پر انہیں زندہ رکاز یعنی Living Fossils بھی کہتے ہیں۔ صنوبر کو دنیا بھر میں نباتات کی طویل العمر اور سست رو قسم مانا جاتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ پودوں اور نباتات کی تاریخ میں صنوبر کو ایک قدیم ترین ماحولیاتی نظام کا درجہ حاصل ہے بالعموم سرد اور خشک آب و ہوا والے خطے کے اس پودے سے متعلق ماہرین جنگلات کا اتفاق ہے کہ دنیا بھر میں اس کی 54 سے 62 کے درمیان اقسام موجود ہیں۔

صنوبر شمالی امریکا، شمالی افریقہ، وسط ایشیاء اور پاکستان سمیت جنوبی ایشیاء کے مختلف ممالک میں پایا جاتا ہے دنیا بھر میں اس کا سب سے بڑا جنگل تاجکسان میں واقع ہے جبکہ دوسرا بڑا جنگل پاکستان کے صوبے بلوچستان میں موجود ہے اگرچہ صنوبر کی اقسام میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے تاہم پاکستان میں اس کی چھ اقسام موجود ہیں بلوچستان کے صنوبری جنگلات کی غالب قسم Junipirus Exelsa Poly Carpus ہے۔

یوں تو صنوبر بلوچستان کے اضلاع سبی، کوئٹہ، لورالائی، پشین اور قلات میں بھی پایا جاتا ہے لیکن اس کا سب سے وسیع اور گھنا سلسلہ ضلع زیارت میں وقع ہے۔ ماہرین کے مطابق افسوسناک

حقیقت یہ ہے کہ منفی انسانی سرگرمیوں اور غیر دانش مندانہ استعمال کے باعث اس منفرد نوع کے جنگل کو پہنچنے والے نقصانات شدید تر رہے ہیں جس کے سبب اس جنگل کا حیاتیاتی نظام خطرات سے دوچار ہے۔

صنوبر ایک نادر اور نہایت سست رفتاری سے بڑھنے والا درخت ہے یہ پچاس سال میں بہ مشکل تین فٹ بڑھتا ہے پھر یہ کہ یہ پیڑ ہر جگہ جڑ بھی نہیں پکڑتا اس کی افزائش کے لیے خاص آب و ہوا اور ماحول درکار ہے صنوبر خشک اور سرد آب و ہوا والے علاقے کا درخت ہے کہ جس کی سطح سمندر سے بلندی اٹھارہ سو تا تین ہزار میٹر تک ہو اور جہاں سالانہ بارش اور برف باری سوا تین سو ملی میٹر سے تجاوز نہ کرے۔ صنوبر کا یہ بے مثال جنگل ہزاروں سال پرانا ہے اور ماہرین نباتات کے مطابق کچھ درخت تو پندرہ ہزار سال سے بھی زیادہ قدیم ہیں۔

بقول محقق اور تجزیہ نگار اگر آپ سست رو صنوبر کا 35-30 میٹر اونچا پیڑ دیکھیں تو جان لیں کہ آپ کرۂ ارض کے قدیم ترین جانداروں میں سے ایک کو دیکھ رہے ہیں۔ ذرا تصور میں لائیں کہ اس درخت کا بیج تب زمین سے پھوٹا کہ جب گوتم بدھ ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے جب موہن جودڑو اور ہڑپہ کے اصل باسیوں کو ابدی نیند سوئے ہوئے بھی دو ہزار سال بیت چکے تھے اس وقت ٹیکسلا شہر عروج پذیر تھا اور دنیا کو یونانی سکندر فاتح کی پیدائش کے لیے لگ بھگ تین سو سال مزید انتظار کرنا تھا۔

صنوبر کے درختوں کا سایہ زمین کو دھوپ کی براہ راست تمازت سے محفوظ رکھتا ہے جس کی وجہ سے موسم سرما میں پڑنے والی برف کئی ماہ تک جمی رہتی ہے اور جب موسم گرما میں برف پگھلنا شروع ہوتی ہے تب بھی صنوبر کا سایہ پانی کے بخارات میں تبدیل ہونے کی رفتار کو بڑھنے نہیں دیتا۔ یوں زیرزمین پانی کی بازیافت (ری چارج) کے ساتھ ساتھ پینے، زراعت اور دیگر استعمال کے لیے پانی تقریباً ہر وقت موجود رہتا ہے اور اس کی بڑی مقدار ضائع ہونے سے بھی محفوظ رہتی ہے۔

صنوبر کے متعدد طبی فوائد ہیں جن کا حکمت میں استعمال کیا جاتا ہے اور طب مشرق میں اس کے بیش بہا فوائد موجود ہیں۔ صنوبر کے جنگلات زمین کو ہوا کے کٹاؤ سے محفوظ رکھتے ہیں۔ یہ موسم گرما اور سرما کی شدت کو کم کرتے ہیں نیز ہوا میں نمی کے عنصر کو بھی برقرار رکھتے ہیں۔ صنوبر کے درخت سیلابی پانی کے بہاؤ کو کم کرتے ہیں جس سے قدرتی نظام کے تحت زیرزمین پانی کی ترسیل

کو باضابطہ بنانے میں بھی مدد ملتی ہے۔ مثلاً طب مشرق کی رو سے صنوبر کی لکڑی کا تیل پرانے زخموں کو ٹھیک کرتا ہے اور چنبل جیسے جلدی مرض کے لیے اکسیر ہے۔ نکسیر روکنے کے لیے صنوبر کے پتوں اور چھال کا سفوف استعمال کیا جاتا ہے جبکہ جسم کے کسی بھی حصے سے بہنے والے خون کو روکنے کے لیے اس کا استعمال مختلف طریقوں سے ہوتا ہے اس کے پتوں اور چھال کے جوشاندے سے کلی کرنے سے دانتوں کا درد ختم ہوتا اور مسوڑے مضبوط ہوتے ہیں اوران سے خون آنا بند ہو جاتا ہے۔ اگر ہم یہ فوائد جان لیں تو نہ صرف صنوبر کی اہمیت بڑھ جائے گی بلکہ اس سے ادویات کی تیاری کے لیے منظم اور جدید خطوط پر بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

زیارت کے قدیم صنوبری جنگلات پاکستان میں منفرد نظام جنگلات کے حامل ہیں ان کی حفاظت اور ماحولیاتی سیاحت کے فروغ اور عالمی سطح پر انہیں متعارف کروانے کے لیے آئی یو سی این کے صنوبری جنگلات کو اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو کے تحت عالمی ورثہ قرار دلوانے کے لیے ایک منصوبہ بنایا ہے اس سلسلے میں قواعد وضوابط کے حوالے سے کوششیں شروع ہو چکی ہیں اُمید کی جاتی ہے کہ اگلے برسوں میں اسے یہ درجہ حاصل ہو جائے گا ایسا ہوا تو یہ پاکستان میں منفرد نوعیت کا عالمی ورثہ ہوگا کیونکہ پاکستان میں اب تک قدرتی ماحول کی نسبت کوئی بھی ایسی چیز نہیں ہے جسے یہ مقام حاصل ہوا ہو اس کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ نہ صرف زیارت عالمی اہمیت حاصل کرے گا بلکہ ان صنوبری جنگلات کو دیکھنے کے لیے ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کی بڑی تعداد بھی یہاں کا رخ کرے گی اس طرح ماحولیاتی سیاحت کو جہاں فروغ حاصل ہوگا مقامی معیشت پر بھی اس کے خوشگوار اثرات مرتب ہوں گے اور یہ صورتحال منفی انسانی سرگرمیوں سے بھی صنوبر کو بڑی حد تک محفوظ رکھنے میں بھی معاون ثابت ہوگی۔

مختار آزاد، ایم اے شیخ

جریدہ NCS

○

گوادر کا تفریحی پس منظر

گوادر، کراچی سے تین سومیل کے فاصلے پر ایران کی سرحد کے قریب بلوچستان کا ایک ایسا ساحلی قصبہ ہے جس میں فطری طور پر گہرے پانی کی قدرتی بندرگاہ بننے کی گنجائش پائی جاتی ہے لیکن ایک ایسے دورافتادہ مقام پر واقع ہونے کے باعث جس کا باقی ملک کے ساتھ ریل اور سڑک کے رابطے نہ ہونے کے برابر ہیں اپنی فطری صلاحیت کے باوجود اب تک گوادر کو محض مقامی سطح پر ماہی گیری کی بندرگاہ کے طور پر بھی استعمال کیا جارہا ہے۔

رقبے کے لحاظ سے پاکستان کے سب سے بڑے صوبہ بلوچستان میں ساحل مکران پر واقع گوادر، پاکستان کا نقشے پر کراچی سے بہت آگے ایرانی سرحد کے قریب واقع ایک نہایت پسماندہ شہر ہے شہر کے اردگرد کا علاقہ گوادر کا ضلع کہلاتا ہے اس ضلع میں تین قصبے ہیں گوادر، پسنی اور مرا۔

گوادر کا قصبہ 1958ء تک چھوٹی سی ہمسایہ خلیجی ریاست مسقط کے قبضہ میں تھا۔ مسقط جس کا نام سلطنت العمان ہے اس کے حکمران سلطان السعید (موجودہ سلطان کے والد) نے اپنی معاشی پریشانیوں کے باعث گوادر کو بھارت کے ہاتھ فروخت کرنے کا منصوبہ بنایا۔ حکومت پاکستان کو بمبئی میں ان کے میزبان مسلمان تاجروں کی وساطت سے اس سودے کے بارے میں علم ہوا تو پاکستان کی اُس وقت کی حکومت نے جس کے وزیراعظم فیروز خان نون تھے کسی تساہل سے کام لیے بغیر فوری طور پر بھارت سے زیادہ قیمت ادا کر کے گوادر کو خرید لیا اس طرح 1958ء میں گوادر پاکستان کا حصہ بنا گوادر کی فروخت کے وقت مسقط اور پاکستان کی حکومتوں کے درمیان یہ طے پایا کہ گوادر کے باشندوں کو بیک وقت دونوں ممالک کی شہریت حاصل ہوگئی البتہ 1985ء کے بعد پیدا ہونے والے صرف پاکستان کے شہری تصور ہوں گے اس معاہدے کے تحت آج بھی سلطنت

اومان میں گوادر کے باشندوں کو شہری حقوق حاصل ہیں ان کی ایک کثیر تعداد سلطنت اومان کی فوج اور دیگر محکموں میں ملازم ہے اور بہت سے بلوچ باشندے اومان میں کاروبار بھی کرتے ہیں جس طرح پاک افغان سرحد کے دونوں طرف بسنے والے قبائل میں سماجی، ثقافتی کاروباری اور خاندانی رشتے ہیں بالکل اس طرح گوادر کے بلوچوں اور سلطنت اومان کے بلوچوں میں قدیم اور گہرے خاندانی سیاسی، سماجی، اور تجارتی رشتے پائے جاتے ہیں۔

نصیر خان نوری حکمران قلات نے مسقط کے شہزادے سید سلطان کو گذر اوقات کے لیے حوالے کیا تھا تاہم بعد میں مسقط کے حکمرانوں نے اسے اپنی حکومت کا حصہ بنالیا 23-1822 میں خان قلات ناصر خان مرحوم نے اپنی فوج کی مدد سے گوادر پر قبضہ کرنے کی ناکام کوشش کی اس کی بڑی وجہ گوادر کے گورنر نے خان قلات کے کمانڈروں کو لالچ دے کر خرید لیا تھا۔

1957ء میں پاکستانی حکومت نے اومان سے گوادر پونے تین کروڑ روپے باقاعدہ معاہدے کے تحت واپس خریدا کیوں کہ خان آف قلات کے آباؤ اجداد نے تحفہ میں یہ اومان کے شہزادے کو دیا تھا گوادر اس علاقے سے فاصلاتی طور پر بھی نہایت قریب ہے بلکہ اومان اور گوادر کے درمیان تاریخی روابط بھی استوار ہیں 1957ء سے قبل مسقط کی طرح گوادر بھی پسماندہ علاقہ رہا یہاں پر سلطان نے کسی قسم کی سماجی ترقی لانے کی کوشش نہیں کی تاہم گوادر میں فوجی ملازمتوں کے دروازے کھولے گئے۔

گوادر کی کل آبادی تقریباً دولاکھ کے قریب ہے اور مقامی لوگوں کا ذریعہ معاش ماہی گیری ہے سارا ضلع ساحل سمندر پر واقع ہے اس لیے یہاں 3400 افراد ماہی گیری کا پیشہ اختیار کیے ہوئے ہیں غربت کی وجہ سے وہ پرانی کشتیوں اور جالوں کے ذریعے مچھلیاں پکڑتے ہیں ساحلی علاقے کے قریب سمندر میں ٹیونا مچھلی عام ہے جس کی مغربی دنیا میں بڑی زبردست مانگ ہے ماہی گیر ناخواندہ ہونے کی وجہ سے مچھلی کو کوڑیوں کے بھاؤ فروخت کرتے ہیں یہ صورتحال 1958ء سے اب تک ویسی کی ویسی ہے۔

بلوچستان میں 35 مختلف رنگ ونسل کی مچھلیاں جن کا وزن ایک لاکھ چودہ میٹرک ٹن اور جو

910 ملین روپے کی مالیت کی ہوتی ہیں کو روایتی طریقوں سے پکڑا جاتا ہے جن میں ساٹھ ملین روپے کی مالیت کی دس ہزار ٹن ٹیونا مچھلی ہوتی ہے خشک کرنے کے بعد ٹیونا مچھلی کو نہایت ہی کم قیمت پر سری لنکا کو دو سے 3 روپے فی کلوگرام پر بیچ دیا جاتا ہے جبکہ بین الاقوامی مارکیٹ میں اس کی قیمت 15 سے 20 ڈالر فی کلو ہوتی ہے۔

گوادر کے ساحل کا کل رقبہ 130 ایکڑ ہے گوادر کا ساحل 21ویں صدی کے تقاضوں کے مطابق پاکستان کی شہ رگ بن چکا ہے جو ملک وقوم اور سمندری وسائل کے حوالے سے بہرہ ور ہوگا یہ علاقہ سمندری وسائل سے مالا مال ہے یہاں بندرگاہ کو ترقی دے کر خام سمندری وسائل کو استعمال کر کے کثیر زرمبادلہ حاصل کیا جاسکتا ہے ٹیونا مچھلی کثیر تعداد میں پائی جاتی ہے اس کا نرخ عالمی منڈی میں بہت زوروں پر ہے اس لیے ضروری ہے کہ مچھلی کو پکڑنے کی جدید سہولتوں میں اضافہ ہو جس سے مچھلی کو محفوظ رکھا جاسکے اور بہتر قیمت پر فروخت کی جاسکے۔

دوم یہ کہ ہر قسم کی شورش سے پاک اور وسیع علاقہ ہے جہاں لیبر بھی سستی حاصل ہوتی ہے یہاں کے سمندری راستے بھی جہاز رانی کے لیے بے مثال ہیں روس کی وسط ایشیائی ریاستیں اور افغانستان جبکہ دوسرے طرف متحدہ عرب امارات اور دیگر علاقوں کے راستے میں گوادر جو کراچی سے قریباً 265 میل دور ہے اور سب سے خاص بات یہ کہ گوادر کی بندرگاہ خلیج فارس کے عین دہانے پر واقع ہے اور وسطی ایشیاء سے گوادر تک زمینی فاصلہ محض 500 کلومیٹر ہے وسطی ایشیائی نو آزاد مسلم ریاستوں کی باقی دنیا کے ساتھ تجارتی روابط موزوں ترین ذریعہ گواردر کی بندرگاہ ہے اگر دفاعی اعتبار سے سی پورٹ بنایا جائے تو کراچی کی نسبت زیادہ اہم ثابت ہوگا دنیا بھر کے سمندری راستوں کے لیے ایک آئیڈیل بندرگاہ بن سکتی ہے۔

گوادر کی بندرگاہ کو ترقی دینے کا منصوبہ ابتدائی طور پر بلوچستان کی حکومت نے 1971ء میں شروع کیا تھا نیشنل اکنامک کمیٹی کی سنٹرل ایگزیکٹو نے 54.69 ملین روپے کے اس منصوبے کی باقاعدہ منظوری دی تھی لیکن بلوچستان کی صوبائی حکومت بوجوہ اس منصوبے پر کام کا آغاز نہ کرسکی نومبر 1972ء میں بھٹو کے عہد میں مرکز نے اس منصوبے کو اپنے ہاتھ میں لیا وفاقی وزارت

مواصلات نے مستقبل کے امکانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے گوادر میں ایک باقاعدہ بندرگاہ تعمیر کرنے کے لیے پاکستان کی فرم ٹیکنو کنسلنٹ اور برطانوی کمپنی کنز ڈ اینڈ پاٹزز اور ہالینڈ کی ایک فرم ڈیلف ہائیڈ روالک لیبارٹری کو علاقے کا سروے کر کے بندرگاہ کا ڈیزائن تیار کرنے کی ذمہ داری سونپی ان تینوں کمپنیوں نے 1958ء کی قیمتوں کے مطابق 759 ملین روپے کا منصوبہ تیار کیا جس میں 17 ملین امریکی ڈالر کے زرمبادلہ کے اخراجات بھی شامل تھے نیشنل اکنامک کمپنی کی سنٹرل ایگزیکٹو نے اس تخمینے کی منظوری دی۔ بین الاقوامی کمپنیوں کو اپنی حکومتوں کی طرف سے سرمایہ کاری کی منظوری کی شرائط کے ساتھ ٹینڈر دینے کی دعوت دی۔

ابتداء میں 47 بین الاقوامی کمپنیوں نے منصوبے میں دلچسپی ظاہر کی 25 بین الاقوامی کمپنیوں نے منصوبے پر کام کرنے کی شرائط اور قابلیت کی تکمیل کی۔ 16 کمپنیوں نے ٹینڈر کے کاغذات خریدنے اور آخر کار صرف 09 کمپنیوں نے بندرگاہ کی تعمیر کے لیے ٹینڈر سابق وزیراعظم محمد خان جونیجو مرحوم کے عہد حکومت میں 20 جولائی 1987ء کو کھولے گئے۔ بلیجئم کی ایک فرم کی پیش کش کو سب سے ازراں ہونے کی بنیاد پر منظور کرتے ہوئے اسے 894 ملین روپے کا ٹھیکہ دیا گیا جس کے لیے 604 ملین روپے کے دو بیرونی قرضے حاصل کئے گئے 222 ملین روپے کا قرضہ جس کی ادائیگی تیس سال میں ہونا تھی 6 فیصد سالانہ سود پر اور 382 ملین روپے کا قرضہ 7.4 فیصد سالانہ سود پر حاصل کیا گیا۔

ان بنیادی مراحل کی تکمیل کے بعد گوادر فش ہاربر اور منی ڈیپ واٹر پورٹ کا سنگ بنیاد دسمبر 1989ء میں رکھا گیا۔ 1991ء میں اس منصوبے کی تکمیل متوقع تھی لیکن ریاستی اکھاڑ پچھاڑ کے باعث یہ منصوبہ بروقت پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

بلوچستان کے ساحلی علاقے میں آٹھ قصبے ہیں جن میں 34 مختلف آبادیوں میں تین لاکھ سے زائد افراد آباد ہیں ان میں سے تقریباً 3400 افراد مچھلی کے کاروبار سے منسلک ہیں مچھلی کی پیداوار میں بلوچستان کا حصہ 23 فی صد ہے جس میں گوادر کا حصہ 34 فی صد ہے گوادر بندرگاہ کی پیداوار 34000 میٹرک ٹن ہے جس کی مالیت 250 ملین روپے ہے۔

اس کے مقابلے میں پسنی، ہاربر کی آمدنی 220 ملین روپے ہے اس علاقے میں مچھلیاں پکڑنے کے آٹھ مقامات ہیں جن میں پسنی، گوادر، جیوانی، اوڑمارا، گڈانی، پشوکان اور سونمیانی شامل ہیں۔ گوادر کی بندرگاہ کو بلجیئن کمپنی نے 1610 ملین روپے کی لاگت سے تین سال میں مکمل کر لیا تھا اس کے لیے مجموعی طور پر 604 ملین روپے کا قرضہ لیا گیا تھا جس میں بلجیم کے 221 ملین اور کنشوریم کے 383 ملین روپے بھی شامل ہیں قرضہ واپس کرنے کی مدت 13 سال ہے گوادر کی بندرگاہ 1700 میٹر لمبی 60 فٹ چوڑی اور اس کی گہرائی 3.5 میٹر ہے۔

○

بلوچستان کے ساحلی علاقے

بلوچستان بھی سندھ کی طرح سمندر کی نعمت سے مالا مال ہے اس کی مغربی اور شمالی سرحدیں افغانستان سے ملتی ہیں یہ صوبہ چھ ڈویژنوں اور چھبیس اضلاع پر مشتمل ہے۔ رقبے کے اعتبار سے بلوچستان کا کچھ حصہ بحیرۂ عرب کے کنارے واقع ہے اس میں اور ماڑہ، پسنی، جیوانی، سونمیانی اور گوادر کی بندرگاہیں بھی واقع ہیں۔ ان بندرگاہوں اور کراچی کے درمیان موٹر لانچوں کے ذریعے آمدورفت ہوتی ہے۔ گوادر، پسنی اور جیوانی میں ماہی گیری کی صنعت خاص طور پر قابل ذکر ہے سونمیانی، بلوچستان کی سب سے قدیم بندرگاہ ہے۔ پسنی اور اوڑماہ کے درمیان کلمت بندر ہے جو ماہی گیری کے لیے محفوظ ترین ہے علاوہ ازیں چھوٹی بندرگاہوں میں گھنز، ہشیکاں، شالی، کپر، کارواٹ اور سر بندر شامل ہے۔ گوادر کی بندرگاہ بحری جہازوں کی دوسری بڑی پاکستانی پورٹ کہلاتی ہے گوادر کے ساحل سے تھوڑے فاصلے پر بین الاقوامی روٹ ہے جہاں سے ایران متحدہ عرب امارت، قطر، عمان، یمن، عراق، سعودی عرب، ایتھوپیا، صومالیہ اور کینیا کی ساری بحری ٹریفک گذرتی ہے گوادر سے چند میل کے فاصلے پر تحصیل جیوانی ہے جہاں سے بندرگاہ عباس کی روشنیاں نظر آتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بلوچستان کا ساحل سندھ کے مقابلے میں صاف ستھرا ہے گڈانی کا ساحل مقامی لوگوں کے لیے ہی نہیں بلکہ کراچی کے لوگوں کے لیے تفریح گاہ ہے۔ لیکن یہاں تفریحی سہولتیں نہیں ہیں۔ گڈانی کو ماضی میں ایشیاء کا سب سے بڑا شپ بریکنگ یارڈ ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا۔ گڈانی شپ بریکنگ کا آغاز 1968ء میں ہوا یہ علاقہ تقریباً 135 ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا ہے 1968ء سے 1988ء کا عرصہ شپ بریکنگ یارڈ کے عروج کا زمانہ تھا اور یہاں 20 سے 40 ہزار مزدور کام کرتے تھے۔ حکومت بلوچستان نے 16 ستمبر 1979ء کو بلوچستان شپ بریکنگ انڈسٹری کے قوانین کا نفاذ کیا اور علاقے میں سڑکوں کا جال بچھایا۔ 1968ء

سے اب تک یہاں بے شمار بحری جہاز توڑے جا چکے ہیں۔

بلوچستان کا ساحلی علاقہ بنجر ہے یہاں زراعت کے امکانات معدوم ہیں اور صرف ماہی گیری ہی ممکن ہے یہاں کے ساحل پر شرقاً غرباً جب سے جیوانی تک ماہی گیروں کے کل 35 قصبے ہیں۔ جن میں انکی کل آبادی کا اندازہ پانچ لاکھ ہے 1970ء تک صرف اوڑمارہ، پسنی اور گوادر میں چند ڈاک خانے تھے۔ 1970ء کے آواخر میں گوادر اور پسنی کو ٹیلی فون کی سہولت میسر آئی اور 1988-89 میں انہیں قومی ڈائلنگ سسٹم سے منسلک کیا گیا۔ 1991ء میں گوادر میں پہلی فیکس سروس شروع ہوئی۔

صوبہ بلوچستان سیاحوں کے لیے بے حد کشش رکھتا ہے اس اہمیت کے پیش نظر 1967ء میں وزارت سیاحت نے کوئٹہ میں اپنا سب ریجنل آفس قائم کیا جس کے فرائض میں سیاحوں کی بہتر رہنمائی کرنا شامل تھا۔ مارچ 1970ء سے یہ فرائض وفاق کے زیر اہتمام نوتشکیل شدہ ادارے پاکستان ٹورازم ڈویلمنٹ کارپوریشن نے سنبھال لیئے۔ وزارت سیاحت کی مالی امداد سے حکومت بلوچستان نے لورالائی، گوادر، ڈیرہ مراد جمالی، گڈانی، اور دارلبندین میں ہی سیاحوں کے لیے ریسٹ ہاؤس قائم کے لیے ہیں۔ علاوہ ازیں گڈانی اور گوادر کے ساحلی مقامات پر آبی تفریح گاہوں کے قیام، ژوب میں سیاحتی سہولتوں کی ترقی کے منصوبے زیرغور ہیں۔

بلوچستان کوسٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے اکاؤنٹس آفیسر اور اتھارٹی کے ڈائریکٹر کے پرئیوایٹ سیکرٹری نعیم خان، صوبے کے ساحلی علاقوں کی ترقی کے حوالے سے کہتے ہیں کہ بلوچستان کا 770 کلومیٹر پر مشتمل ساحل آلودگی سے پاک ہے اس صوبے میں کی جانے والی ڈیپ سی فشنگ کا 90 فی صد مال کراچی سے بیرون ملک برآمد کیا جاتا ہے اور دس فی صد مقامی طور پر فروخت کیا جاتا ہے ان کے مطابق صوبے میں ساحلی شاہراہ کی تعمیر سے علاقے ہی میں نہیں بلکہ پورے ملک میں خوشحالی آئے گی۔

ان کے بہ قول مقامی حکومت ساحلی پٹی پر سات جگہ چھوٹے چھوٹے فش ہاربر قائم کر رہی ہے اس سلسلے میں گڈانی پر قائم کیے جانے والے فش ہاربر کا 85 فیصد کام مکمل ہو چکا ہے اس منصوبے کو حکومت پاکستان کی منظوری کے لیے بھیج دیا گیا ہے اور اس سلسلے میں سرمائے کی فراہمی کا کوئی

مسئلہ نہیں، مزید یہ کہ گوادر میں جاپان کے تعاون سے ایک میرین کالج تعمیر کیا جائے گا جس کی منظوری مل چکی ہے۔ گوادر کو فری پورٹ قرار دیئے جانے کے فیصلے کے بعد یہاں کی زمین سونا ہوگئی ہے اور زمین کا وہ ٹکڑا جو پہلے ایک لاکھ روپے میں ملتا تھا اب دو کروڑ روپے میں بھی نہیں ملتا۔

سال 2002ء میں حکومت پاکستان نے سائنس و ٹیکنالوجی کے فروغ و ترقی کے لیے بلوچستان کے ساحلی علاقوں میں ہوا کو ناپنے کے لیے منصوبوں کا آغاز کیا اور ہوا کے ذریعے پیدا کی جانے والی توانائی کی مدد سے ساحلی علاقوں کے دیہات کو بجلی فراہم کرنے کا منصوبہ تشکیل دیا اور مکران کے ساحلی علاقوں کے ساتھ ''کے ٹی بندر'' سے لے کر ''جیوانی'' تک کے علاقے کو ''کوسٹل فائبز'' کے منصوبے سے منسلک کر کے کام کا آغاز ہوا۔

روزنامہ نوائے وقت۔ سنڈے سپیشل 2002ء

○

کھیر تھر نیشنل پارک، ضلع خضدار

سندھ کے مغرب میں اور جھلاوان (ضلع خضدار) کے جنوب مشرق میں کوہ کھیر تھر کراچی سے شمال کی طرف واقع ہے کچھ لوگوں نے کھیر تھر کی لمبائی 130 میل لکھی ہے جو محض ان کا اندازہ ہے ورنہ یہ سلسلہ پانچ سو کلومیٹر پر مشتمل ہے محققین کہتے ہیں کہ کھیر تھر قدیم ترین پہاڑوں میں سے ایک ہے کوہ وقاف کا جڑواں ہے کھیر تھر ایک پرانی تہذیب کا حامل بھی ہے خصوصاً اس کے مشرق میں وادی باجک میں ماقبل تاریخ کے آثار ملے ہیں۔ اس طرح باجک کے علاوہ گورک، کچرک، اور بارک نام کی مماثلت کے علاوہ اپنے سینے کے دفینوں میں قدیم تہذیبوں کے آثار رکھتے ہیں۔

کھیر تھر کا پہاڑی سلسلہ تقریباً بنجر اور غیر آباد ہے لمبی لمبی پہاڑیاں ایک دوسرے کے متوازی شمال سے جنوب تک پھیلی ہوئی ہیں ان کے بیچ میں تنگ وادیاں بھی ہیں اس علاقے میں بارش ہوتے ہی پانی تیزی سے جنوب کا رخ کرتا ہے کچھ وادیاں ایسی بھی ہیں جہاں پانی ٹھہر جاتا ہے ایسے علاقوں میں آبادی بھی ہے اس کے رکے ہوئے پانی کا ذائقہ خراب ہوتا ہے کیونکہ اس میں معدنیات کی خاصی آمیزش ہوتی ہے۔

اس پہاڑی سلسلے کے شمال میں کچھ مری قبائل آباد ہیں مگر ان کا الحاق جھل کے مگسیوں کے ساتھ ہے جنوب میں زیادہ تر جاموٹ اور چھٹہ قبائل بسے ہوئے ہیں جو جگدالی زبان بولتے ہیں کہیں کہیں پر حجتک خانہ بدوش معہ اپنے مال کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے ہیں وادی گاج ساسولیوں کی ملکیت ہے ان کے جنوب میں کھدرانی، (خدارنی) جام بورو (جمبورو) کے علاقہ میں آباد ہیں۔ کھیر تھر کے بالکل جنوب یعنی لوپ اور بھراج کا علاقہ جمالیوں کا ہے۔ کھیر تھر نیشنل پارک میں جنگلی حیات کی ایک سو زائد اقسام پائی جاتی ہیں۔ کھیر تھر کی پہاڑیوں میں چیتا،

بھالو، لگڑ بگڑ، جنگلی بکرا، دُنبہ، بھیڑیا اور لومڑ پہلے عام تھے اب ان کی تعداد خاصی کم ہوگئی ہے بوچستان میں کھیرتھر اور پب کا علاقہ ایسا ہے جہاں بھالو پایا جاتا ہے اس کا گذارہ جنگلی بیر اور پیش (مزری) کے پتوں پر ہے علاقہ چونکہ گرم ہے اس لیے تیتر بھی مل جاتے ہیں دریاؤں میں مچھلی خاصی مقدار میں پائی جاتی ہے۔

یہ پہاڑ زیادہ تر ننگے ہیں مگر پھر بھی اونچی ڈھلوانوں پر زیتون کے درخت ہیں وادیوں میں پیش (مزری) اور ببول کے درخت عام ہوتے ہیں زیادہ تر لوگ پیش (مزری) کے پتے اکھٹا کر کے یا پھر ببول کی لکڑیاں کاٹ کر سندھ لے جاتے ہیں اس طرح ان کی بسر اوقات ہوتی ہے اسی طرح ''کھو'' کے درخت جو بہت وزن دار اور مضبوط ہیں اور اس کی لکڑی کافی قیمتی ہے مگر افسوس کہ لوگ ان لکڑیوں کو جلا دیتے ہیں۔

کھیرتھر کو'' کاروجبل'' بھی کہا جاتا ہے جبکہ ابوالفضل نے اس کا نام'' کہتر'' لکھا۔ کھیرتھر کا پہاڑ دو رنگوں پر مشتمل ہے اس کا ایک حصہ کالا ہے لہٰذا اس کا نام کاروجبل ہوا اور دوسر رنگ سفید ہے لہٰذا کیرتھر یعنی دودھ رنگ کہا گیا۔ کھیرتھر سے ملحقہ کئی اور پہاڑ بھی ہیں جن کے نام یوں ہیں ناری، آمرو، ھاشم، ٹکریو، بھٹ، بڈڑو، لکی، سیہی، گنڈ، ڈمبر، داپھڑی، للیان، ارسرجانہ وغیرہ۔

کھیرتھر ایک دیوار ہے جو بلوچستان اور سندھ کے درمیان ہے لہٰذا صدیوں سے دونوں علاقوں کے درمیان آنا جانا ہے کھیرتھر میں گزرگاہیں ہیں جن کو'' لک'' کہا جاتا ہے اور فارس میں ''درہ'' کہتے ہیں۔ کھیرتھر گزرگاہیں یہ ہیں۔ ہرباب، شک، لونی، روہیل، گاڑ، دارنگ، دراوت، کوٹو، ٹھوٹھو، پھوسی، لوڑھ، گوراگ، کچرگ، بارگ، کھوری، ڈارھیارو، اور لاکھانی اس کے علاوہ ونگو بھی ہے جو میٹھر سے خضدار جانے والی ٹریفک کی گذرگاہ ہے۔

کھیرتھر نیشنل پارک رقبے کے لحاظ سے ہنگول کے بعد اب پاکستان کا دوسرا بڑا نیشنل پارک ہے جسے معدومی کے خطرے سے دوچار جانور سندھ آئی بیکس کے تحفظ کے لیے 31 جنوری 1974ء میں سندھ وائلڈ لائف پروٹیکشن آرڈیننس مجریہ 1972ء کے تحت محفوظ علاقہ قرار دیا گیا۔ تحفظ ماحول کی عالمی تنظیم آئی یو سی این کی درجہ بندی کے مطابق کھیرتھر پارک، نیشنل پارک کے زمرے

میں آتا ہے۔کھیر تھر نیشنل پارک کا انتظام وانصرام سندھ کے محکمہ جنگلی حیات کے سپرد ہے پارک کا رقبہ 3 ہزار 87 مربع کلومیٹر یا 3 لاکھ 8 ہزار 7 سو 33 ہیکٹر ہے یا ایک ہزار 192 مربع میل کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ پارک کی حدود کے باہر 5 کلومیٹر کی بفرزون میں جنگلی حیات کا شکار قانونی طور پر ممنوع ہے اور پارک میں قوانین کے خلاف کسی بھی انسانی سرگرمی پر پابندی عائد ہے تاہم پارک کی حدود میں آباد مقامی باشندے وسائل سے پارک کے قوانین کے مطابق محدود استفادہ کا حق رکھتے ہیں۔

کراچی سے شمال کی جانب سپر ہائی وے پر سفر کرتے ہوئے کراچی سے 80 کلومیٹر کی دوری پر جب ہم اچانک بائیں ہاتھ کی پختہ سڑک پر مڑتے ہیں تو دراصل کچھ آگے چل کر ہم پارک کی حدود میں داخل ہو رہے ہوتے ہیں تاہم پارک کی مرکزی قیام گاہ کرچات سینٹر کراچی سے 160 کلومیٹر شمال میں واقع ہے پارک کے جنوب میں محل کوہستان وائلڈ لائف سنکچری، مشرق میں سورجان، سمبک ایری، ہوتھیانو گیم ریزرو، جنوب مغرب میں حب ڈیم وائلڈ لائف سنکچری جبکہ شمال مشرق میں اس کی سرحد صوبہ بلوچستان سے جا کر ملتی ہے پارک کا تقریباً ایک چوتھائی کراچی کے ضلع ملیر جبکہ باقی رقبہ ضلع دادو کی تحصیل تھانہ بولا خان پر مشتمل ہے۔

دنیا بھر میں معدومی کے خطرے سے دوچار جنگلی حیات پر مشتمل آئی یو سی این کے 2000ء کے جائزے ریڈ لسٹ میں شامل 17 جانداروں کی اقسام کھیر تھر نیشنل پارک میں پائی جاتی ہیں جن میں آئی بیکس، اڑیال، چنکارہ، گیڈر، پینگولن، (چیونٹی خور) لومڑی، چراخ یا لگڑ بھگڑ، جنگلی بلی، جنگلی چوہا، سیاہ گوش، لیوپرڈ یا تیندوا اور رینگنے والے جانداروں کی اقسام میں کالا ناگ شامل ہیں ۔اس سرخ فہرست میں موسم سرما میں پارک میں آنے والا موسمی پرندہ تلور، آبی پرندہ Sociable Plover، کالا گدھ، سفید ہشت سندھی گدھ اور Harrier Pied شامل ہیں۔

2000ء میں پارک میں جانوروں اور جنگلی حیات پر کرائے گئے سروے کے مطابق پارک میں جانوروں کی 277 اقسام پائی گئی ہیں جبکہ پرندوں کی 203 اقسام ریکارڈ کی گئی ہیں ان میں سے چھ پرندے پارک میں نئی دریافت ہیں۔ رینگنے والے جانوروں کی 34 اقسام ریکارڈ

کی گئیں جن میں سے 3 ایسے ہیں جو خشکی وتری دونوں جگہ پر پائے جاتے ہیں۔ بنیادی جائزے Base Line Study سے موسوم اس سروے کے مطابق ان کل 34 رینگنے والے جانوروں کی اقسام میں سے 7 کھیرتھر نیشنل پارک میں پہلی مرتبہ پائی گئی ہیں۔

کھیرتھر وادی کے لیے نیشنل پارک کا درجہ اور آئی بیکس لازم وملزوم ہیں۔ کھیرتھر نیشنل پارک میں آئی بیکس 3300 فٹ تک بلند پہاڑی چوٹیوں پر پائے جاتے ہیں۔ اڑیال اس سے قدرے کم بلند پہاڑی ڈھلوانوں پر جبکہ چنکارا یہاں کے قدرتی نالوں کے پاس گذر بسر کرتا ہے۔ 2000ء کے بنیادی جائزے کے دوران فضائی سروے کے ذریعے شمار کیے گئے جانوروں میں سندھ آئی بیکس 13000، اڑیال 10000، اور چنکارا ہرن 1200 کی تعداد میں موجود ہیں۔

محکمے کے ذرائع بتاتے ہیں کہ چند سال پہلے تک پارک کے محفوظ شدہ جانوروں میں شرح پیدائش 150 فیصد تک تھی جن میں سے 30 فی صد بچے بالعموم سن بلوغت تک پہنچ جاتے تھے تاہم گذشتہ چند سالوں میں خشک سالی، خوراک، اور پانی کی کمی کے اثرات نوزائیدہ بچوں کی شرح نمو میں کمی کی صورت میں سامنے آئے ہیں کھیرتھر پارک کی نباتاتی اقسام کو Sahara Sindax بائیو جیوگرافکس ریجن میں شامل کیا جاتا ہے جو کہ شمال مشرقی افریقہ سے لے کر سندھ اور پنجاب کے صحرائی اور خشک تر پتھریلے علاقوں تک پھیلی ہوئی ہے لیکن نباتات کے لحاظ سے یہ علاقہ خاصا محروم واقع ہوا ہے پاکستان میں پائی گئی نباتات کی 5600 اقسام میں سے سندھ میں 1000 اقسام پائی جاتی ہیں جن میں سے 600 اقسام کھیرتھر کی زینت ہیں۔ سرکاری اعداد وشمار کے مطابق طویل ترین رقبے پر مشتمل نیشنل پارک کی 70 فی صد زمین سرکاری ہے جبکہ 30 فی صد کے لگ بھگ نجی ملکیت ہے لیکن زیر کاشت رقبے کا بڑا حصہ سرکاری ملکیت ہے جائزے کے مطابق نیشنل پارک میں 58 ہزار ہیکٹر سے زائد رقبہ زیر کاشت ہے جو مون سون کی بھرپور بارش کی صورت میں ایک لاکھ ہیکٹر کے قریب جا پہنچا ہے 2000ء کے آخر میں کیے گئے غیر ملکی ماہرین کے جائزے کے مطابق پارک کی حدود میں آباد مکینوں کی ملکیت میں 50 ہزار بکریاں، 15 ہزار بھیڑیں یا 9 ہزار بھینسیں، گائے، بیل، 2 ہزار گدھے اور ایک ہزار اونٹ شامل ہیں ان جانوروں کی چرائی سے پارک کا ایک

لاکھ پچاس ہزار ہیکٹر رقبہ متاثر ہونے کا خطرہ ہے۔

کھیر تھر نیشنل پارک کی وادی کروڑوں سال کی تاریخ، ارضیاتی اتار چڑھاؤ اور متعدد تہذیبوں کے ارتقاء کی امین ہے اور خاموش کھڑے پہاڑ ان کے گواہ، ماہرین ارضیات کا دعویٰ ہے کہ 53 ملین سال پہلے یہ علاقہ بحیرہ عرب کا حصہ تھا تاہم آہستہ آہستہ ارضیاتی تبدیلیوں کے نتیجے میں سمندر پیچھے ہٹتا چلا گیا اور خشکی نمودار ہوتی گئی۔ زیر آب ہونے کے آثار آج بھی کھیر تھر پہاڑی سلسلے میں موجود چٹانوں پر رکازات کی شکل میں ان دعوؤں کی تصدیق کے لیے کافی ہیں۔

پہاڑی سلسلے میں 87 تاریخی مقامات کی نشاندہی کی گئی ہے جن میں سے چند اہم ترین مندرجہ ذیل ہیں۔

متحجر جنگلات

کھیر تھر پارک میں Petrified Wood کے بے شمار ذخائر ملتے ہیں اور رانی کوٹ کے مضافات میں ان کا ایک پورا جنگل دفن ہے یہ جنگل کبھی زندگی کی طرح شاد آباد تھے لیکن ارضیاتی تبدیلیوں نے انہیں زمین میں دفن کر دیا اور پھر ہزاروں برس زمین میں دفن رہنے کے باعث جغرافیائی تغیرات اور موسمی اتار چڑھاؤ نے لکڑی طبعی خاصیت تبدیل کر کے انہیں پتھرا دیا۔ متحجر لکڑی دیکھنے میں بالکل لکڑی کی مانند محسوس ہوتی ہے لیکن اس کی تمام خصوصیات پتھر کی ہوتی ہیں متحجر لکڑی پارک کی ارضیاتی تبدیلیوں کا ایک اور اہم ثبوت ہے۔

کیر تھر پارک میں تاریخ کے شواہد اور آثار ماضی کے سربستہ راز افشاء کرنے کی دعوت دے رہے ہیں تاہم انہیں سامنے لانے کے لیے کثیر سرمائے اور حکومت سمیت عالمی اداروں کی توجہ کی ضرورت ہے تا کہ تاریخ انسانی کا عظیم ورثہ علم کے صفحات پر لایا جا سکے۔

رانی کوٹ قلعہ

خشک، بنجر، اور سنگلاخ پہاڑوں پر 29 کلومیٹر کے لگ بھگ احاطے کو اپنی بانہوں میں لپیٹتی

اور بل کھاتی یہ طویل القامت دیواریں تاریخ کے گمنام قلعے کی فصیلیں ہیں جس پر کبھی دیوار چین کا گمان گزرتا ہے۔ لیکن رانی کوٹ کو ایک نظر میں سمجھ لینا ممکن نہیں۔ قلعے کے معمار حکمران، اس میں رہائش پذیر تہذیبوں کا تعلق اور قیام کے مقاصد بھی ابھی تک قلعے کی قدامت کی طرح سربستہ راز ہیں۔ رانی کوٹ بھی دراصل قلعے کا نام نہیں کھیر تھر پارک میں واقعہ اس مقام کا نام ہے جہاں پر یہ قلعہ موجود ہے خود رانی کوٹ بھی تاریخ کے صفحات میں کئی ناموں سے جانا جاتا ہے۔

وادی تو نگ کے منقش مقبرے

کرچات سینٹر سے تقریباً 15 کلومیٹر کی دوری پر تو نگ کے جام لوہار قبرستان میں ''منقش مقبرے'' موجود ہیں زرد پتھروں پر تراش کر نقش و نگار تیار کیے گئے ان سہ منزل مقبروں کا موزانہ چوکھنڈی اور مکلی میں پائے گئے منقش مقبروں سے با آسانی کیا جاسکتا ہے ان مقبروں میں مدفون افراد کے زمانہ تاریخ کا تعین فی الحال نہیں کیا جاسکا ہے تاہم مقبرہ پر بنائے گئے نقوش سے ان کے مراتب کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے مقبروں پر بنائے گئے نقوش میں سب سے زیادہ نمایاں چیز تاج ہے جو اسے شاہی قبرستان کی حیثیت قرار دلواتا ہے۔

کوہ تراش

کھیر تھر پارک میں کرچات سینٹر سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر واقع کوہ تراش کی وادی آج بھی انسانی تہذیب کو اپنے دامن میں لپیٹے ہوئے ہیں کوہ تراش فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں تراشنے والوں کا پہاڑ۔ پہاڑ اور اس کے نواح میں 3500 قبل از مسیح کے انسانی تہذیب کے آثار ملے ہیں یہ آثار ایک مکمل آبادی اور تہذیب کے بھرپور شواہدات فراہم کرتے ہیں۔

کھیر تھر پارک کا علاقہ جغرافیائی لحاظ سے خشک خطوں میں شمار کیا جاتا ہے اور بنیادی طور پر یہ علاقہ بارانی رہا ہے تاہم یہاں پر سالانہ بارش کا اوسط 6 سے 8 انچ رہا ہے۔ 1994ء سے یہ علاقہ مکمل طور پر خشک سالی کا شکار ہے۔ پہاڑوں پر سے گھاس پھونس، ترائی میں درختوں سے سبزہ اور

موسمی ندی نالوں میں پانی خشک ہو گیا ہے اور صورتحال بدتر ہو چلی ہے۔

محتاط اندازے کے مطابق کھیر تھر نیشنل پارک کے 96 فیصد سے زائد رقبے پر محیط ہے اور پارک کو عالمی حیثیت کے حامل ہونے کے علاوہ ملکی قوانین کے تحت بھی تحفظ حاصل ہے سندھ وائلڈ لائف آرڈیننس کے تحت کھیر تھر نیشنل پارک کی حدود میں کسی بھی قسم کی کھدائی، کان کنی یا کسی بھی مقاصد کے استعمال کے لیے زمین کی صفائی یا ہمواری جیسے اقدامات پر پابندی عائد ہے صوبائی حکومت کے ایک اور حکم مجریہ 1970ء کے مطابق پارک میں تیل و گیس کے لیے کان کنی خصوصی طور پر ممنوع ہے۔

مظاہر فطرت کے تحفظ کے لیے قائم نیشنل پارک لوگوں کی معلوماتی تفریح کا اہم ذریعہ ہوتے ہیں لیکن کھیر تھر نیشنل پارک فروغ سیاحت کے ذمے دار اداروں کی فہرست میں شامل ہونے کے باوجود ماحولیاتی سیاحت سے دلچسپی رکھنے والوں کی نظروں سے اوجھل ہے اس کی بنیادی وجوہات مناسب طعام و قیام کی سہولتوں کا فقدان اور کچے راستوں پر سفر کے لیے مناسب نشانوں کی عدم موجودگی بھی شامل ہیں۔ اگر سندھ وائلڈ لائف ڈیپارٹمنٹ اور حکومت سندھ فروغ سیاحت سے متعلق اداروں کے تعاون سے کرچات تک پہنچنے کے لیے پختہ سڑک، سیاحوں کے لیے مناسب کرائے پر قیام و طعام اور گارڈن کی فراہمی اور بجلی کے لیے شمسی توانائی کا پلانٹ استعمال کریں اور فروغ سیاحت کے لیے ذرائع ابلاغ کی مدد سے مہم چلائیں تو کھیر تھر نیشنل پارک سیاحت کے فروغ کی بہترین مثال بن سکتا ہے۔

پہاڑی سلسلوں سے بھرے ہوئے اس نیشنل پارک میں میدانی علاقے بھی ہیں اور بنجر علاقے بھی ہیں تاہم گھنے جنگلات نہ ہونے کے برابر ہیں۔

تحریر: مختار آزاد۔ بشکریہ NCS جریدہ جنوری، فروری، مارچ 2001ء، کراچی

○

چلتن ہزار گنجی نیشنل پارک، کوئٹہ

کوئٹہ سے 20 کلومیٹر کے فاصلے پر کوہ چلتن کے دامن میں ایک ایسا وسیع وعریض علاقہ ہے جسے ''ہزار گنجی'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔اس علاقے کی سب سے بڑی خاصیت تو یہ ہے کہ یہ دنیا کا پہلا اور واحد جنگلی حیات کا ایسا علاقہ ہے جو اس شہر سے قریب ہے جنگلی حیات کے احیاء اور بقاء کے لیے دنیا بھر میں اس اصول کو اپنایا گیا ہے کہ محل وقوع پرسکون، آلودگی سے پاک اور شور و شر سے محفوظ ہو کیونکہ جانور کوئی بھی ہو بہر حال اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ پرسکون ماحول میں رہے اس کی نشوونما ہوتی رہے اور جنگلی حیات کے دشمنوں سے محفوظ رہے۔

ہزار گنجی پارک میں انتہائی قیمتی جونیپر کے درخت ہیں اور ایسی ہزاروں خودرو جڑی بوٹیاں ہیں جو ایلوپیتھک اور ہومیو پیتھک ادویہ کے کام آتی ہیں مثلاً یہاں بخار کے لیے ایک اکسیر بوٹی ہے جسے مقامی زبان میں کلپورا کہا جاتا ہے یہی کال پول کے نام سے بخار کے لیے نہایت کامیاب دوا کے طور پر مارکیٹ میں برسوں سے موجود ہے اس طرح بسکو پان ہے جو مقامی بوٹی آئسو نائیڈ سے تیار کی جاتی ہے غرضیکہ ایسی لاتعداد جڑی بوٹیاں ہیں جو یہاں موجود ہیں ان میں بہت سے بوٹیوں پر تحقیق بھی کی جا رہی ہے۔

ہزار گنجی میں چلتن مارخود بھی ملتا ہے جو دنیا بھر میں اپنی نوعیت کا واحد مارخور ہے غیر ملکی مردہ مارخور کے سر کی قیمت چار لاکھ روپے بخوشی ادا کرتے ہیں مردہ مارخور (مکمل) کی قیمت تو چھ سات لاکھ روپے تک پڑتی ہے مارخور کو مقامی محکمہ جنگلات نے برسوں کی محنت کے بعد تحفظ دیا ہے۔
جونیپر کے درختوں کو بھی بڑی مشکل سے تحفظ ملا ہے یہ درخت سال بھر میں ایک ڈیڑھ انچ بڑھتا ہے مگر لوگ اسے بیدردی سے کاٹ کر تباہ کر رہے ہیں۔زیارت میں گیس نہ ہونے کی وجہ سے ان درختوں کو بری طرح ''قتل'' کیا جا رہا ہے یوں ایشیا بھر میں جونیپر کا یہ سب سے بڑا جنگل اپنی

حیثیت سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔ 1555 ایکڑ پر محیط ہزار گنجی نیشنل پارک میں کالا اور پیلا گوبر اور دوسرے سانپ، بھیڑیئے، لومڑیاں، گیدڑ، جنگلی بلیاں، بندر سے مشابہہ ایک جانور افغان کچھوے اور چکور خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ کسی وقت یہاں لگڑ بگڑ جیسے خونخوار جانور بھی پائے جاتے تھے جو شکاریوں کے شوق کے سبب ناپید ہو گئے۔ مارخوروں کے علاوہ جنگلی دنبے بھی ہیں اور سی سی (خار دار چوہا) بھی یہاں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ مارخور کے بارے میں کچھ باتیں قابل ذکر ہیں۔ یہ کہ دنیا بھر میں صرف پاکستان میں اور یہاں بھی صرف بلوچستان کے علاقہ کوہ چلتن میں پایا جاتا ہے۔ مارخور کو تحفظ دینے کے لیے محکمہ ء جنگلات کو بہت جتن کرنا پڑے۔ تاہم محکمہ جنگلات وائلڈ لائف فنڈ اور نواب غوث بخش رئیسانی (مرحوم) نے جہاں تک ممکن ہو سکا ان شکاریوں کے خلاف مزاحمت کی اس پارک کا عقبی حصہ نواب غوث بخش رئیسانی مرحوم کی ذاتی ملکیت تھا۔ انہوں نے اس وسیع علاقے سے صرف قومی سطح پر دلچسپی کے تحت دستبرداری اختیار کی اور اس علاقے کو جنگلی حیات کے لیے مختص کر دیا۔ 1980ء میں ہزار گنجی کو نیشنل پارک کا درجہ دیا گیا تھا۔ اس وقت کل 80 یا 90 مارخور رہ گئے تھے۔ ایک وقت تو وہ بھی آیا جب یہ تعداد صرف 15 تھی اور صرف پاکستان میں پائے جانے والے اس جانور کی نسل دنیا سے ناپید ہونے کو تھی۔ بہر حال نیشنل پارک قرار دیئے جانے کے بعد یہاں دو ریسٹ ہاؤس اور ایک جنگلی حیات کا عجائب گھر بنائے گئے۔

پہاڑی دنبے کو اڑیال کہا جاتا ہے یہ خاصا بھاری ہوتا ہے اس کے سینگ بھی بڑے ہوتے ہیں غیر ملکی شائقین اڑیال کے سر کی قیمت تقریباً ایک لاکھ روپے دینے پر تیار رہتے ہیں۔ اس کے سر کی شلیڈ بنا کر ڈرائنگ روم میں سجائی جاتی ہے بہر حال وائلڈ لائف کے تعاون سے ان جانوروں کو اب کچھ تحفظ ملا ہے اور یہاں ڈیڑھ سے زائد مارخور موجود ہیں۔

ایک اور جانور سی سی یا سیہہ یا خار پشت کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہتے ہیں کہ اس کا خار دار گھر میں دفن کر دیا جائے تو گھر میں فساد پڑ جاتا ہے۔ یہ جانور یہاں خاصی تعداد میں موجود ہے اس کی اپنی نفسیات ہے یہ اپنا گھر بہت عجیب و غریب طریق سے بناتا ہے پہلے پہل یہ اپنے گھر کے لیے جگہ کا انتخاب کرتا ہے اس کے بعد اتنے دائرے میں آہستہ آہستہ چلتا ہے اور پیشاب کرتا

جاتا ہے اس طرح اس کے گھر کی چار دیواری کا تعین ہو جاتا ہے ان حدود کے اندر اس کا کوئی ہم جنس داخل ہونے کی جرأت نہیں کرتا۔ ہر سیہہ یا خار پشت اس دائرے کے اندر ہی بچوں کی پرورش کرتا ہے۔ مارخور نہایت حساس جانور ہے جو شور برادشت نہیں کرتا۔ اس طرح نسل کی افزائش رک جاتی ہے ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کی عمر صرف دس سے پندہ سال ہوتی ہے بڑھاپے کی عمر کو پہنچنے پر مارخور کے دانت جھڑنے لگتے ہیں بنیائی کمزور ہو جاتی ہے قدرتی طور پر وہ کھانے سے محروم ہوتا چلا جاتا ہے اس کی جگالی ختم ہو جاتی ہے پھر کہیں گر کر مر جاتا ہے مارخور پہاڑوں پر راستے کے بغیر جیسی مہارت سے اترتا چڑھتا ہے اس کا تصور بھی ممکن نہیں۔ مارخور کے سینگ بہت بڑے اور بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔

ہزار گنجی میوزیم میں بلوچستان کے دوسرے علاقوں میں پائے جانے والے جانوروں کو حنوط کر کے رکھا گیا ہے ان میں قلات کا چیتا، مارخور، اڑیال، پہاڑی دنبہ، لومڑی گیدڑ، ہرن، سہیہ، کونج، مور، سانپ، شتر مرغ، اور اس کے انڈے، عقاب، شاہین، چکور، تیتر، تکور اور دوسرے بہت سے جانور اور پرندے موجود ہیں بہر حال اس وسیع نیشنل پارک کے لیے ابھی بہت کام ہونا باقی ہے تاکہ اس کا قدرتی حسن بحال رہے۔ مارخور کو پہاڑوں کے اوپر پانی نہیں ملتا۔

مارخور بکرے سے قریباً دوگناہ جسامت کا جانور ہے اس کی شکل بکرے کی طرح ہے اسے مارخور اس لیے کہتے ہیں کہ یہ سانپ بہت شوق سے کھاتا ہے حالانکہ یہ مفروضہ غلط ہے یہ قطعی طور پر سبزی خور جانور ہے۔ البتہ سانپ کا دشمن ہے سانپ کا مقابلہ کرتا ہے اور اس پر اپنے سم سے حملہ کر کے اسے ہلاک کر کے دم لیتا ہے سات سے دس مارخوروں میں ایک نر مارخور ہوتا ہے یعنی ایک نر کے مرنے سے بیک وقت دس مادہ مارخور بیوہ ہو جاتی ہیں اور کئی بچے یتیم ہو جاتے ہیں مستزاد کہ بیوہ ہونے والی مادہ مارخور پھر زندگی بھر دوسرے نر کے ساتھ نہیں رہتی۔

پہاڑ کے دامن میں جگہ جگہ ان کے لیے پانی کے چھوٹے چھوٹے حوض بنائے گئے ہیں جہاں بہت نیچے سے پانی پمپ کر کے ان تک پہنچایا جاتا ہے مارخور دن بھر سوتا ہے اور عصر کے وقت باہر نکلتا ہے مغرب کے بعد نیچے اترتا ہے اور پانی پی کر سیر ہوتا ہے۔ طاقتور مشینوں کے ذریعہ پانی اوپر لے جایا تو اسے آسانی ہوگی۔ پورا علاقہ غیر ہموار، سنگلاخ اور چٹیل پہاڑی سلسلے پر

مشتمل ہے جو ڈیڑھ ہزار میٹر سے لے کر تین سو میٹر تک بلند ہے۔ پارک کا رقبہ 156 مربع کلومیٹر ہے علاقے کی آب و ہوا انتہائی سخت ہے گرمیوں میں درجہ حرارت 40 سینٹی گریڈ تک ہوتا ہے اور سردیوں میں منفی 20 درجہ سینٹی گریڈ تک گر جاتا ہے بارش بہت کم ہوتی ہے جو اوسطاً 225 ملی میٹر سالانہ ہے زیادہ تر بارش موسم سرما میں دسمبر اور مارچ کے درمیان ہوتی ہے جبکہ پہاڑ کی چوٹیوں پر برف جمی رہتی ہے۔ 1980ء میں نیشنل پارک قرار دیئے جانے کے بعد جنوب کے نشیبی علاقے کی حدود کے ساتھ خاردار تاروں کی مضبوط باڑھ کھینچ دی گئی ہے۔ نیشنل پارک میں اب تک 225 اقسام کی نباتات کی شناخت کی گئی ہے۔

تحریر: ایس ایم سید

ہنہ جھیل، کوئٹہ

بلوچستان کے صوبائی دارالحکومت کوئٹہ سے 8 کلومیٹر کے فاصلے پر بلند پہاڑوں کے درمیان ایک خوبصورت قدرتی جھیل واقع ہے۔ اسے ہنہ جھیل کہتے ہیں۔ یہ جھیل اور اس کا خُوبصورت ساحل کوئٹہ کے شہریوں اور دُور دراز سے آنے والے سیاحوں کے لیے ایک دلکش قدرتی سیاحتی مرکز ہے یہاں ہر موسم میں مقامی اور بیرونی سیاحوں کا ہجوم رہتا ہے۔

ہنہ جھیل، کے چاروں جانب اُونچے اُونچے پہاڑ ہیں ان کے درمیان یہ جھیل ایک بہت بڑے پیالے کی طرح پھیلی ہوئی ہے موسم سرما میں ہونے والی بارش اور برف باری کی بدولت یہ جھیل سارا سال پانی سے بھری رہتی ہے اس پانی سے زرعی فوائد حاصل کرنے کے لیے جھیل کا پانی اس کے اطراف پھیلے ہوئے کھیتوں اور پھلوں کے باغات تک پہنچایا جاتا ہے اس طرح اس جھیل کو سیاحت کے ساتھ ساتھ زراعت اور باغ بانی کے لحاظ سے بھی اہمیت حاصل ہے۔

ہنہ جھیل اپنی نوعیت اور شکل وصورت کے لحاظ سے شمالی علاقے کی مشہور جھیل سیف الملوک سے ملتی جلتی ہے لیکن اسے جھیل سیف الملوک کی طرح خوبصورت درختوں اور سبزے سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں والا ماحول میسر نہیں، اس کے اطراف میں پھیلے ہوئے بھورے اور مٹیالے پہاڑ، درختوں اور سبزے سے محروم ہیں اس کمی کو دور کرنے کے لیے ہنہ جھیل کے کنارے شجرکاری کی گئی ہے چنانچہ وہاں کافی تعداد میں کوئٹہ پان، چنار اور ایش کے درختوں کے علاوہ پھلدار درخت بھی لگا دیئے گئے ہیں جس کی بدولت ماحول خوبصورت ہوگیا ہے مقامی اور بیرونی سیاحوں کے لیے اس کی دلکشی میں اضافہ ہوگیا ہے۔

دائرے کی شکل میں پھیلی ہوئی اس قدرتی جھیل کا رقبہ تقریباً ساڑھے 7 مربع کلومیٹر ہے اس کے درمیان میں ایک چھوٹا سا مصنوعی جزیرہ قائم کیا گیا ہے جو ٹیلے کی شکل کا ہے اس کی چوٹی پر

نگرانی کے لیے ایک چھوٹی سی عمارت تعمیر کی گئی ہے اس سے جھیل کی خوبصورتی میں اضافہ ہو گیا ہے بڑی سڑک سے ہنہ جھیل تک پہنچنے والی سڑک یہاں آ کر ختم ہو جاتی ہے۔ سڑک اور جھیل کے درمیان خوبصورت جنگلہ لگایا گیا ہے اصل جھیل سڑک سے تقریباً 30 فٹ نیچے واقع ہے سڑک اور جھیل کے درمیان پھیلی ہوئی ڈھلوان پر سیاحوں کے لیے سیڑھیاں اور راہداریاں بنائی گئی ہیں اس جگہ لوگوں کے بیٹھنے کے لیے کئی سبز مقامات قائم کیے گئے ہیں ایک پرانا پختہ سائبان بھی ہے۔

ہنہ جھیل کو ایک قدرتی سیر گاہ اور سیاحت کے مرکز کے طور پر ترقی دینے کا پروگرام بنا تو فوجی انتظامیہ کی نگرانی میں ہنہ جھیل کا ایک باضابطہ ترقیاتی ادارہ قائم کر دیا گیا۔ اس ادارے نے جھیل کے اطرف میں سیاحوں کے آرام اور تفریح کے دوسرے انتظامات پر توجہ دینے کے ساتھ ساتھ جھیل کی صفائی کا بھی انتظام کیا، چنانچہ بڑی جدوجہد سے جدید مشینوں کے ذریعہ خطرناک جھاڑیوں اور دلدلی مٹی کو صاف کیا گیا۔ اس طرح غرقابی کا خطرہ ختم ہو گیا اور جھیل پیراکی کا شوق رکھنے والوں کے لیے توجہ کا مرکز بن گئی۔

ہنہ جھیل میں کشتی رانی کا انتظام بھی کیا گیا ہے لیکن نجی کشتیاں چلانے کی بجائے ہنہ جھیل کے ترقیاتی ادارے ہی کے زیر اہتمام کشتیاں اور موٹر بوٹس چلائی جاتی ہیں جو سیاحوں کو جھیل کی سیر کراتی ہیں اور اُس کے وسطی جزیرے تک بھی لے جاتی ہیں۔

ہنہ جھیل پر ہر موسم میں سیاحوں کا ہجوم رہتا ہے گرمیوں میں لوگ یہاں کے نسبتاً سرد اور خوشگوار ماحول سے لطف اندوز ہونے کے لیے آتے ہیں اور سردیوں میں برف باری کے نظارے کے لیے یہاں کا رخ کرتے ہیں کیونکہ برف باری کے موسم میں اس جھیل کی دلکشی بڑھ جاتی ہے سیاحوں کے اس ہجوم کی بناء پر یہاں کی جانے والی سرمایہ کاری منافع بخش ثابت ہو سکتی ہے لیکن اب سے پہلے اس طرف توجہ نہیں دی گئی۔

اب ہنہ جھیل پر آنے والے سیاحوں کے لیے ہوٹل کا قیام عمل میں آ چکا ہے بچوں کے لیے نہایت عمدہ تفریحی پارک اور کئی اقسام کے جھولے فراہم کر دیئے گئے ہیں اس کے علاوہ بھی بچوں اور بڑوں کی تفریح اور کھیل کود کے وافر انتظامات کیئے جا چکے ہیں۔ اور سیاحوں کو موسم کی شدت، بارش برف باری اور تیز دھوپ وغیرہ سے بچ کر آرام کرنے کی سہولتیں بھی فراہم کی گئی ہیں۔

ان تمام سہولتوں کی وجہ سے ہنہ جھیل کو اب بڑی حد تک ایک مکمل تفریح گاہ اور اچھے سیاحتی مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے جس کے باعث یہاں سیاحوں کی آمد میں بھی کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے تاہم اسے مزید ترقی دینے کی گنجائش اب بھی موجود ہے لاتعداد مقامی اور غیر ملکی سیاح ہنہ جھیل کی قدرتی خوبصورتی اور خوشگوار فضاء کی بنا پر شہر کے ہنگاموں سے دور اس پُرسکون اور پُرفضا مقام پر چند روز قیام کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں اگر ان سیاحوں کے لیے یہاں ایک بڑا ہوٹل یا چند اقامتی کاٹیج تعمیر کر دیئے جائیں تو ہنہ جھیل کی دلکشی میں اضافہ ہو جائے گا۔ یہاں دن رات سیاحوں کا ہجوم لگا رہے گا اور کوئٹہ کے شہریوں کو بھی ان کی تمنا کے مطابق ایک ایسی خوشگوار جگہ حاصل ہو جائے گی جہاں وہ اختتام ہفتہ کی تعطیل سکون سے گزار کر تازہ دم ہو سکیں گے۔ ہنہ جھیل کے ترقیاتی ادارے نے جس توجہ اور سرگرمی سے اس جھیل کو ترقی دی ہے اس کی روشنی میں اُمید کی جا سکتی ہے کہ یہ ادارہ یہاں مزید سہولتوں کی فراہمی اور موٹل اور کاٹیج انڈسٹری کے فروغ کا سبب بنے گا۔

○

میرانی ڈیم

میرانی ڈیم واپڈا کے وضع کردہ ویژن 2025ء کے تحت مکمل کیا گیا، ڈیم بلوچستان کے دارالحکومت کوئٹہ کے جنوب مغرب میں 380 میل جبکہ تربت شہر کے مغرب میں 30 میل کی مسافت پر میرانی گاؤں کے قریب دریائے کیچ اور دریائے نہنگ کے اتصال سے بننے والے دریائے دشت پر تعمیر کیا گیا ہے میرانی ڈیم 200 سال کے اعداد وشمار کو مدنظر رکھتے ہوئے آنیوالا سیلابی پانی ذخیرہ کرنے کی غرض سے ڈیزائن کیا گیا ہے ان اعداد وشمار کے مطابق عام حالات میں آنے والا سیلاب میرانی جھیل میں پانی کی سطح 264 فٹ تک بلند کرتا ہے تاہم میرانی ڈیم میں 10 سال کے دوران ایک مرتبہ متوقع سیلاب کی بنیاد پر 276 فٹ کی بلندی تک پانی ذخیرہ کرنے کی صلاحیت موجود ہے اسی صلاحیت کی بناء پر حالیہ سیلاب میں میرانی جھیل میں پانی کی سطح 271.4 فٹ تک بلند ہوئی اور اس دوران ڈیم مکمل طور پر محفوظ رہا جو اس کا بین ثبوت ہے کہ میرانی ڈیم کے ڈیزائن کی بنیاد بالکل درست ہے اور یہ ڈیم زیادہ سے زیادہ ممکنہ سیلاب کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے یہ امر قابل ذکر ہے کہ میرانی ڈیم کا ڈیزائن بین الاقوامی طور پر مسلمہ مقامی اور غیر ملکی ماہرین نے تشکیل دیا ہے ڈیزائن کے حتمی انتخاب کے لیے فول پروف طریقہ کار اختیار کیا گیا نتیجتاً تعمیر ہونے والا ڈیم قابل تعریف ہے حالیہ سیلاب کے دوران پانی کی آمد 8 لاکھ کیوسک سے بھی زائد رہی اور ڈیم سے زیریں جانب صرف ساڑھے تین لاکھ کیوسک پانی خارج کیا گیا جبکہ ڈیم میں جمع ہونے والے اس پانی کا اثر بالائی جانب زیادہ سے زیادہ 24 کلومیٹر تک ہوسکتا تھا اس لیے یہ واضح ہے کہ میرانی ڈیم نے سیلاب سے بچاؤ میں اپنا کردار نہایت کامیابی کے ساتھ ادا کیا ہے میرانی ڈیم تربت کے نواح میں بلوچستان کے مکران ریجن میں واقع ہے تربت عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے لغوی معنی گور، قبر یا مزار کے ہیں روایت کے مطابق تربت نامی بستی میں آبادی کا آغاز ایک قبر یا قبرستان کی تعمیر سے ہوا۔ بلوچستان کے تناظر میں ایک خاصا بڑا اور زندگی

سے بھرپور شہر آج بھی تربت کے نام سے موسوم ہے تربت، کیچ مکران کی لازوال رومانوی داستان سسی پنوں کا امین، روایتی محبت کے انمٹ کرداروں کا مدفن ہے ذکری قبیلے کا کوہ مراد بھی اس شہر کے نواح میں واقع ہے تربت کی خاص سوغات اس علاقے میں بکثرت پیدا ہونے والی کھجور ہے جو ذرائع آمدورفت مفقود ہونے کے باعث فی الحال مقامی لوگوں کے لیے کوئی خاص منفعت بخش نہیں۔

تربت سے 30 میل غربی سمت میرانی گاؤں واقع ہے گاؤں کی وجہ تسمیہ کے بارے میں مقامی لوگ دلچسپ واقعہ بناتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ سینکڑوں برس قبل ایران سے آنے والا نہنگ دریا سسی پنوں کی آرام گاہ سے گزر کر ذرا آگے بہتا تو سنگلاخ پہاڑوں پر مبنی ایک اونچی دیوار اس کا راستہ روک لیتی اور دریائے نہنگ کی لہریں اس سے ٹکرا کر رہ جاتیں کوہستانی دیوار کے اس پار بسنے والے لوگ کوسوں دور سے آتے اور اپنی ضروریات زندگی کے لیے پانی حاصل کرتے ان ہی میں سے ایک جری جوان مدت تک پہاڑ کاٹتا رہا اور بالآخر اس نے پانی کے اخراج کے لیے راستہ بنالیا جب راستہ بن گیا تو ایک روز اسی پہاڑی کٹاؤ سے گر کر ہلاک ہو گیا۔اس مرد جفاکش کا نام میران تھا اس کی موت کے بعد لوگوں نے گاؤں کا نام میرانی رکھ دیا جو آج بھی اسی طرح چلا آ رہا ہے اس واقعہ کی اگرچہ کوئی ٹھوس تاریخی شہادت نہیں ملتی تاہم حسن اتفاق دیکھئے کہ میرانی ڈیم اس پہاڑی کٹاؤ پر ہی تعمیر کیا گیا ہے۔

ڈیم پر تعمیراتی کام کا آغاز یکم جولائی 2002ء کو ہوا۔مٹی سے تعمیر ہونے والے اس ڈیم کی اونچائی 127 فٹ،لمبائی 3 ہزار 3 سو 50 فٹ ہے پانی ذخیرہ کرنے کی مجموعی استعداد 3 لاکھ 2 ہزار ایکڑ فٹ ہے اور اس آبی ذخیرے سے ایک لاکھ 52 ہزار ایکڑ فٹ پانی آبپاشی اور دیگر مقاصد کے لیے استعمال میں لایا جا سکتا ہے ڈیم کا نظام آبپاشی دائیں اور بائیں جانب نکلنے والی دو پختہ نہروں پر مشتمل ہے رائیٹ بنک کینال 20 ہزار 8 سو ایکڑ جبکہ لفٹ بنک کینال سے 12 ہزار 4 سو ایکڑ اراضی سیراب ہو سکتی ہے ایک اندازے کے مطابق میرانی ڈیم کے 33 ہزار 2 سو ایکڑ کمانڈ ایریا میں فصلیں کاشت کرنے کی اوسط صلاحیت 85 فیصد تک پہنچ جائے گی۔میرانی ڈیم پراجیکٹ مقامی لوگوں کے لیے ہر دو لحاظ سے سودمند ہے۔اس کی تکمیل سے نہ صرف زرعی مقاصد کے لیے پانی میسر ہوا ہے بلکہ بلاواسطہ اور بالواسطہ روزگار کے مواقع بھی فراہم آئے ہیں۔ بلوچستان کی متنوع آب و ہوا غذائی اجناس،سبزیوں اور خاص طور پر پھل کی پیداوار کے لیے انتہائی موزوں سمجھی جاتی

ہے زراعت اس صوبے کی اہم معاشی سرگرمی ہے اور یہاں کی افرادی قوت کا کم وبیش 67 فیصد زرعی شعبے اور اس سے متعلقہ سرگرمیوں سے وابستہ ہے میرانی ڈیم اس زرعی معاشی سرگرمی کو ایک نفع بخش پیشے کے طور پر تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کریگا ڈیم کے آبی ذخیرے میں ماہی پروری کے باعث غذائی ضروریات کے لیے ایک ہزار ٹن مچھلی دستیاب ہو سکے گی علاقے میں افزائش حیوانات کے ساتھ ساتھ غلہ بانی کو بھی فروغ حاصل ہوگا۔ میرانی ڈیم پر کام کے آغاز کے ساتھ ہی علاقے کے اندر انفراسٹرکچر میں زبردست تیزی آئی۔ تربت سے میرانی ڈیم کی سائیٹ تک 30 میل طویل بہترین معیار کی پختہ سڑک تعمیر کی گئی ہے سڑک بن جانے سے پراجیکٹ کے لیے درکار ساز وسازمان کی نقل وحمل کے علاوہ پورے علاقے کو آمدورفت کی سہولت میسر آ گئی ہے۔ میرانی کو گوادر بندرگاہ سے ملانے کے لیے مزید 100 میل لمبی سڑک بھی مکمل طور پر تیار ہو چکی ہے یوں پورے مکران ریجن کی رسائی گوادر کی بین الاقوامی منڈی تک منسلک ہو چکی ہے تربت سے میرانی کا سفر جو کبھی 2 سے 3 گھنٹے کی دشوار اور صبر آزما ڈرائیونگ پر محیط تھا اب محض نصف گھنٹے کی سہل دوری پر ہے ڈیم کے آبی ذخیرے سے بھرپور استفادہ کے لیے سپر نکلر اور ڈرپ اری گیشن کی تربیت کے لیے ماڈل فارم کو پراجیکٹ کے لازمی جزو کے طور پر بنایا گیا ہے اس فارم پر زراعت سے وابستہ مقامی لوگوں کو لیبیا اور دیگر کئی ممالک کی طرز پر آبپاشی کے جدید طریقوں سے روشناس کرایا جارہا ہے۔ تا آنکہ کم سے کم پانی استعمال کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ اراضی سیراب کی جا سکے۔

رپورٹ: طالب آفریدی
روزنامہ ''ایکسپریس''

○

درون نیشنل پارک، لسبیلہ قلات ڈویژن

بلوچستان جہاں اپنے جغرافیائی، سیاسی، معدنی، تاریخی اور تہذیبی لحاظ سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ وہاں دلفریب، خوبصورت، سحرانگیز اور پرکشش مقامات کے لیے بھی مشہور ہے اس وجہ سے سال بھر سیاحوں کے علاوہ مقامی لوگ بھی ان تفریح گاہوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

بلوچستان میں کئی تفریح گاہیں ہیں جن میں زیارت۔ ہزار گنجی چلتن نیشنل پارک، ہربوئی کے جنگلات، ہنگول نیشنل پارک، زنگی ناور جھیل، حب ڈیم وغیرہ قابل ذکر ہیں لیکن اس وقت صرف ایک تفریح گاہ درون نیشنل پارک کا تذکرہ مقصود ہے۔

درون نیشنل پارک، لسبیلہ شہر کے مغرب میں 115 کلومیٹر کے فاصلے پر سب تحصیل جھاہو ضلع آواران قلات ڈویژن میں واقع ہے۔ یہ نیشنل پارک، پاکستان کا دوسرا بڑا نیشنل پارک ہے اس کے شمال میں کوہاڑندی، جنوب میں دریائے ہنگول مشرق میں دریائے آراء اور مغرب میں دریائے نال واقع ہیں۔ اس نیشنل پارک کی سب سے اونچی چوٹی کا نام ''سرکوہ'' ہے جو 5185 فٹ بلند ہے اس چوٹی پر ہندوستان سے فرار ہونے والے بادشاہوں اور شہزادوں نے ایک واچ پاور بنوایا تھا تاکہ ان کے تعاقب میں آنے والوں کی نگرانی کی جا سکے اس ٹاور کے مقام سے لسبیلہ ''اوتھل'' اور کراچی کے اکثر علاقہ کو دیکھا جا سکتا ہے یہ ٹاور اب بھی خستہ حالت میں موجود ہے۔

سابق وزیر اعلیٰ سردار عطاء اللہ مینگل نے اپنے دور اقتدار میں اس علاقے کے 300667 ہیکٹر رقبے کو گیم سینکچری ایسا علاقہ جہاں جنگلی حیات کا شکار نہ کیا جا سکے بنوایا تھا اور باقی علاقے کو شکارگاہ کی حیثیت سے باقی رکھا تھا تاکہ شکاری قانونی طور پر شکار لائسنس پر شکار کھیل سکیں۔ 1988ء میں درون کے تمام علاقے کو جس کا رقبہ 167,700 ہیکٹر ہے حکومت بلوچستان نے نیشنل پارک قرار دے دیا نیشنل پارک اس علاقے کو کہا جاتا ہے جہاں قدرتی مناظر، نباتات اور حیوانات وغیرہ کو ان کی قدرتی حالت میں محفوظ رکھنا مقصود ہو۔

درون نیشنل پارک میں سراح بکرا، اڑیال، چنکارہ ہرن، خرگوش، جنگلی مور، بجو، چیتے، بھڑیئے، جنگلی بلی، چیتا بلی، لومڑی، گیدڑ چرخ اور پرندوں میں تیتر، سیسی، کوہی، کبوتر، زرگٹ وغیرہ ملتے ہیں اژدھے، زہریلے سانپ، گوہ اور مور خور بھی ہیں کئی مقامات پر دریاؤں اور چشموں میں مہاشیر مچھلی بھی پائی جاتی ہے۔

وحشی جانوروں میں چیتے کی مرغوب غذا پہاڑی بکرے اور اڑیال کا گوشت ہے مگر یہ درندے بعض اوقات مقامی لوگوں کے پالتو جانوروں پر بھی حملہ آور ہوتے ہیں۔

نباتات

نباتاتی لحاظ سے چونکہ علاقہ پہاڑی ہے اور بارش بہت کم ہوتی ہے لہٰذا زیادہ تر پودے اور درخت نالوں کے کناروں پر پائے جاتے ہیں چشموں کے آس پاس اچھی خاصی زرخیز زمینیں موجود ہیں۔

''بہار اور مون سون کے موسم میں خودرو جنگلی گھاس کافی تعداد میں اگ آتی ہے درون نیشنل پارک میں کچھ ایسے مقامات بھی ہیں جہاں خودرو جنگلی کھجوروں کا جنگل ہے ایسے مقامات کو مقامی لوگ کلکلہتے ہیں جب کھجور کے پیڑوں پر پھل آتا ہے تو پہاڑی بکرے ان پر چڑھ کر ان کے دانے (کھجور) کھاتے ہیں۔ یہ بڑا دلکش نظارہ ہوتا ہے اور کھجوروں کے پکنے کے موسم میں شائقین یہ نظارہ درون دپ، مچھلی، بھلو، جوگڑ توک، باز آپی، گزوری سیلہ گری، ولی کے مقامات پر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔

روایتی اور تاریخی مقامات

درون نیشنل پارک انتہائی دلچسپ، اور پراسرار مقامات اور روایات کے لیے مشہور ہے۔ بیلہ سے درون جاتے ہوئے لکھ جاہو کے مقام پر راستے میں شیریں فرہاد کا مقبرہ ہے سرکوہ یعنی ختہ ٹاور تک جانے کا راستہ نہایت دشوار گزار ہے ایک مقام پر تیس چالیس فٹ عمودی چٹان کو اسی کی مدد سے ہی عبور کیا جا سکتا ہے مقامی لوگوں نے وہاں رسی اور تار لٹکا رکھی ہے اور دینی کچھو، ایک تل اور چاکہ کور کے مقامات پر شبہ غیب کے نام سے زیارت گاہیں موجود ہیں سیر کوہ کے مقام پر ہندوستان سے فرار ہونے اور شکست خوردہ بادشاہوں اور شہزادوں کا بنوایا ہوا ٹاور ہے کروچھب کے مقام پر

ایک چٹان پر ایک گھوڑی اور اس کے بچے کے پاؤں کے نشانات موجود ہیں اس کے علاوہ بعض مقامات پر کمان کے تیر نظر آتے ہیں۔ بری کے مقام پر ایک قبرستان ہے جسے گبروں آتش پرستوں کا قبرستان کہا جاتا ہے اس کی قبروں کے سرہانے مختلف سمتوں میں ہیں۔ ہنکینی بینٹ کی ایک چٹان پر چھوٹے بچے کے پاؤں کے نشانات ہیں۔ کچکول کے مقامات پر کچکول نما تالاب ہے جہاں پہاڑی بکرے پانی پینے آتے ہیں یہ تالاب سوفٹ سے بھی زیادہ گہرا ہے لاکرو کے مقام پر ایک بڑا اژدھا ہے جہاں لوگ ڈر اور خوف سے نہیں جاتے یہ اژدھا دور سے ایک اونٹ کے بچے کی مانند نظر آتا ہے کنڈی کے مقام پر ایک پہاڑی سے ہر سال گرمیوں کے موسم میں گڑگڑاہٹ کے ساتھ شعلے نکلتے ہیں اور ہلکے پیلے رنگ کا لاوا دور دور تک پھیل جاتا ہے اس پہاڑ کے قریب سے گذرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ٹرک چل رہا ہو۔

باشندے

درون نیشنل پارک میں بلوچوں کا عمرانی قبیلہ آباد ہے جن کا زیادہ تر گزارہ مویشی پال کر اور کچھ کا گزارہ مرری کی فروخت پر ہے مرری یہاں کافی مقدار میں پائی جاتی ہے جس سے چٹائیاں وغیرہ بنی جاتی ہیں۔ نیشنل پارک کے اندر کل سترہ گھرانے ہیں جن کی افراد کی تعداد ایک سو دس ہے۔

اس وقت حکومت بلوچستان ان سترہ گھرانوں کو جو درون نیشنل پارک کے اندر مقیم ہیں جنگلی جانوروں اور پرندوں کی نشوونما کی خاطر کہیں اور منتقل کر دے تو یہ ایک مثالی نیشنل پارک بن جائے گا۔

بلوچستان میں تین نیشنل پارک ہیں۔ ہنگول، درون اور ہزار گنجی چلتن۔

سہ ماہی NCS جریدہ

○

کچھ اِدھر اُدھر سے

ورلڈ پرفارمنگ آرٹس فیسٹول

رفیع پیرتھیٹر نے پرفارمنگ آرٹس کی ترقی اور فروغ کے لیے اپنی سرگرمیوں کا آغاز پچیس برس قبل کیا تھا ان سرگرمیوں کا اہم پہلو ورلڈ پرفارمنگ آرٹس فیسٹول کا انعقاد ہے ورلڈ پرفارمنگ آرٹس فیسٹول کے انعقاد کا سلسلہ 25 برس سے جاری ہے اس ضمن میں رفیع پیرتھیٹر ورکشاپ کے اراکین جن میں عثمان پیرزادہ، فیضان پیرزادہ، صادان پیرزادہ، سلمان پیرزادہ، عمران پیرزادہ، علینا پیرزادہ، تسنیم پیرزادہ اور دوسرے اراکین شامل ہیں ان کی کوششیں، قابل داد ہیں۔ اس ورلڈ پرفارمنگ آرٹس نے پچیس برس کے دوران پرفارمنگ آرٹس کے حوالوں سے خطہ کی سب سے بڑی تقریب کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔

ورلڈ پرفارمنگ آرٹس فیسٹول پاکستان کے ثقافتی مرکز لاہور اس حوالے سے پاکستان کی فن اور آرٹ کے شعبہ کی سب سے بڑی تقریب کی حیثیت حاصل کر چکا ہے اس تقریب کو بین الاقوامی اہمیت بھی حاصل ہو چکی ہے۔ ورلڈ پرفارمنگ آرٹس فیسٹول میں دنیا کے 85 سے زائد ممالک کے سولہ ہزار سے زائد فنکار حصہ لے چکے ہیں۔ یوں عوام کو اس فیسٹول کے توسط سے دنیا کے مختلف ملکوں کے آرٹسٹوں کی پرفارمنس کو دیکھنے، جاننے اور محظوظ ہونے کے مواقع میسر آتے ہیں۔ ان پرفارمنسز کے ذریعے ان کو تھیٹر، فلم، ڈانسز، میوزک، پتلی تماشوں اور دیگر حوالوں سے عالمی معیار کی تفریح حاصل کرنے کے مواقع میسر آتے ہیں۔ علاوہ ازیں پاکستانی آرٹسٹوں کو عالمی معیار کے آرٹسٹوں کے روابط سے پرفارمنگ آرٹس کے مختلف پہلوؤں کے ضمن میں جدید تقاضوں اور ضروریات کو جاننے اور سمجھنے کے مواقع بھی میسر آتے ہیں۔

رفیع پیرتھیٹر ورکشاپ کے اراکین اور عہدیداروں کا عہد ہے کہ عوام کو پرفارمنگ آرٹس کے مختلف فنون کے ذریعے پاکستانی عوام کو عالمی معیار کی تفریح مہیا کرنے کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔

رفیع پیر تھیٹر ورکشاپ، ورلڈ پرفارمنگ آرٹس فیسٹول کی سالانہ تقریب کے علاوہ سال کے دوران تھیٹر، فلم، میوزک، پتلی تماشوں اور ڈانسز وغیرہ کے ضمن میں بھی مختلف تقاریب کا انعقاد کرتا رہتا ہے جہاں عام آدمی کو صحت مند تفریح حاصل کرنے کے مواقع میسر رہتے ہیں لہٰذا رفیع پیر تھیٹر ورکشاپ جیسے اداروں کی ہر سطح پر حوصلہ افزائی اور پذیرائی کی جانی چاہیے۔ رفیع پیر تھیٹر ورکشاپ، برصغیر کے ممتاز اداکار، ڈرامہ نگار اور ڈائریکٹر رفیع پیر کی یاد میں اُن کی نئی نسل عمل میں لائی۔ رفیع پیر نے 19ویں صدی کے اوائل میں جرمنی اور انگلینڈ میں فلسفہ اور ڈرامیٹک آرٹس کے مختلف شعبوں جن میں ایکٹنگ، ڈرامہ نگاری اور ڈائریکشن شامل تھیں، اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد انڈین اکیڈمی آف ڈرامیٹک آرٹس میں ایکٹنگ، ڈائریکشن اور سکرپٹ رائٹنگ کی تعلیم و تربیت مہیا کرنے سے کیا تھا۔ رفیع پیر روایتی انڈین تھیٹر اور یورپ، امریکہ اور جرمنی کے تھیٹر کے حوالوں سے جدید ٹیکنیک کے امتزاج سے برصغیر میں اداکاری، ڈائریکشن اور سکرپٹ رائٹنگ کی نئی روایات واقدار کے بانی تھے۔ رفیع پیر کی جدید روایات کو اُن کے بیٹوں نے اُن کے انتقال کے بعد زندہ رکھا۔ رفیع پیر تھیٹر ورکشاپ اور اس کے تحت ورلڈ پرفارمنگ آرٹس فیسٹول اور دوسری تقریبات کا انعقاد اپنے والد کے مشن کو نہ صرف برقرار رکھنے بلکہ ترقی اور فروغ دینے کا مشن ہے۔

''فن اور فنکار'' عاشق چوہدری۔ ایڈیشن روزنامہ جنگ، لاہور

3 دسمبر 2008ء

جشن بہاراں

حکومت پنجاب کی نگرانی میں پارکس اینڈ ہارٹیکلچر اتھارٹی لاہور کے زیراہتمام ہر سال سالانہ جشن بہاراں فروری کے آخری ہفتے سے لے کر مارچ کے آخری ہفتے تک بڑے جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔ جیلانی پارک (ریس کورس پارک) میں جشن بہاراں کا باقاعدہ افتتاح، حکومت وقت کی کسی اعلیٰ اور معتبر شخصیت سے کروایا جاتا ہے اس موقع پر عوام کی تفریح کے لیے بہت سے رنگارنگ پروگرام ترتیب دیئے جاتے ہیں جن میں خصوصی بچوں کو بھی نمائندگی دی جاتی ہے۔ اس موقع پر پنجاب کا روایتی لوک رقص، روایتی پیتل بینڈ، آتش بازی، بازی گروں کے کرتب، روایتی کھانوں کے سٹالز، دستکارو ہنرمندوں کے دیدہ زیب سٹالز اور کتابوں کے سٹالز بھی شامل ہوتے ہیں۔

جیلانی پارک کے ساتھ ساتھ مینار پاکستان گلشن اقبال پارک اور نیشنل بینک پارک میں بھی جشن بہاراں کے سلسلہ میں فیسٹیول کا افتتاح ہوتا ہے۔ پی ایچ اے نے عوام کی تفریح اور بین الاقوامی مندوبین کے سامنے پاکستانی ثقافت کو بھرپور انداز میں پیش کرنے کے لیے دیگر صوبوں کے ثقافتی طائفوں کو بھی جشن بہاراں میں مدعو کیا جاتا ہے ان فنکاروں کے قیام وطعام کا بندوبست لاہور کی روایتی میزبانی کے عین مطابق کیا جاتا ہے۔ جشن بہاراں چونکہ بین الاقوامی فیسٹیول بن چکا ہے اور اسے دیکھنے بیرون ممالک سے بڑی تعداد میں سیاح آتے ہیں لہٰذا ہارٹی کلچر اتھارٹی اور لاہور میٹروپولیٹن کارپوریشن، شہر کو بڑی مہارت اور خوبصورتی سے سجاتے ہیں۔

لاہور میں داخل ہونے کے تمام راستوں مثلاً ایئرپورٹ، ریلوے اسٹیشن، راوی پل، مینار پاکستان، ٹھوکر نیاز بیگ، چونگی امرسدھو اور موٹروے ٹول پلازہ پر خوبصورت دروازے، مال روڈ، جیل روڈ اور مین بلیوارڈ گلبرگ میں بھی آویزاں کیے جاتے ہیں۔ دن کے وقت شہر کی خوبصورتی قدرتی پھولوں سے نمایاں ہوتی ہے جبکہ رات کے وقت کھمبوں، درختوں اور محرابی

دروازوں پر برقی آرائش دیکھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ فوڈ سٹریٹ گوالمنڈی، ٹورسٹ سٹریٹ پرانی انارکلی، ورثہ سٹریٹ فورٹ روڈ، جیل روڈ، مین بلیوارڈ گلبرگ اور سرکلر گارڈنز کا علاقہ خصوصاًرات کی روشنی میں خوبصورتی کے باعث اپنی مثال آپ نظر آتا ہے۔ ان دنوں لاہور آنے والی ایئر لائنز، ڈائیو وبس سروس، معروف ہوٹلز، ٹریول ایجنٹس، موٹروے ٹول پلازہ اور راوی پل پر مفت تحائف بھی تقسیم کیے جاتے ہیں جو بہار اور تاریخی ثقافت سے منسوب ہیں۔

جیلانی پارک، مینار پاکستان، گلشن اقبال پارک اور نیشنل بینک پارک میں بھی آنے والے شائقین کے لیے مفت موسیقی کے پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں۔ شہر کی بڑی اور مصروف شاہراہوں پر پھولوں سے بھری خوبصورت ٹوکریاں اور کیاریاں پھولوں سے پیار کرنے والے ناظرین کا دل موہ لیتی ہیں۔

ہارٹی کلچر اتھارٹی، عوام کی تفریح کے لیے بے شمار رنگا رنگ پروگرام ترتیب دیتا ہے جن میں مندرجہ ذیل پروگرام شامل ہیں:

افتتاح جشن بہاراں

ریس کورس پارک میں جشن بہاراں کا افتتاح، اس موقعہ پر عوام کے لیے زبردست میوزک پروگرام پیش کیا جاتا ہے۔ یہ فوڈ اینڈ کرافٹ فیسٹیول قریباً ایک ماہ جاری رہتا ہے۔

عسکری بینڈ کا مظاہرہ

ریس کورس پارک میں ہی پاکستان آرمی کے مختلف بینڈ نغماتی دھنوں سے عوام کو مسحور کرتے ہیں۔

پالتو پرندوں کی نمائش

پارک میں خوبصورت پالتو پرندوں کی نمائش بڑے اہتمام سے منعقد کی جاتی ہے جن میں بچے خصوصی دلچسپی لیتے ہیں۔

مقابلہ مصوری

پارک میں سکولوں کے بچوں کے مابین تاریخی ورثہ کے موضوع پر مقابلہ مصوری میں تمام سامانِ مصوری ''پی ایچ اے'' مہیا کرتا ہے۔ جن میں جیتنے والوں کو قیمتی انعامات دیئے جاتے ہیں خصوصی بچوں کی مہارت خصوصی طور پر قابل دید ہوتی ہے۔ تیار شدہ مصوری کی نمائش 23 مارچ تک ریس کورس پارک میں جاری رہتی ہے۔

بہاررقص

- بہاررقص کا پروگرام الحمرا ہال مال روڈ میں منعقد کیا جاتا ہے۔

موسیقی کا پروگرام

ٹورسٹ سٹریٹ انارکلی میں عوام کی مفت تفریح طبع کے لیے موسیقی کا رنگارنگ پروگرام پیش کیا جاتا ہے۔

ڈاگ شو

ریس کورس پارک میں جرمن شیفرڈ ودیگر خوبصورت پالتو کتوں کا مقابلہ منعقد کیا جاتا ہے۔

رنگ بہار

موسیقی کی محفل الحمرا ہال میں سجائی جاتی ہے۔

میوزک میگا نائٹ

میوزک میگانائٹ پروگرام الحمرا کلچرل کمپلیکس قذافی سٹیڈیم میں منعقد ہوتا ہے۔

مقابلہ آرائش گل

خواتین کالجز کے درمیان مقابلہ آرائش گل منعقد کروایا جاتا ہے۔

پتلی تماشہ

میلے میں ایک روز پتلی تماشہ ورکشاپ کا بھی انعقاد کیا جاتا ہے۔

لوک تھیٹر (ڈرامہ)

پنجاب کے مختلف اضلاع سے تعلق رکھنے والے علاقائی فنکار اوپن ایئر تھیٹر، باغ جناح لاہور میں عوام وخاص کے سامنے مختلف گروپس کی شکل میں اپنا اپنا لوک تھیٹر پیش کرتے ہیں۔

ملی نغمہ وٹیبلو پروگرام

ریس کورس پارک میں سکولوں کی بچیوں پر مشتمل فنکاروں کے ملی نغمے اور ٹیبلو مقابلے روز اس شو کا حصہ ہوتے ہیں۔سکول کے بچوں، والدین ودیگر شہری اور احباب کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔

انٹر کالج یونیورسٹی مقابلہ موسیقی

الحمرا ہال میں پیش کیا جاتا ہے۔

محفل سماع

اوپن ایئر تھیٹر باغ جناح لاہور میں منعقد کیا جاتا ہے۔

محفل موسیقی

اوپن ایئر تھیٹر باغ جناح لاہور میں موسیقی کی محفل کا انعقاد ہوتا ہے۔

لاہور پریڈ

پنجاب بھر کے سکول کے بچوں کے بنائے ہوئے فلوٹس، سجاوٹی بگھیاں، سکول بینڈز، سکیٹرز، سائیکلسٹ، بوائے سکاؤٹس، جھومر پارٹیاں، پنجاب کا روایتی پیتل باجہ اور علاقائی پہناووں میں

ملبوس بچوں پر مشتمل قابل دید پریڈ قذافی سٹیڈیم لاہور سے براستہ گلبرگ وجیل روڈ سے شروع ہو کر ریس کورس پارک میں پہنچ کر اختتام پذیر ہو جاتی ہے۔ خصوصی بچوں کے سکولوں کی خصوصی شرکت قابل دید ہوتی ہے۔

اختتامی تقریب

سٹی پریڈ کے اختتام کے فوراً بعد ریس کورس پارک لاہور میں تقریب تقسیم انعامات کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ جشن بہاراں کے بھرپور خوبصورت انعقاد کے دوران تمام مقابلہ جات کے فاتحین کو انعامات سے نوازنے کے لیے رنگارنگ تقریب منعقد کی جاتی ہے بعدازاں حاضرین کے لیے خوبصورت موسیقی پروگرام پیش کیا جاتا ہے۔

(بشکریہ PHA)

○

پارکس اینڈ ہارٹی کلچر اتھارٹی

ایک زمانے میں شہر کی آرائش اور باغات وغیرہ کی دیکھ بھال کے لیے قائم گلبانی و چمن آرائی کا شعبہ یعنی پارکس اینڈ ہارٹی کلچر ڈیپارٹمنٹ دو مختلف محکموں میں تقسیم تھا۔ ایک حصہ میونسپل کارپوریشن لاہور اور دوسرا لاہور ڈیلپمنٹ اتھارٹی کے پاس تھا ان دونوں محکموں میں ہارٹی کلچر کے چھوٹے چھوٹے شعبہ جات موجود تھے جو شہر کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے لیے ناکافی ہوتے جا رہے تھے۔

حکومت پنجاب نے اس شعبہ میں مزید بہتری لانے کے لیے پارکس اینڈ ہارٹی کلچر اتھارٹی (پی ایچ اے) کے نام سے اسے باقاعدہ ایک ڈیپارٹمنٹ کی شکل دی اس ادارے نے ستمبر 1998ء میں کام شروع کیا اور کامران لاشاری کو اس پہلا ڈائریکٹر جنرل مقرر کیا گیا تھا۔

ابتدائی دنوں میں اس محکمے کو صرف سڑکوں کے کنارے پودے وغیرہ لگانے تک محدود رکھا گیا۔ اس نے شہر کی پھولوں کی کیاریوں کو خوبصورت بنایا بعدازاں اس نے ان پھول کیاریوں کو باقاعدہ گرین بیلٹس کی شکل دینی شروع کی۔ اس کے ساتھ ساتھ لاہور کی خوبصورتی میں اضافہ کرنے کے لیے وسیع پارکوں اور گراؤنڈز کی تیاری کا سلسلہ شروع کیا اور لاہور شہر کے نمایاں چوراہوں پر خوبصورت فوارے بنوائے اس سے پہلے شہر میں جو فوارے تھے ان میں سے بھی بیشتر بند تھے بلکہ کئی ایسے بھی تھے جو بالکل خستہ حال ہو چکے تھے پی ایچ اے نے نہ صرف ان بند اور خراب فواروں کو ٹھیک کیا بلکہ مزید خوبصورت فواروں کا اضافہ کیا اور اس امر کو یقینی بنایا کہ یہ تمام فوارے ہر وقت ٹھیک اور جاری رہیں۔ پہلے شہر میں روڈ لینڈ سکیپنگ پر توجہ نہ دی جاتی تھی۔ پی ایچ اے نے نہ صرف اس پر توجہ دینی شروع کی بلکہ اس کو جدید خطوط پر استوار کیا اور اس کو سائنسی بنیادیں فراہم کیں۔

لبرٹی چوک لاہور کے دل کی حیثیت رکھتا ہے پی ایچ اے کے قیام سے قبل لبرٹی چوک میں

پھول فروخت کرنے والے ٹاٹوں اور چار پائیوں پر پھول رکھ کر فروخت کیا کرتے تھے مگر پی ایچ اے نے ان پھول فروخت کرنے والوں کو با قاعدہ جگہ فراہم کی جس سے نہ صرف ان لوگوں کو روزگار کے مواقع ملے بلکہ چوک کی خوبصورتی میں بھی اضافہ ہوا ہے اب لبرٹی آنے والوں کو با قاعدہ فلاور شاپس سے پھول دستیاب ہوتے ہیں۔ پی ایچ اے نے چوبرجی، کلمہ چوک، مینار پاکستان اور دیگر کئی اہم چوراہوں کو روشن کیا اور کئی تاریخی عمارات کو روشن کرنے کے انتظامات کئے جیل روڈ گلبرگ، مال روڈ، پارک لین، فیروز پور روڈ سمیت تقریباً پچاس کلومیٹر راستہ پارکس اینڈ ہارٹی کلچر اتھارٹی کی کوششوں سے خوبصورت بنا۔

محکمے نے خواتین کے لیے فٹنس پوائنٹ اور ریس کورس پارک میں لابریری کارنر بنایا ہے جہاں خواتین الگ بیٹھ کر اخبارات اور رسالے وغیرہ کا مطالعہ کر سکتی ہیں۔ اس ادارے نے پاکستان اسٹیٹ آئل (PSO) کے تعاون سے سڑکوں پر نفیس قسم کے ڈائریکشن سائن بورڈ لگوائے خوبصورت بس سٹاپ تعمیر کروائے تاکہ بسوں وغیرہ کا انتظار کرنے والوں کو ایک اچھی جگہ میسر آ سکے۔ ان بس سٹاپ میں عوامی سہولت کے لیے پی سی او بھی لگوائے گئے۔

کھیلوں کی اہمیت کے پیش نظر لاہور میں خوبصورت گراؤنڈ بنائی گئیں اور ناگفتہ بہ حالت کے گراؤنڈز کی حالت بہتر بنانے کے لئے کام کیا گیا علاوہ ازیں 9 جمنیزیم تیار کروائے۔ شہر کے پسماندہ علاقوں کو اچھے علاقوں کے برابر تفریح کے مواقع فراہم کرنے کا بھی بندوبست کیا گیا۔ اس کی ایک مثال شاہدرہ کا سٹیڈیم ہے اس طرح موچی گیٹ میں فلڈ لائٹس کا قیام عمل میں لایا گیا پانی والا تالاب میں ہیلتھ کلب بھی قائم کیا گیا۔

مال روڈ پر واقع پرانی عمارتوں کی دلکشی کو رات کو بھی اجاگر کرنے کے لیے خوبصورت لائٹس کا خصوصی انتظام کیا گیا۔ ٹولنٹن مارکیٹ کو ماہر تعمیرات کی مشاورت سے اس کے اصل حسن پر نہایت عمدگی اور نفاست سے مزین کیا گیا اس کے پہلو میں پرانی انارکلی میں ایک ٹورسٹ سٹریٹ بھی بنائی گئی ہے جی پی او کے پاس کارٹ کارنر بھی بنایا گیا۔ ٹولنٹن مارکیٹ کی عمارت میں آرٹ اینڈ کرافٹس میوزیم کا قیام عمل میں لایا گیا یہاں اکثر اوقات فنون لطیفہ کے حوالے سے نادر و نایاب تصاویر کی نمائشوں کا با قاعدہ اہتمام کیا جاتا ہے۔

''نیا لاہور'' تحریر: محمد نعیم مرتضیٰ

○

میلہ اسپاں ومویشاں (نیشنل ہارس اینڈ کیٹل شو)

قومی یکجہتی کی علامت پاکستان کے خوبصورت رنگوں کا عکاس نیشنل ہارس اینڈ کیٹل شولاہور مین روایتی شان وشوکت اور احتشام سے منعقد کیا جاتا ہے جسے دیکھنے کے لیے ملک بھر سے لوگ اُمڈے چلے آتے ہیں بیرونی ممالک کے وفود بھی اس میلے میں شرکت کر کے بہت محظوظ ہوتے ہیں لاہور کا ذکر اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک نیشنل ہارس اینڈ کیٹل شور کا ذکر نہ کیا جائے۔

اس میلے میں سکولوں کے بچے انتہائی مہارت سے پاکستان کا نقشہ، قائداعظم کی تصویر قومی میلہ آمد بہار، پاکستانی پرچم، لاہور کے بچوں کوسلام، پاکستان پائندہ باد، ٹیں ریساں شہرلاہور دیاں جیسے خوبصورت الفاظ اس انداز میں بناتے ہیں کہ ان کو داد دیئے بغیر نہیں رہا جاسکتا یہ میلہ افزائش نسل حیوانات کو ترقی دینے کے ساتھ ساتھ ثقافتی ورثہ پر روشنی ڈالتا ہے میلے کی اس فضاء سے ملک کے لوگوں میں محبت کے جذبات پروان چڑھتے ہیں اور ہماری قومی زندگی کے ثقافتی اور معاشرتی رویوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ اس میں آرٹ اور کرافٹ کے اعلیٰ نمونے بھی پیش کیے جاتے ہیں یہ میلہ حکومت کے مختلف اداروں کے درمیان باہمی تعاون کی اعلیٰ مثال ہے اگر ہم اس کے بنیادی نقطے کی طرف آئیں تو اس رنگ برنگے میلے سے لوگوں کو دور دراز سے اکٹھا کرنے کا مقصد لوگوں میں باہمی اخوت اور بھائی چارے کے جذبات کو فروغ دینا ہے اس میلے میں جدید اور قدیم ثقافت کی آمیزش کا رنگ بھی جھلکتا ہے یہ میلہ تفریح کا اعلیٰ نمونہ بھی ہے جس میں پاکستان کے علاقائی کلچر اس کے ساتھ ہی پاکستان کو کونے کونے سے آئے ہوئے لوگ علاقائی رقص پیش کرتے ہیں

پاکستان کا نقشہ بناتے ہیں اور ڈانس کے دوران ہی پھول کی صورت میں تمام گراؤنڈ میں پھیل جاتے ہیں اس منظر کی اتنی کشش ہوتی ہے کہ پاکستان کے تمام شہروں سے لوگ اس قومی میلے میں شرکت کے لیے کھنچے چلے آتے ہیں۔ ہارس اینڈ کیٹل شو میں لوگوں کی شرکت کی وجہ سے مال روڈ تک ٹریفک کا بے حد رش ہوتا ہے جس کے لیے ہر سال ٹریفک پولیس خصوصی انتظامات کرتی ہے۔

اس میلے کی بنیاد میلہ اسپاں و مویشیاں جو پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں سال میں دوبار منعقد ہوتے ہیں افزائش نسل حیوانات میں ترقی ہی اس میلے کا بنیادی مقصد ہے۔ 1954ء میں پہلی مرتبہ لاہور فورٹریس سٹیڈیم میں اس طرح کے میلے کا انعقاد ہوا تھا عرصہ گذر جانے کے بعد بھی یہ میلہ روایتی طور پر اس جگہ منعقد ہوتا چلا آ رہا ہے بلکہ اس میں ہر سال کسی نہ کسی آئٹم کا اضافہ ہوتا رہا اب یہ میلہ قومی تہوار کی حیثیت اختیار کر گیا ہے جس میں ملک کے قرب و جوار سے لوگوں کو یکجا کر دیا گیا یہ قومی سطح پر قومی معیار کی پرکھ کے ساتھ ساتھ صنعت وزراعت کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتا ہے موجودہ دور میں سائنس کی ترقی سے جہاں قومی روایات ٹوٹتی جا رہی ہیں وہاں یہ میلہ پاکستان اور خاص طور پر پنجاب کے ثقافتی ورثے کی امانت کو اپنے دامن میں سموتا نظر آتا ہے اس میلے میں ہماری ثقافت کے ایسے ایسے کھیل پیش کیئے جاتے ہیں جن کا تذکرہ کتابوں اور روایتی کہانیوں میں ملتا ہے جنہیں ہم اپنی آنکھ سے دیکھ کر محظوظ ہو سکتے ہیں اس میلے میں بیل، گائے، گھوڑے، بھینس، بکریاں، اونٹ انتہائی خوبصورت انداز میں سجا کر لائے جاتے ہیں عوامی بینڈ کی دھنیں ہر طرف بہار کے نغمے بکھیر رہی ہوتی ہیں دن کا پروگرام جتنا خوبصورت ہوتا ہے رات کو اس سے زیادہ کشش ہوتی ہے رات کی تاریکی میں سینکڑوں رنگوں کی آتش بازی کا مظاہرہ دیکھ کر ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے نور کی کرنیں آسمان سے پھوٹ پھوٹ کر میلے پر برس رہی ہیں یہ منظر بڑا ہی سحر انگیز ہوتا ہے اس کو نہ صرف میلے میں شامل لوگ بلکہ دو تین کلومیٹر کے فاصلے پر کھڑے ہوئے لوگ بھی دیکھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں رات کی تاریکی میں بیٹریوں کی روشنی میں جب ٹیٹو شروع ہوتا ہے تو نہایت پرکشش نظارہ ہوتا ہے آرمی کے جوان انتہائی مہارت سے تیز رفتار طریقے سے موٹر سائیکلوں کے خطرناک کرتب دکھاتے ہیں سدھائے ہوئے کتے آگ کے

دائروں کو عبور کرتے چلے جاتے ہیں ٹیٹو شو انتہائی دلچسپ منظر پیش کرتا ہے اس میں روشنیوں اور آتش بازی کے نظارے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کہکشاں آسمانوں سے نیچے اتر کر ہر طرف نور بکھیر رہی ہو فوجی جوانوں کا جلتی شعلوں سے بسم اللہ اللہ اکبر پیارا پاکستان دفاعی قلعہ انتہائی شاندار ہوتا ہے اور اس کے خالق کو جتنی بھی داد دی جائے کم ہے رات کی تاریکی میں نیزہ بازی کے کرتب بھی حیران کن ہوتے ہیں بینڈ کی دھنیں نیم تاریکی میں دل کی دھڑکنوں کو تیز کر دیتی ہیں اس میلے کو صرف پاکستان ہی میں ایک سالانہ جشن کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی بلکہ یہ بین الاقوامی شہرت کا حامل جشن بن چکا ہے کیونکہ سلامتی فلوٹس کی مدد سے ملک کی تعمیر و ترقی اور صنعت و زراعت میں ہونے والے ترقی کے علاوہ مختلف علاقوں کی تہذیب و ثقافت سے بھی لوگوں کو روشناس کرایا جاتا ہے۔

تاریخی و ثقافتی شہر لاہور کا عوامی یا قومی میلہ اسپاں و مویشیاں اپنی طرز کا ایک منفرد میلہ ہے جس میں ملک کے چاروں صوبوں کو اپنی صنعتی و زرعی اور ثقافتی و ترقیاتی سرگرمیوں سے ایک دوسرے کو آگاہ کیا جاتا ہے جس سے پاکستان میں بھائی چارے اور قومی یکجہتی کو بڑی تقویت ملتی ہے یہ میلہ سرکاری طور پر پانچ یا چھ روز جاری رہتا ہے جبکہ عوام کی خواہش پر اس میلے کا خصوصی حصہ صنعتی و زرعی نمائش ایک ماہ تک جاری رہتی ہے اس دوران عوام کی بھاری تعداد نمائش سے اپنی ضروریات زندگی کی اشیاء خریدتے ہیں اور صنعتی و کاروباری اداروں کو شہر کا بھی ایک موثر ذریعہ حاصل ہو جاتا ہے میلے کے دنوں میں روزانہ دو شو منعقد ہوتے ہیں۔اور تفریحی پروگرام پیش کیے جاتے ہیں عوام کی دلچسپی کے پروگراموں میں ملٹری رینجرز اور پولیس کے محکمے نیزہ بازی اور پولو جیسی دلچسپ کھیلوں کے علاوہ بے شمار کرتب اور کارنامے دکھاتے ہیں نیز جسمانی کمالات مثلاً رسہ کشی، پیراشوٹ سے اترنا، طیاروں کا فضائی مظاہرہ، لوک رقص، مشعل پریڈ، ٹیٹو شو، اور دوسرے دلچسپ کھیلوں کے علاوہ بازی گر اپنے اپنے دیدہ زیب و حیرت انگیز مظاہرے پیش کرتے ہیں۔

میلے کے آخری روز مویشیوں اور جانوروں کی بہتری نسل یا ان کی اچھی کارکردگی پر ان کے مالکان اور دوسرے تفریحی و معلوماتی پروگرام میں بہترین کارکردگی دکھانے والے افراد یا اداروں کو

انعامات سے نوازا جاتا ہے جو کہ حکومت کی طرف سے بہتر خدمات اور اپنے مخصوص شعبہ میں منفرد کارکردگی کا منہ بولتا ثبوت ہوتے ہیں ہارس اینڈ کیٹل شو کے موقعہ پر صنعتی و زرعی نمائش میں زرعی آلات اور جدید مشینری کے سٹال بھی لگائے جاتے ہیں اور مختلف اجناس کی فصلوں کی مختلف اقسام کے نمونے اور ان کے بیج بھی رکھے جاتے ہیں جن میں دیہی عوام کافی دلچسپی لیتے ہیں اور لوگوں کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے کچھ عرصے سے زرعی نمائش میں پھلوں سبزیوں کے ساتھ ساتھ پھولوں کو بھی شامل کیا گیا ہے تاکہ شائقین ملکی و غیر ملکی پھولوں کی مختلف النوع اقسام سے آ گاہی حاصل کریں اور انہیں فروغ دینے پر توجہ دیں۔

مختصراً یہ قومی میلہ ہمارے بیش قیمت ثقافتی روایات کا امین ہے اور اس طرح کے میلے اجتماعی شعور بیدار کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

○

فوڈ سٹریٹ، لاہور

برس ہا برس کے بعد لاہوریوں کو حال ہی میں اپنے شہر لاہور میں وسیع تعداد میں اپنی پسند کے کھانوں کی سہولت میسر آئی ہے لاہور میں کھانوں کے حوالے سے پہلی اور نمایاں جس چیز کا اضافہ ہوا ہے وہ ''اکتوبر 2000ء'' میں لاہور کی فوڈ سٹریٹ ہے اس فوڈ سٹریٹ سے امیر وغریب دونوں یکساں طور پر لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ لاہور زندہ دلوں کا شہر ہے روایت ہے کہ اس شہر نے ہمیشہ سے مقامی و غیر مقامی لوگوں کو خوش آمدید کہا اور اپنے دامن میں جگہ دی۔ غیر ملکی و مقامی دونوں لاہور کے کھانوں کو پسند کرتے ہیں۔ فوڈ سٹریٹ کو نہ صرف لاہور میں پسند کیا گیا بلکہ اب کئی دوسرے شہر بھی اپنے ہاں ایسی ''فوڈ سٹریٹ'' قائم کرنے کی راہ ڈھونڈ رہے ہیں۔

لاہور گوالمنڈی کی ''فوڈ سٹریٹ'' میں مختلف کھانوں کی 84 دکانیں ہیں۔ اس تین سو فٹ لمبی گلی میں یک سو سے زائد کھانے دستیاب ہیں۔ گلی میں واقع دونوں جانب کے پرانے گھروں کی بالکونیاں کو رنگ برنگی روشنیوں سے خوبصورتی سے سجایا گیا ہے جو کہ دیکھنے والوں کو بہت بھلا محسوس ہوتا ہے۔

گلی میں دستیاب کھانوں کے معیار میں پہلے روز سے آج تک کسی قسم کی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اس گلی میں بہت سے معیاری کھانے مناسب قیمتوں پر مل جاتے ہیں یہاں ملنے والی سردار کی تلی ہوئی مچھلی، ہریسہ، حلیم، پٹھورے کلچے، مرغی، اور بکرے کے گوشت کا اچاری سالن، کڑھائی، سیخ کباب، تکے فیرنی، قلفی اور سبز چائے کا معیار پاکستان بھر میں دستیاب ان چیزوں کے معیار سے کسی صورت کم نہیں۔

یہاں جانے والوں کو ایک ہی مشکل درپیش ہوتی ہے کہ تمام اقسام کے کھانے ''ایک میز'' پر دستیاب نہیں جس کی وجہ سے آپ کو اپنے کھانے کی خواہش کی تکمیل کے لیے ایک جگہ سے دوسری

جگہ جانا پڑتا ہے۔ ''فوڈ سٹریٹ'' میں کھانوں کی قیمتیں دوسری جگہوں کی نسبت کم ہیں۔ مستقبل قریب میں یہ ''فوڈ سٹریٹ'' مزید لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے گی۔ فوڈ سٹریٹ، میں غیر ملکیوں کی ایک بڑی اکثریت بھی کھانا کھاتے نظر آتی ہے اور یہاں کے ماحول، کھانوں کی انواع و اقسام اور ارزاں قیمتوں سے مستفید ہوتی ہے۔

نسبت روڈ سے مین بازار گوالمنڈی تک کی 200 میٹر لمبی سڑک اب شام پانچ بجے کے بعد ''فوڈ سٹریٹ'' میں تبدیل ہو جاتی ہے کہا جاتا ہے کہ انگریزوں کے دور میں یہاں گوالے آباد تھے جو انگریز فوجی چھاؤنی میں دودھ مہیا کرتے تھے اسی وجہ سے اسے ''گوالمنڈی'' کہا جاتا تھا پھر جب بھینسوں کو اندرون شہر سے نکال دیا گیا تو گوالے بھی یہاں سے چلے گئے۔

فوڈ سٹریٹ کے منصوبے کا آغاز 15 مارچ 2000ء کو کیا گیا تھا اور صرف 7 ماہ میں یہ منصوبہ مکمل کر لیا گیا اس کا افتتاح 20 اکتوبر 2000 کو ہوا یہ تجربہ اس قدر کامیاب ثابت ہوا کہ اس کے بعد شہر میں اس قسم کے تجربات مختلف علاقوں میں کئے گئے دوسرے شہروں اور لاہور کے دور دراز علاقوں سے یہاں بڑی تعداد میں کھانا کھانے آنے لگے اور اس جگہ قائم دکانوں سے کھانوں سے لطف اندوز ہوتے۔ رات کے وقت یہاں کی خوبصورتی کا منظر قابل دید ہوتا ہے رنگ برنگی روشنیوں میں ایک صدی قبل کے مکانات جنہیں کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا اب بہت خوبصورت اور بھلے معلوم ہوتے ہیں گوالمنڈی کی فوڈ سٹریٹ کے دونوں طرف تقریباً چالیس چالیس دکانیں ہیں ان کے اوپر بالکونیوں والے مکانات ہیں اس وقت یہاں تقریباً 70 دکانیں کھانے پینے کا کاروبار کر رہی ہیں جبکہ 10 دکانوں پر دوسرا مختلف کاروبار ہو رہا ہے گورنر پنجاب کی ہدایت پر جب سرکاری ادارے پی ایچ اے نے تجدید لاہور پروگرام شروع کیا تو کھانے پینے کی تہذیبی روایات کو اجاگر کرنے کے لیے مقامی انتظامیہ کی نظر گوالمنڈی کی اس سڑک پر پڑی۔ دکانداروں نے اس منصوبے کا خیر مقدم کیا۔ چھ ماہ کے دوران اس سڑک کے دونوں اطراف واقع دکانوں اور ان کے اوپر بالکونیوں کی نئے سرے سے تزئین و آرائش کی گئی جس میں نیشنل کالج آف آرٹس کے طلبہ سے مدد لی گئی۔

بالکونیوں کے نیچے رنگ برنگی لائٹیں لگائی گئی ہیں جس کی روشنی میں جگمگاتی ہوئی رنگین بالکونیاں اور جھروکے نہایت خوبصورت منظر پیش کرتے ہیں۔ تمام کام ہارٹی کلچرل اتھارٹی کے زیر نگرانی انجام پایا۔ اس سلسلے میں علاقے میں کام کرنے والی تنظیم ''زندہ دلان لاہور'' نے بہت

تعاون کیا بالکونیوں اور جھروکوں کو رنگ و روغن کرنے پر تقریباً 22 لاکھ روپے خرچ ہوئے جو کہ مختلف کمپنیوں نے سپانسر کیے تھے۔

قیام پاکستان سے پہلے یہ علاقہ جہاں پرفوڈ سٹریٹ قائم کی گئی ہے امیر ہندوؤں کا علاقہ تھا قیام پاکستان کے بعد امرتسر سے آنے والے اکثر مہاجرین نے یہاں سکونت اختیار کی چوک میں امرتسریوں نے ہوٹل کھول لیے ان ہوٹلوں میں رات گئے تک فلمی گیت بجائے جاتے تھے امرتسر سے آئے ہوئے زیادہ تر ادیب گوالمنڈی میں ہی رہائش پذیر ہوتے تھے۔

لاہوریوں کی طرح امرتسریوں کی خوش خوراکی اور مخصوص کھانے اپنی مثال آپ ہیں۔ امرتسر سے آنے والوں نے اپنی اس روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے مخصوص کھانوں کو اپنائے رکھا۔ یہ علاقہ امرتسریوں کا گڑھ بن گیا تھا لہٰذا یہاں مخصوص امرتسری کھانے ملتے تھے جنہیں کھانے لوگ دور دور سے آنے لگے امرتسری مہاجروں نے یہاں دکانیں الاٹ کرائیں اور کاروبار شروع کیا۔ یہ لوگ عموماً کشمیری برادری پر مشتمل تھے یوں یہ علاقہ شروع ہی سے خاصی شہرت کا حامل بن گیا تھا اور کئی دکانداروں نے اپنے نام میں اتنی مہارت حاصل کی کہ کھانا ان کے نام کے ساتھ لازم وملزوم ہو گیا مثلاً جیجا دودھ والا، نیتی (عنایت مرحوم) مٹھائی والا پچھو پان والا، یٰسین کلیجے والا، قاسم شاہ دیسی گھی والا سردار مچھلی والا، چھیدا سالن والا۔ یہ سب دکانیں قیام پاکستان کے فوراً بعد قائم ہوئیں اور خوب مشہور ہوئیں۔

یہاں کی سب سے قدیم دکان تکے کباب کی ہے۔ یہ دکان 1947ء میں قائم ہوئی تھی۔ ان کی دکان کے تکے کباب اتنے مشہور ہوئے کہ بڑے بڑے سیاست دان، بیوروکریٹس اور نامور شخصیات یہاں تکے کباب کھانے آتی رہیں۔ لاہور میں اہم غیر ملکی شخصیات کی آمد پر یہاں کے تکے کباب سرکاری دعوتوں میں پیش کئے جاتے تھے۔ سرشام بازار کو دونوں اطراف سے لوہے کے گیٹوں کے ساتھ بند کر دیا جاتا ہے جبکہ بازار سے ملحقہ بعض ذیلی گلیوں میں بھی لوہے کے دروازے لگا کر ٹریفک کی آمدورفت بند کر دی جاتی ہے یہ دروازے عموماً شام چھ بجے سے لے کر 2 بجے تک بند رکھے جاتے ہیں۔

بازار کی 80 دکانوں میں سے پہلے 32 دکانیں کھانے پینے کی تھیں جبکہ دیگر 48 دکانوں میں فوٹوگرافر، طبیب، جراح، حجام، پرچون، کریانہ مرچنٹ کمہار، پتنگ فروش، بجلی کے سامان والے، دھوبی اور سائیکلیں ٹھیک کرنے والوں کی دکانیں تھیں اس وقت کھانے پینے کی دکانوں میں امرتسر

کے مخصوص کھانے جیسے ہریسہ، نہاری، سری پائے، کٹاکٹ، مغز، بونگ، دیسی مرغ، مچھلی، حلوہ پوری، بریانی اور دہی دودھ کی لسی قابل ذکر تھے۔فوڈ سٹریٹ بننے کے بعد یہاں کھانے پینے کی اشیاء میں اضافہ کیا گیا جن میں سندھی بریانی، انڈے کوفتے، گول گپے برگر، فنگرفش اور حلیم جیسی ڈشیں شامل ہیں۔کئی دکانوں کو کھانے پینے کی دکانوں میں بدلا گیا۔

دکانوں کے باہر گاہکوں کے بیٹھنے کے لیے مخصوص طرز کی کرسیاں رکھی گئیں ہیں جو پنجاب یونیورسٹی شعبہ فائن آرٹس کے طلباء نے ڈیزائن کی ہیں۔فوڈ سٹریٹ کا ذکر اس وقت دنیا بھر میں ہو رہا ہے سیاح لاہور آتے ہی فوڈ سٹریٹ دیکھنے کی خواہش کرتے ہیں۔ یہاں وہ دیکھتے ہیں کہ ہم کس طرح اور کیا کیا کھاتے ہیں کھانا کس طرح پیش کیا جاتا ہے چنگیر، کنالی، ٹھوٹھی ان کے لیے عجیب چیزیں ہیں۔مکئی کی روٹی، ساگ، مکھن، پشاوری کباب، ہریسہ، نہاری، سری پائے، دال چاول بریانی غرض تمام چیزیں انہیں ایک جگہ اکٹھی کر دی گئی ہیں۔

دوسو میٹر کے اس ایریا میں 85 دکانیں بنائی گئیں جہاں لوگ روایتی کھانوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں بہت سے بیروزگاروں کو اس کی بدولت روزگار ملا اور بہت سے لوگوں کے روزگار میں ترقی ہوئی فوڈ سٹریٹ میں جانا باعث تفاخر بن گیا۔رات کے وقت یہاں کی خوبصورتی کا منظر قابل دید ہوتا ہے۔رنگ برنگی روشنیوں میں سو سال پہلے کے تعمیر شدہ مکان جن پر کوئی توجہ نہیں دیتا تھا اب بہت خوبصورت لگتے ہیں۔

''نیا لاہور'' تحریر: محمد نعیم مرتضیٰ

o

انارکلی بازار، لاہور

انارکلی بازار کو لاہور شہر کے دل کی حیثیت حاصل ہے یہ بلاشبہ تہذیبوں کا نشان اور تاریخ کا امین علاقہ ہے انارکلی کی آبادی جین مندر کی جانب سے شروع ہوئی جو بڑھتے بڑھتے مال روڈ کی جانب بڑھتی گئی اور نئی انارکلی کا روپ اختیار کر گئی اس وقت عالم یہ ہے کہ جب انارکلی کہا جائے تو اس سے مراد نئی انارکلی ہی ہوتا ہے۔

انارکلی کون تھی اس کے متعلق تاریخ بالکل خاموش ہے افسانوی روائتوں کے مطابق وہ ایک کنیز تھی جسے زندہ دیوار میں چنوا دیا گیا تھا۔ گو مورخین اس بات سے متفق نہیں اور اسے محض ایک فرنگی کے ذہن کی اختراع قرار دیتے ہیں۔

جس جگہ انارکلی آباد ہوئی اور جواب پرانی انارکلی کہلاتی ہے یہاں انگریز فوجیوں نے بیرکیں قائم کیں انہیں کی نسبت یہ علاقہ رسالہ بازار کہلاتا تھا۔ رسالہ بازار فوج کی وادیوں اور کپڑوں کی دھلائی کرنے والوں کے علاوہ کئی طرح کے دکانداروں کا مسکن بنتا رہا۔ بیکریاں، گوشت کی دکانیں، اور مختلف اشیاء کے کھوکھے وجود میں آ گئے یہی نہیں انواع واقسام کے پیشوں سے وابستہ افراد نے بھی اس بازار کا رخ کر لیا۔ ٹولنٹن مارکیٹ کی تعمیر سے ایک ایسی مارکیٹ وجود میں آ گئی جہاں انگریزوں کے استعمال کی زیادہ اشیاء فروخت ہوتی تھیں رسالہ بازار میں انگریز صاحبان کے ملبوسات اور فوجیوں کی یونیفارم کی دھلائی کے لیے دھوبیوں کی بستی بھی بسائی گئی۔ اس لیے عرصہ تک انارکلی کو دھوبی منڈی بھی کہا جاتا رہا یہاں موجود پرانی مسجد نیلا گنبد فوجی افسروں کے ''میس'' کا کام دیتی تھی۔ 1879 میں جب انگریزی فوجی چھاؤنی کو میاں میر کے علاقے میں منتقل کیا گیا تو ''رسالہ بازار'' سول حکام کی کوٹھیوں کا مرکز بن گیا اور ''سول لائنز'' کہلانے لگا۔ مقامی گورا آبادی کی سہولت کے لیے یہاں گورنمنٹ کالج، ٹولنٹن مارکیٹ اور میو ہسپتال وغیرہ تعمیر ہوئے۔ ساتھ ہی ساتھ انارکلی بازار کی بنیاد بھی رکھی گئی یہ بازار اندرون شہر اور نئی آبادیوں کے

درمیان ایک نیا رابطہ تھا۔

1848 کے لگ بھگ جس وقت انارکلی بازار آباد ہونا شروع ہوا تو ہر شخص کو اجازت تھی کہ وہ جس قدر چاہے زمین پر قبضہ کرے مگر شرط صرف اتنی تھی کہ اسے زمین کے گرد چار دیواری کرانا پڑتی تھی۔ یوں شروع شروع میں لوگوں نے جس قدر چاہا بڑی بڑی دکانیں بنالیں۔ لوہاری کی جانب مغل دور میں بھی کاروباری مرکز قائم تھا۔ قطب الدین ایبک کے مزار کے مغرب میں ایک محلے کا پتہ ملتا ہے جہاں تاجر دوردور سے سامان بیچنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ اس کے بعد بھی اس علاقے میں تجارتی سرگرمیاں جاری رہیں مگر اسے باقاعدہ بازار کی صورت انگریزوں نے دی۔

1900ء تک انارکلی کو اچھا خاصا عروج حاصل ہوگیا تھا یہاں شروع سے ہی پکی نالیاں بنائی گئی تھیں خواہ کتنی ہی بارش ہوتی ہوا انارکلی میں پانی کھڑا نہیں ہوتا یہ لاہور کی جدید ترین بازار تھا۔ عام لوگ ڈبی بازار اور کشمیری بازار سے خریداری کرتے جبکہ کھاتے پیتے لوگ انارکلی کا رخ کرتے تھے۔ انارکلی بازار ہمیشہ سے شعراء اور ادیبوں کا گڑھ رہا ہے یہاں قریب ہی نگینہ بیکری تھی جو 1925ء میں قائم ہوئی اس کے مالک کا تعلق بجنور کے قصبہ نگینہ سے تھا اسی نسبت سے اس کا نام نگینہ بیکری رکھا گیا۔

نگینہ بیکری ادبی اور سیاسی سرگرمیوں کا مرکز تھی یہاں تاجور نجیب آبادی، عبدالمجید سالک، عاشق بٹالوی، شورش کاشمیری اور کئی اہم شخصیات آیا کرتی تھیں ٹی ہاؤس سے قبل نگینہ بیکری بھی ادیبوں کا مسکن تھی۔ اس طرح انارکلی کے اندر واحد چائے خانہ سرائے شفیع محمد کے قریب تھا اب یہ سرائے شفیع محمد دہلی مسلم ہوٹل ہے اور چائے خانے کی جگہ باٹا شوسٹور کی بہت بڑی دکان ہے۔

1918ء میں بیدل شاہجہان پوری رسالہ ''مخزن'' کے مدیر ہوئے تو انہوں نے سرائے شفیع محمد میں رہائش اختیار کی ان سے ملنے پطرس بخاری، مولانا عبدالمجید سالک اور دیگر شعراء و ادباء آتے تو سب اس چائے خانے میں بیٹھا کرتے تھے۔

انارکلی میں ہندو مسلمان دونوں آباد تھے ان میں تعلقات خوشگوار تھے یہی وجہ ہے کہ تقسیم برصغیر کے وقت یہاں فسادات برپا نہیں ہوئے انارکلی میں ہندوؤں کی غالب آبادی دھنی رام روڈ پر تھی۔ اس علاقے کا نام علاقے کے ایک امیر ہندو لالہ دھنی رام کے نام پر تھا جس کی یہاں ہارڈ ویئر کی بہت بڑی دکان تھی اس سڑک پر ایک بہت بڑی حویلی ہے جو 1877ء میں بنی تھی یہ ڈاکٹر رحیم آنریری سرجن وائسرائے انڈیا کا گھر تھا ڈاکٹر رحیم لاہور کے ابتدائی مسلمان ڈاکٹروں میں

سے ایک تھے انہیں کے نام پر کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں ٹاپ کرنے والے طلبہ کو میڈل دیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر رحیم کے پوتے اعظم خان پنجاب مسلم لیگ کے آفس سیکرٹری تھے۔ 1936ء میں جب قائداعظم لاہور تشریف لائے تو مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لیے ریلوے اسٹیشن سے سیدھے اس تاریخی مکان میں آئے یہ مکان آج بھی انارکلی میں اچھی حالت میں موجود ہے۔ میو ہسپتال 1871ء میں رائے بہادر، کنہیالال انجینئر کی زیر نگرانی تعمیر ہوا تھا یہیں شفاخانہ حیوانات تھا جو بعد میں سنت نگر میں منتقل کر دیا گیا جس جگہ میو ہسپتال اور کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کی عمارتیں ہیں ایک زمانے میں یہاں بڑے گوشت کی مارکیٹ تھی جو انگریز چھاؤنی کو گوشت مہیا کرتی تھی انگریز چھاؤنی منتقل ہوئی تو اس مارکیٹ کے بیوپاری پرانے مزنگ کی طرف کوچ کر گئے جہاں آج بھی ان کی دکانیں موجود ہیں۔

بائبل پبلشرز کی قدیم دکان بھی یہیں ہے۔ محکمہ تعلیم کا دفتر بھی اسی سڑک پر موجود ہے پرانی انارکلی پھیلتے پھیلتے جب نئی انارکلی کی جانب بڑھی تو سب سے پہلے یہی ادارے اور دکانیں وجود میں آئی تھیں۔

انارکلی بازار میں ایک قدیم گرجا گھر اور مشنری سکول سینٹ فرانسس قائم ہے اتوار کے روز یہاں سنڈے بازار لگتا ہے جہاں پتلونیں، شرٹیں، نئے پرانے جوتے، لنڈے کی اشیاء اور کتابیں فروخت ہوتی ہیں کتابوں کا اتوار بازار بھی یہیں لگتا ہے چھٹی کے دن جب دکانیں بند ہوتی ہیں تو عارضی دکانیں لگانے والوں سے انارکلی ایک نیا روپ دھار لیتی ہے انارکلی میں ون وے ہونے کی وجہ سے ٹریفک پر بھی کنٹرول رہتا ہے اور ٹھیلے والوں کی موج ہو جاتی ہے۔

ایف سی کالج کا آغاز بھی نیلا گنبد کے علاقے سے ہوا تھا بعد ازاں جب یہ کالج نہر کے کنارے منتقل کر دیا گیا تو یہاں ''ٹیپو ہاسٹل'' بن گیا۔ یہ عمارت آج بھی بہت خوبصورت اور عمدگی سے محفوظ اور ہوسٹل کی صورت میں قائم ہے۔

علامہ اقبال بھی کچھ عرصہ انارکلی میں رہائش پذیر رہے ان کا دفتر شیخ عنایت اللہ کے سامنے والی بلڈنگ میں ہوا کرتا تھا جبکہ مکان ایک گلی میں تھا جو اب بھی موجود ہے لوہاری کی جانب انارکلی میں ایک پرانا گرجا گھر ہے اس کا نام فورمین میموریل چیپل ہے جو پریسٹرین چرچ آف پاکستان کے زیر انتظام ہے۔ ایبک روڈ پر خاندان غلاماں کے چشم و چراغ قطب الدین ایبک کا خوبصورت

مزار ہے اس کے قریب ہی ایک خوبصورت مندر بنسی دھر ہے اس وقت اس مندر میں لوگوں کی رہائش ہے۔

بانو بازار اور خانم بازار جو اس وقت خواتین کی توجہ کا خصوصی مرکز اور ان کے استعمال کی اشیاء کا گڑھ ہے دراصل ریڑھی اور چھابڑی والوں کے لیے بنائے گئے تھے 1952ء میں جب مارشل لاء حکومت آئی تو جنرل اعظم نے بازار میں پھیری لگانے پر پابندی لگا دی اور ان پھیری والوں کو متبادل کے طور پر یہ مارکیٹیں بنوادی گئیں۔ بانو بازار کا افتتاح فیروز خان نون سابق وزیر اعلیٰ پنجاب نے 22 جون 1953ء کو کیا تھا۔

اس وقت بانو بازار کی چاٹ اور دہی بھلے بہت مشہور ہیں خواتین بطور خاص یہاں سے چاٹ کھانے آتی ہیں یہاں واقع بابر مارکیٹ کی آئس کریم بھی خاصی شہرت کی حامل ہے۔

انارکلی کی مین شاہراہ پر کوئی تین چار سو دوکانیں ہیں جبکہ اس سے ملحقہ مارکیٹوں اور بازاروں کو بھی اس کا حصہ تصور کر لیا جائے تو یہ تعداد ہزاروں میں پہنچ جائے گی۔ انارکلی کی اہم مارکیٹوں میں پان منڈی، گنپت روڈ، محافظ پلازہ، پیسہ اخبار، چوڑی مارکیٹ، پیرس مارکیٹ، خانم بازار، بابر مارکیٹ، بانو بازار، جان محمد روڈ، بخشی مارکیٹ، رحمت مارکیٹ، دھنی رام روڈ، کچہری روڈ اور دیگر مارکیٹیں شامل ہیں ان میں سے ہر ہر مارکیٹ کی اپنی پہچان اور تاریخ ہے یہاں سب سے زیادہ دکانیں ملبوسات، پارچہ جات اور جوتوں کی ہیں اس اعتبار سے اسے خواتین کے ذوق کا بازار کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کسی زمانے میں انارکلی میں لاہور کے بہترین ہوٹل موجود ہوا کرتے تھے ان میں دہلی مسلم ہوٹل، نظام ہوٹل، سینٹرل ہوٹل، نشاط ہوٹل اور ہوٹل ڈی پیلس وغیرہ اہم ہیں ان میں سے بیشتر ہوٹل یا تو ختم ہو گئے ہیں یا اپنی عمر کے آخری برس گذار رہے ہیں دہلی مسلم ہوٹل ان تمام ہوٹلوں میں سے سب سے بہترین تھا۔ جس وقت پنجاب اسمبلی کا اجلاس ہوتا تو اراکین اسمبلی یہاں آ کر ٹھہرے کرتے تھے۔ ان دنوں یہاں جگہ بھی نہیں ملا کرتی تھی۔ اس وقت یہ ہوٹل گو زیادہ اچھی حالت میں نہیں تھا اس کے باوجود اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کا ماضی کیسا تابناک ہوگا۔ رقاص مہاراج کتھک نے اپنی بیشتر عمر اس ہوٹل کے ایک کمرے میں گذاردی اور 1998 میں یہیں وفات پائی۔

تقسیم کے وقت نیلا گنبد میں سائیکلوں کی چند دکانیں تھیں 1950ء کے بعد یہاں سائیکلوں کی دکانیں بڑھنے لگیں اور رفتہ رفتہ یہ باقاعدہ سائیکل مارکیٹ بن گئی۔

آزادی کے بعد اس بازار کی رونق میں خاصا اضافہ ہو گیا مگر محبتوں اور خوشیوں اور غموں کے افسانوں کی جگہ افرتفری اور کاروباری محبتوں کے دروازے کھل گئے الحمدللہ اب انارکلی میں جو کچھ بھی ہے پاکستان کا اور پاکستانیوں کا ہے یہاں علم وفضل کے بڑے چرچے ہیں احسان دانش مرحوم نے اس بازار میں زندگی گذار دی فنون کا دفتر بھی اس بازار میں مدتوں رہا حافظ امرتسری بھی اس بازار میں تھے عمارات کی بلندیوں اور خوبصورتیوں میں پہلے سے کہیں زیادہ اضافہ ہو گیا سینکڑوں لوگ انارکلی کے فٹ پاتھ پر روزی کمانے کے لیے طرح طرح کے پاپڑ بیلتے ہیں جالندھر موتی چور سے لے کر ٹولنٹن مارکیٹ تک خریدنے اور بیچنے والوں کا ایک اژدہام ہوتا ہے کوئی کونا کوئی گوشہ انارکلی کا اب ایسا نہیں رہا جہاں دکانیں نہ بن گئی ہوں مارکیٹیں اور پلازے بنتے جا رہے ہیں بیسیوں مارکیٹیں وجود میں آ چکی ہیں سارے بازار میں کاروں، موٹر سائیکلوں کی قطاریں لگی رہتی ہیں۔

لوگ آتے اور چلے جاتے ہیں، مگر اس بازار کی رونقیں کبھی کم نہیں ہوئیں خدا کرے ان رونقوں کو کبھی کسی کی نظر نہ لگے۔

ہفتہ روزہ ''فیملی میگزین''، روزنامہ ''جنگ'' سنڈے ایڈیشن

○

پاکستان کے دریا

دریائے جہلم

دریائے جہلم جموں وکشمیر کے علاقے پیر پنجال کے دامن میں واقع ایک چشمہ ویری ناگ سے نکلتا ہے۔ شمال مشرقی جموں وکشمیر کے گلیشیئرز پگھل کر اس کے پانی میں اضافہ کرتے ہیں۔ دریائے جہلم سری نگر کے پاس سے گزرتا ہوا ولر جھیل میں گر جاتا ہے۔ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے اس کی گذرگاہ تنگ ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس کا مشاہدہ چکوٹھی میں لائن آف کنٹرول سے مظفر آباد اور کوہالہ تک کیا جا سکتا ہے دریائے جہلم مظفر آباد میں دریائے نیلم میں شامل ہو جاتا ہے اور وادی کاغان میں کنہار دریا سے مل کر دریائے پونچھ میں شامل ہو جاتا ہے دریائے جہلم آزاد کشمیر کے ضلع میر پور کے مقام پر منگلا پہنچ کر میدانی علاقہ سے بہتا ہوا پنجاب کے ضلع جہلم میں داخل ہو جاتا ہے یہاں اس کا رخ شمال سے جنوب مغرب کی طرف ہو جاتا ہے منگلا کے مقام پر ایک بہت بڑا ڈیم تعمیر کیا گیا ہے اور دریا کا پانی اس ڈیم میں آتا ہے اس کو منگلا ڈیم کہتے ہیں اس کا پانی آبپاشی اور بجلی پیدا کرنے کے کام آتا ہے۔ دریائے جہلم پاکستان میں جہلم، ملک وال اور خوشاب کے میدانی علاقوں سے بہتا ہوا ضلع جھنگ میں تریموں کے مقام پر دریائے چناب میں شامل ہو جاتا ہے۔

دریائے جہلم پر 1967ء میں منگلا ڈیم بنایا گیا اور اس میں 5.9 ملین ایکڑ پانی محفوظ کیا جا سکتا ہے اسی دریا پر 1967ء میں رسول بیراج تعمیر کیا گیا اور اس میں سے 850000 کیوسک پانی گزر سکتا ہے دریائے جہلم سے دو نہریں نکالی گئی ہیں۔ لوئر جہلم کینال 1901ء میں ضلع گجرات کے مقام رسول سے نکالی گئی ہے اس کی مزید دو شاخوں کھارا در مشین سے ضلع جھنگ کا شمالی حصہ سیراب ہوتا ہے۔ اپر جہلم 1915ء میں تعمیر کی گئی اس کا پانی منگلا سے دریائے چناب تک جاتا ہے

رسول بیراج سے رسول قادر لنک اور چشمہ جہلم لنک کینال نکالی گئی ہیں دریائے جہلم اور چناب کے درمیانی علاقہ کو دوآبہ چج کہتے ہیں اس کے مغربی حصہ کو تھل کہتے ہیں جہلم کے شہر سرائے عالمگیر میں ملٹری کالج واقع ہے۔

دریائے جہلم کو ویدک دور میں وتلستا اور یونانی زبان میں ہائیڈ سپاس کہا جاتا ہے۔320 قبل مسیح میں سکندر اعظم نے دریائے جہلم عبور کر کے راجہ پورس کو شکست دی تھی اور دو شہر تعمیر کروائے تھے۔ پہلا اس مقام پر تھا جہاں لڑائی ہوئی تھی اس کا نام ونشان مٹ گیا ہے اور دوسرا سکندر اعظم نے اپنے محبوب گھوڑے بیوسیفالس کے نام سے منسوب کیا تھا جو اس جنگ میں کام آیا۔ جہلم کا موجودہ شہر اس مقام پر آباد ہے۔ بعض حوالوں میں گجرات کے شہر پھالیہ کو سکندر اعظم کے گھوڑے بیوسیفالسس کے نام سے منسوب کیا گیا ہے ہندوستان دریائے جہلم پر ڈیم تعمیر کر رہا ہے پاکستان نے اس مسئلہ پر اپنی تشویش سے بین الاقوامی اداروں کو آگاہ کر دیا ہے۔

دریائے ستلج

ستلج کو یونانی زبان میں زردروز اور ویدک میں ستوری کہا جاتا ہے دریائے ستلج جنوب مشرقی تبت کی جھیل لنکا سو سے 15200 فٹ کی بلندی سے نکلتا ہے اس کی کل لمبائی 1448 کلومیٹر ہے دریائے ستلج ہمالیہ کی گھاٹیوں سے گزر کر ہماچل پردیش کی ریاست میں 900 میل تک کے علاقے کو سیراب کرتا ہوا ضلع ہوشیار پور کے میدانی علاقوں میں آجاتا ہے۔ یہاں سے ایک بڑی نہر کی شکل میں جنوب مغرب کی طرف بہتا ہوا دریائے بیاس میں گر کر ہندوستان اور پاکستان میں ضلع قصور کے میدانی علاقوں سے دیپالپور کے نزدیک ہیڈ سلیمانکی سے گزرتا ہوا بہاولپور اور بہاولنگر کے اضلاع کی زمینوں کو سیراب کرتا ہے نواب بہاول پور نے اپنی ریاست کو زرخیز بنانے کے لیے دریائے ستلج سے نہریں نکالیں جن کا پانی نہ صرف زمینوں کو سیراب کر رہا ہے بلکہ صحرائے چولستان کے کچھ علاقوں میں فصلیں اگانے میں استعمال ہوتا ہے 1849ء میں سکھوں اور انگریزوں کے درمیان جنگ سے پہلے یہ دریا ایک سرحد کا کام انجام دیتا تھا یہ کہا جاتا ہے کہ دریائے ستلج زمانہ قدیم میں دریائے سرسوتی کا منبع تھا۔

اراضی تفسیرات کے سبب دریائے سرسوتی کا نام ونشان مٹ گیا ہے کوٹ مٹھن کے مقام پر دریائے ستلج، دریائے سندھ سے مل جاتا ہے زمانہ قدیم میں دریائے ستلج تحصیل احمد پور شرقیہ کے

قصبہ اچ شریف کے نزدیک سے گزرتا تھا اس کے نشانات آج بھی موجود ہیں۔1960ء کے سندھ طاس منصوبے کے تحت اس کے پانی پر بھارت کا حق تسلیم کرلیا گیا ہے ہندوستان نے دریائے ستلج پر بھاکڑہ ننگل ڈیم تعمیر کیا ہے جس سے 450,000 کلوواٹ بجلی پیدا ہوتی ہے اور اس کا پانی زرعی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اس کے علاوہ ہندوستان نے دریائے ستلج سے سرہند کینال اور وادی ستلج کے نام سے نہری منصوبے تعمیر کر کے علاقے کو زرخیز بنا دیا ہے۔ پاکستان میں دریائے ستلج کے وسیع وعریض علاقے خشک سالی کے سبب سیم وتھور جیسے مسائل کا شکار ہیں۔

دریائے چناب

پنجاب کے بڑے دریاؤں میں سے ایک اس کا پنجابی لفظ ''چن'' چاند اور فارسی لفظ ''آب'' (پانی) سے مل کر بنا ہے۔ یہ دریا ہماچل پردیش میں تانڈی کے مقام پر دو معاون دریا ''چندر'' اور ''بھاگ'' کے اتصال سے وجود میں آتا ہے یہ دونوں معاون دریا ہمالیائی پہاڑیوں میں گلیشیئر پگھلنے سے وجود میں آئے۔ بھارت میں یہ دریا ''چندر بھاگ'' کہلاتا ہے۔ ہماچل پردیش سے جموں وکشمیر میں داخل ہوتا اور پھر پنجاب چلا آتا ہے۔

دریائے چناب تریموں کے مقام پر دریائے جہلم سے ہم آغوش ہوتا ہے۔ احمد پور سیال کے قریب دریائے راوی بھی اس سے آملتا ہے اوچ شریف کے قریب ستلج دریا ملنے پر ''پنجند'' کا تاریخی مقام وجود میں آتا ہے (پانچواں دریا ''بیاس'' ہے وفیروز پور کے مقام پر ستلج سے ملتا ہے)

چناب آخر میں مٹھن کوٹ کے نزدیک دریائے سندھ میں شامل ہو جاتا ہے یہ تقریباً 960 کلومیٹر لمبا ہے سندھ طاس معاہدے کی رو سے اس کا پانی پاکستان کے لیے مخصوص ہے۔ پنجاب میں بسنے والوں کے لیے چناب ایسی ہی دیومالائی حیثیت رکھتا ہے جیسی ''رائن'' جرمنوں یا ''ڈینوب'' آسٹروی وہنگرین باشندوں کے لیے ہیر رانجھا اور سوہنی مہینوال کی لوک داستانوں میں چناب کا کردار بڑا اہم ہے۔

○

ہماری نہریں
پاکستان کا انتہائی اہم قومی ورثہ

پاکستان بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے اور مختلف جغرافیائی حیاتیاتی اور رنگارنگ ثقافتی ماحول کا حامل ہے۔ مکران کے ساحلی علاقے، تھر اور بلوچستان کے صحرا، سندھ اور پنجاب کے میدان اور شمالی علاقہ جات کے دلفریب مناظر دنیا کے کسی بھی دوسرے ملک کے لیے قابل رشک ہیں۔ پاکستانی علاقے سطح سمندر سے لے کر دنیا کی دوسری بلندترین چوٹی کے ٹو تک محیط ہیں۔ یہاں بارشوں کا تناسب سندھ میں 100 ملی میٹر سے بالائی علاقوں میں سات سو ملی میٹر سالانہ تک ہے جبکہ درجہ حرارت منفی 2 درجہ سینٹی گریڈ سے لے کر بعض علاقوں میں 50 درجہ سینٹی گریڈ تک جا پہنچتا ہے۔

پاکستان کے چاروں صوبوں کی زبان اور رسم ورواج مختلف ہے لیکن نہروں کے ایک جال نے ان سب کو منسلک کر رکھا ہے اور وہ بلاتفریق ان صوبوں میں یوں رواں دواں ہیں۔ جیسے کسی جسم میں حیات بخش شریانیں، بنظر غائر دیکھیں تو نہریں پاکستا کا ایک انتہائی اہم قومی ورثہ ہیں جن پر ہماری زرعی معیشت کا دارومدار ہے اور یہ ہمارے دکھ سکھ کی زندہ ادبی اور ثقافتی علامت ہیں۔ پاکستانی دریاؤں، سندھ، کابل، جہلم، چناب، راوی اور ستلج سے تقریباً 40 بری نہریں نکلتی ہیں۔ دریائے راوی پر تین ہیڈ ورکس، ہیڈ بلوکی، سدھنائی اور مادھوپور سے تین نہریں اپر باری دوآب، لوئر بری دوآبہ اور سدھنائی نکلی ہیں۔ دریائے چناب پر تین ہیڈ ورکس مرالہ حویلی اور خانکی سے اپر چناب، لوئر چناب اور رنگ پور کی نہریں نکلتی ہیں۔ دریائے جہلم سے دو نہریں جبکہ دریائے سندھ پر چھ ہیڈ ورکس سے اٹھارہ نہریں نکلتی ہیں۔

پاکستان کو سیم، زیرزمین پانی کی سطح کا کم ہونا اور دریائی سیلابوں جیسے مسائل کا سامنا ہے اور ان کا براہ راست یا بالواسطہ تعلق سے ہی ہے۔ اگرچہ آبپاشی کے نظام میں کچھ دوسرے ذرائع بھی ہیں لیکن ہماری زیادہ تر زرعی معیشت کا انحصار نہری نظام پر ہے۔ نہروں کی قدر و قیمت تو بارانی علاقوں کے لوگ جانتے ہیں۔ جن کا تمام تر دارومدار بارشوں پر ہوتا ہے۔ اسی اہمیت کی وجہ سے زیادہ تر بستیاں نہروں کے کنارے بسائی جاتی ہیں۔ نہری پانی کی تقسیم دیہی زندگی کا انتہائی اہم پہلو ہے۔ بسااوقات اس بناء پر پیدا ہونے والے تنازعات قتل جیسی بھیانک واردات کا باعث بھی بن جاتے ہیں۔ نہروں کی قومی اہمیت کے پیش نظر اور پانی کے ضیاع کو روکنے کے لیے زمانہ امن میں پاکستانی فوج نے ہمیشہ نہروں میں بھل صفائی اور پختہ کاری کے سلسلے میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں جن سے انجذاب میں رکاوٹ کی وجہ سے نہری پانی کے ضیاع میں نمایاں کمی ہوئی ہے۔

نہروں کے اردگرد بسنے والوں سے معمولات زندگی میں نہر کا ایک اہم کردار ہوتا ہے کسان کھیتوں کو پانی دینے کے لیے باری کے منتظر رہتے ہیں۔ نوجوان صبح سویرے اپنے دن کا آغاز نہر کی سیر سے کرتے ہیں اور گڈریئے بکریاں چرانے کے لیے نہر کے کنارے کنارے اپنے مخصوص عصا سے پتے جھاڑتے نظر آتے ہیں، خانہ بدوش لڑکیاں کیکر کی گوند جمع کرتی ہیں، غریب لوگ ایندھن اور دیگر استعمال کے لیے سرکنڈے کاٹتے ہیں جبکہ انتہائی انہماک سے نادر جڑی بوٹیاں تلاش کرتے ہیں۔

دھوبی نہر کے کنارے پڑے ہوئے بڑے بڑے پتھروں پر کھڑے ہو کر مسلسل نغمہ سرا ہوتے اور آوازیں نکالتے ہیں۔ کہیں دور سے چکی کی تگ تگ کی آواز کسی بستی کی نشاندہی کرتی ہے۔ دوپہر کا وقت فاختائیں نہر کے کنارے پیڑوں کی ٹھنڈک میں گزارتی ہیں۔ شام کے دھندلکے میں گلابی افق کے پس منظر میں درختوں کے کالے ہیولوں کے درمیان چاندی سا بہتا ہوا پانی ایک عجیب طلسماتی منظر پیش کرتا ہے۔ نہروں کے کنارے پائی جانے والی جنگلی حیات میں سور، بھیڑیئے، لومڑی، گیدڑ، تیتر، بیٹر، مرغابی اور نہروں میں مختلف اقسام کی میٹھے پانی کی مچھلیاں قابل ذکر ہیں۔ نباتات میں کیکر (ببول) شیشم، جنگلی بیری سرکنڈ اور بیشمار جڑی بوٹیاں شامل

ہیں۔

اکثر نہروں پر پل بنائے گئے ہیں لیکن یہ بستیوں کی تعداد کے لحاظ سے کم ہیں۔اس لیے کئی مقامات جنہیں مقامی زبان میں پتن کہا جاتا ہے کے ذریعے لوگ کشتی یا بیڑی کے ذریعے نہر پار کرتے ہیں۔نہر کے دونوں کناروں پر ایک مضبوط کیبل درختوں کے تنوں سے باندھ دی جاتی ہے اور ملاح اس کو پکڑ کر کشتی ایک سے دوسرے کنارے پر لے جاتا ہے۔شادی بیاہ، میلے ٹھیلے اور دیگر تقریبات کے سلسلے میں گاؤں کے لوگ اس کشتی کو بکثرت استعمال کرتے ہیں اور یوں یہ ان کی دیہی تہذیب کا ایک نمونہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ بیڑی پتن ایک رومانوی اہمیت بھی رکھتے ہیں جس کا اظہار لوک گیتوں کے ذریعے ہوتا ہے۔

نہروں سے ایک جذباتی تعلق نہ صرف پنجاب بلکہ دنیا کی بیشتر قدیم تہذیبوں میں پایا جاتا ہے۔معروف مرثیہ ''اے ودائے نہر علقمہ'' کس نے نہیں سنا ہوگا۔اقبال کی خاتون عجم، قراۃ العین طاہر کی ایک غزل تو جناب علامہ نے قراۃ العین طاہر کے عنوان سے اپنے خوش نما خط میں نقل کی ہے جس کا ایک شعر موضوع کی مناسبت سے پیش نظر ہے۔

تیرے فراق میں خون دل دریاؤں چشموں اور نہروں میں بہتا جا رہا ہے۔

تقسیم ہند کے پر آشوب دور میں نہریں معصوم لاشوں کے خون سے رنگ گئی تھیں۔اس اتھاہ دکھ کا احساس پنجاب کی شاعرہ امرتا پریتم کے اس لازوال ادبی حوالے سے ہوتا ہے۔

اج آکھاں وارث شاہ نوں کتے قبراں وچوں بول
تے اج کتاب عشق دا کوئی اگلا ورقہ پھول
اک روئی سی دھی پنجاب دی تو لکھ لکھ مارے دِن

دل میں آتی ہے کہ وارث شاہ کو کہوں کہ کہیں قبروں میں سے مخاطب ہو اور کتاب عشق کا کوئی ورق کھول پنجاب کی ایک بٹی روئی تو تم نے لاکھ لاکھ بین کیے آج لاکھوں بیٹیاں روئی ہیں اور چناب خون سے بھر گیا تو پھر تم خاموش کیوں ہو۔

ساحلی تفریح گاہوں کی طرح نہروں کے منبع بھی تفریح کا درجہ رکھتے ہیں۔لوگ بہتی نہروں کے سرسبز کناروں پر بیٹھے پانی کی تازہ مچھلی پکڑنے پکانے اور کھانے کا مزہ لیتے ہیں۔موسم گرما میں

جب گرمی کی شدت میں نا قابل برداشت اضافہ ہو جاتا ہے تو لوگ نہروں میں تیراکی کا شغل اختیار کرتے ہیں۔ پاکستانی نہروں میں دیہاتیوں کی تیراکی کا انداز دنیا بھر کے مروجہ و مسلمہ قوانین سے بے نیاز اور غیر تربیت یافتہ اچھل کود سے زیادہ مماثلت رکھتا ہے۔ سخت گرمیوں میں نہروں میں بہتا ٹھنڈا پانی کسی نعمت سے کم نہیں۔

روز بروز بڑھتی ہوئی ماحولیاتی آلودگی نے نہروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اس کی وجہ سے مچھلیاں اور دیگر آبی حیات بری طرح متاثر ہوئی ہیں۔

ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی نہروں کو مزید آلودہ ہونے سے بچائیں تا کہ ہماری آئندہ نسلیں بھی اس قومی ورثہ سے مستفید ہوتی رہیں۔ لاہور کے بیچوں بیچ بہنے والی نہر کے کنارے نواب آف کالا باغ نے بہت سے درخت لگوائے تھے۔ جن کے ساتھ کئی کھیت کھلیان پائے جاتے ہیں لیکن گزرتے وقت اور بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ کھیتوں کی جگہ آبادی نے لینا شروع کر دی اور اب نہر کے کنارے مختلف مقامات پر واٹر پارک اور دیگر تفریحی مقامات بنے نظر آتے ہیں۔

نہر کے کنارے جو سڑک ہے اس کا نام علامہ اقبال اور رومی کے حوالے سے پہچانی جانے والی معروف جرمنی عالمہ این میری شمل روڈ رکھا گیا ہے جس پر اکثر لوگ موسم کا لطف اٹھانے کے لیے لونگ ڈرائیور پر جاتے ہیں۔ موسم بہار میں کسی کو پھولوں کا جوبن دیکھنا ہو تو یہاں دیکھیے۔

روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور، سنڈے میگزین ایڈیشن 2008ء

○

پاکستان کے اہم آبی مقامات

ایسا مقام جس نے ماحولیاتی نظام میں پانی کو خشکی پر فوقیت حاصل ہو آبی مقام کہلاتا ہے ان مقامات میں جھلیں، نہریں، تالاب، دریا، ڈیم اور ساحلی علاقے شامل ہیں۔ پاکستان کے آبی مقامات ہمارا قومی ورثہ ہیں اور ان کو تباہی سے بچانا ہم سب کا اولین فرض یہ مقامات نہ صرف جانوروں اور پودوں کو قدرتی ماحول فراہم کرتے ہیں بلکہ ہماری معیشت میں بھی ان کی حیثیت ایک ستون کی سی ہے۔ آبی مقامات کے فوائد مندرجہ ذیل ہیں۔

- یہ مقامات جانوروں اور درختوں کو موافق قدرتی ماحول فراہم کرتے ہیں۔
- ان سے حاصل شدہ لکڑی ایندھن کے طور پر اور تعمیراتی مقاصد کے لیے استعمال ہوتی ہے۔
- یہ مقامات ہماری غذائی ضروریات کو پورا کرنے کا بھی ایک ذریعہ ہیں ان سے حاصل ہونے والی غذا میں مچھلی، جھینگا اور شہد وغیرہ شامل ہیں۔
- یہاں پائے جانے والے کچھ پودوں سے ادویات بھی تیار کی جاتی ہیں۔
- ان مقامات سے جانوروں کو چارہ بھی میسر آتا ہے۔
- رنگ تیار کرنے اور چمڑا رنگنے کے لیے بھی ان مقامات کی پیدا شدہ اشیاء کا استعمال کیا جاتا ہے۔
- ذرائع نقل وحمل میں بھی یہ مقامات اہم کردار ادا کرتے ہیں۔
- سائنسی اور تحقیقی اعتبار سے یہ مقامات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔
- تفریح فراہم کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔
- سیلاب کا پانی جذب کر کے اس کا زور کم کر دیتے ہیں۔

شیندور جھیل چترال اور گلگت کی سرحد پر واقع اس جھیل کے پانی کا واحد منبع پہاڑوں سے پگھلنے والی برف ہے پرندوں کے نقل مکانی کے راستے پر واقع ہونے کی وجہ سے سینکڑوں پرندے

کی افزائش نسل کے خواہد سفر کے دوران جھیل پر مختصر قیام کرتے ہیں جھیل میں کئی اقسام کی مرغابیوں کی افزائش نسل کے خواہد بھی موجود ہیں۔

برت جھیل

یہ جھیل سطح سمندر سے 8000 فٹ بلند ہے نقل مکانی کرنے والے پرندے پاسو گلیشیر کے دامن میں واقع اس جھیل کو اپنے عارضی قیام کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس میں پانی کا دارو مدار پہاڑوں سے پگھلنے والی برف پر ہوتا ہے۔

وادی کرم کے آبی مقامات

وادی کرم کے آبی مقامات جن میں دریائے کرم، باداں ڈیم اور مولوگلی ڈھنڈ شامل ہیں۔ آبی پرندوں کی نقل مکانی کے راستہ پر واقع ہونے کی وجہ سے بیحد اہمیت کے حامل ہیں۔

چشمہ بیراج

اس آبی مقام کی اہمیت یہ ہے کہ یہاں نقل مکانی کر کے آنے والے دو لاکھ سے زیادہ آبی پرندے عارضی قیام کرتے ہیں۔ یہ تعداد پاکستان میں موجود کسی بھی آبی مقام پر آنے والے پرندوں کی تعداد سے زیادہ ہے دریائے سندھ پر یہ آبی مقام میانوالی شہر سے 25 کلومیٹر جنوب مغرب میں پانچ چھوٹی چھوٹی جھیلوں پر مشتمل ہے اس کی تعمیر کا اصل مقصد آبپاشی کے لیے پانی ذخیرہ کرنا، بجلی پیدا کرنا اور ماہی پروری تھا مگر اب یہ آبی پرندوں کے لیے بھی اہمیت رکھتی ہے۔

اچھالی جھیل

نوشہرہ کے مغرب میں 13 کلومیٹر پر سلسلہ کوہ نمک میں واقع اس جھیل کی سطح سمندر سے بلندی تقریباً 700 میٹر ہے۔ جھیل میں پانی کا انحصار قدرتی چشموں اور بارشوں پر ہے یہ جھیل کی گہرائی اور پرندوں کی تعداد پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ نقل مکانی کے دوران سینکڑوں آبی پرندوں کے ساتھ سفید سر والی مرغابی جو کہ ایک نایاب بطخ ہے اس جھیل کو اپنا مسکن بناتی ہے۔ جھیل میں آبی پرندوں کے شکار پر پابندی ہے۔

زنگی ناور جھیل

کھارے پانی کی یہ جھیل مختلف اطراف سے ریت کے ٹیلوں پر گھری ہوئی ہے اس میں پانی کا انحصار بارشوں پر ہے جو نہ صرف اس کی گہرائی پر اثر انداز ہوتی ہیں بلکہ اس کے کھارے یا نمکین ہونے کا دارومدار بھی انہی بارشوں پر ہوتا ہے۔ مرغابی کی ایک نایاب نسل جس کو Morbled Teal کہتے ہیں اس جھیل پر افزائش نسل کرتی ہے۔

تونسہ بیراج

دریائے سندھ میں تونسہ کے مقام پر پانی کا ذخیرہ کوٹ ادو سے 20 کلومیٹر شمال مغرب میں ہے یہاں پر آبی پودوں اور درختوں کی بہتات نے آبی پرندوں اور دوسرے جانوروں کو محفوظ ماحول فراہم کیا ہے اور کئی اقسام کے پرندے اور جانور یہاں پر افزائش نسل کرتے ہیں اس مقام کی اہمیت اندھی ڈولفن کی وجہ سے بھی بڑھ جاتی ہے جو کہ دریا کے پانی میں باآسانی دیکھی جاسکتی ہے۔

انڈس ڈولفن کا مخصوص آبی مقام

سکھر سے گدو بیراج تک دریائے سندھ کا درمیانی علاقہ اندھی ڈولفن کی آماجگاہ ہے اس نایاب نسل کو محرومی سے بچانے کے لیے مندرجہ بالا مخصوص علاقے کو قانونی تحفظ فراہم کیا گیا ہے دریا سے ملحقہ میدانی علاقے میں پانی کے مستقل کھڑے رہنے کی وجہ سے آبی پودے بھی کثرت سے پیدا ہو گئے ہیں جو کہ آبی پرندوں اور دوسرے جانوروں کو اچھا ماحول فراہم کرتے ہیں۔

ڈرگ جھیل

کھارے پانی کی اس جھیل کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ زمانہ قدیم میں دریائے سندھ کی گزرگاہ رہی ہوگی۔ اس پانی میں مون سون کی بارشوں اور قریب کے ندری نالوں میں داخل ہوتا ہے آبپاشی کے لیے پانی کا رخ موڑنے اور آبی پودوں کی بہتات سے اس کی سطح اور رقبے میں مسلسل کمی واقع ہو رہی ہے بگلوں کی کئی اقسام یہاں پر افزائش نسل میں مصروف رہتی ہے

سردیوں میں ہزاروں آبی پرندے جھیل پر دیکھے جاسکتے ہیں جھیل میں آبی پرندوں کا شکار ممنوع ہے۔

کینجھر جھیل

میٹھے پانی کی یہ بہت بڑی جھیل ٹھٹھہ شہر سے 19 کلومیٹر شمال مشرق میں ہے۔اس کو کلری جھیل بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ دو جھیلوں کلری اور کینجھر کو ملانے پر وجود میں آئی ہے۔جھیل میں پانی دریائے سندھ سے نہر کے ذریعے آتا ہے جھیل کے زیریں حصے پر ایک چھوٹا سا ڈیم بنا کر پانی کو روکا گیا ہے یہی ڈیم جھیل سے پانی کے اخراج کے کام بھی آتا ہے اس کے پانی سے کراچی اور اردگرد کی آبادی کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔موسم سرما میں ہزاروں پرندے ہجرت کر کے اس جھیل کو اپنا عارضی مسکن بناتے ہیں جھیل میں واقع چھوٹے چھوٹے جزیرے پرندوں کو افزائش نسل کے لیے بہترین ماحول فراہم کرتے ہیں۔یہاں پر آبی پرندوں کا شکار بھی ممنوع ہے۔

ہالیجی جھیل

میٹھے پانی کی ایک جھیل کے اطراف مستقل رہنے والے پانی اور اس کی خوبصورتی میں اضافہ کر دیا ہے جھیل کے چاروں اطراف بند بنا کر پانی ذخیرہ کیا گیا ہے یہ اپنے بہترین محل وقوع اور ماحول کی وجہ سے پرندوں کی جنت کہلاتی ہے اور اس کا شمار دنیا کی بہترین جھیلوں میں ہوتا ہے نقل مکانی کے موسم میں ہزاروں پرندے اس جھیل پر آتے ہیں۔یہ کئی اقسام کے آبی اور دیگر پرندوں کو ان افزائش کے لیے بہترین ماحول فراہم کرتی ہے جھیل کی اہمیت کے پیش نظر اس پر ہر قسم کے شکار پر پابندی ہے۔

○

پاکستان کی مشہور بندرگاہیں

سون میانی

یہ بندرگاہ ضلع لس بیلہ کے ساحل پر واقع ہے جو کراچی سے بذریعہ خشکی 45 میل کے فاصلے پر ہے انگریزوں سے پہلے پورے وسط ایشیاء میں اس کا شہرہ تھا۔ یہاں سے بڑی بڑی بادبانی کشتیاں جن کو بلوچی میں ''بوجھی'' کہتے ہیں ہندوستان، عرب، افریقہ اور خلیج فارس کی بندرگاہوں تک جاتی آتی تھیں۔ راجہ داہر کے خلاف کارروائی کے لیے عربوں نے اسی بندرگاہ پر اپنا لشکر اتارا تھا۔ اینسویں صدی کے آغاز تک بلخ و بخارا افغانستان وایران کا تجارتی مال کارواں کے ذریعے اس بندرگاہ میں آتا اور یہاں سے ترکمان اور بلوچی گھوڑے برد باری اور اونٹ بھی سونمیانی سے باہر بھیجے جاتے۔ اُندنوں، بولان، اور مولہ کے راستے غیر محفوظ خیال کیے جاتے تھے۔

1805ء میں پرتگالی بحری قزاقوں نے یہ بندرگاہ لوٹ کر اسے آگ لگادی۔ گل جنید نے جو کلمتی ہوت بلوچوں کا سردار اور ماہر جہاز ران تھا ان بحری قزاقوں سے یہاں کئی لڑائیاں لڑی۔ برطانوی تسلط کے بعد اس بندرگاہ کی اہمیت ختم ہوگئی۔ انگریزوں نے کراچی کی بندرگاہ کو جدید بنیادوں پر ترقی دی اور ریل کے ذریعے اسے اندرون ملک بڑے بڑے شہروں سے ملا دیا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی سرحدوں کا تعین ہوا جس سے کارواں کی آمدورفت رک گئی جس کے نتیجے میں بندرگاہ آہستہ آہستہ اُجڑ گئی آج کل سونمیانی ماہی گیری کے لیے مشہور ہے یہاں سے بڑی مقدار میں خشک مچھلی دساور کو بھیجی جاتی ہے۔ یہاں بڑے بحری جہاز لنگر انداز نہیں ہو سکتے کیونکہ ساحل کے نزدیک پانی کی گہرائی کم ہے۔

اور ماڑا

یہ بندرگاہ پہلے ریاست لسبیلہ میں شامل رہی ہے مگر آج کل مکران ڈویژن کا حصہ ہے۔ 1938ء تک برٹش انڈیا سٹیم نیویگیشن کمپنی کے جہاز ہر پندرھواڑے یہاں ساحل سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر لنگر انداز ہوتے تھے بیرون ممالک خصوصاً سری لنکا اور جاپان سے تجارتی سامان آتا اور یہاں سے زیادہ تر خشک مچھلی اور پیش کی چٹائیاں دساور کو جاتیں مگر اب وہ صورتحال باقی نہیں رہی۔

پسنی بندر

یہ بندرگاہ کراچی سے براستہ خشکی دو سو میل کے فاصلے پر ہے پہلے یہ ماہی گیروں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی لیکن 1931ء میں خان قلات میر محمود خان دوم کی وفات کے بعد ان کے جانشین میر احمد یار خان کو اپنے اختیارات کا علم ہوا تو انہوں نے بیرون ممالک کے ساتھ تجارتی تعلقات کا آغاز کیا۔ اس مقصد کے لیے پسنی کی بندرگاہ قلات کی دوسری بندرگاہوں کے مقابلے میں زیادہ کارآمد ثابت ہوئی چنانچہ سندھ اور بلوچستان کے تاجروں جن میں اکثریت ہندوؤں کی تھی یہاں سے تجارتی مال درآمد برآمد کرنے کی طرف توجہ دی اور دیکھتے ہی دیکھتے ماہی گیروں کی یہ چھوٹی سی گمنام بستی وسط ایشیا میں شہرت حاصل کر گئی جاپان سے ریشمی سوتی اور اونی کپڑے، اٹلی سے کمبل، قالین اور اوڑھنیاں وغیرہ اور کیوبا سے چینی بڑی مقدار میں درآمد ہونے لگی اور یہاں سے خشک مچھلی اور پیش کی چٹائیاں وغیرہ ہندوستان کی بندرگاہ اور کولمبو کو برآمد کی جانے لگی۔ اس درآمد و برآمد سے ریاست قلات کی آمدنی میں چار پانچ لاکھ روپے سالانہ کا اضافہ ہو گیا۔ اس کے علاوہ پسنی سے درآمد شدہ مال مکران، ساراوان جھالاوان اور کچھی کے علاقوں میں راھداری اور سنگ بھی وصول کیا جانے لگا جس کی مجموعی آمدنی پندرہ بیس لاکھ روپے سالانہ سے کم نہ تھی۔ ان دنوں 1939ء میں پسنی کی آبادی دس ہزار نفوس پر مشتمل تھی جن میں اکثریت ''میلا'' شاہی بلوچوں کی تھی۔ 1898ء میں مکران کی بغاوت فرو کرنے کے لیے انگریزی فوج کرنل مین کے زیر کمان اس بندرگاہ میں اتری تھی۔ یہ فوج ذحانی جہاز میں کراچی سے روانہ ہو کر پسنی پہنچی اور پھر یہاں سے کوچ کر کے 30 جنوری 1898ء کو کپروش کے مقام پر بلوچ مجاہدوں سے جا ٹکرائی اس لڑائی میں میر

بلوچ خان نوشیروانی اور کئی دوسرے نامی گرامی بلوچ شہید ہوئے۔ 1942ء میں پسنی میں ایک شدید زلزلہ آیا۔ سمندری موجوں نے تمام شہر تہہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ سینکڑوں افراد لقمہ اجل بن گئے۔ قیام پاکستان کے بعد ون یونٹ قائم ہوا تو پسنی بھی دوسری بندرگاہوں کی طرح مرکزی حکومت کی تحویل میں چلی گئی۔

جیونی بندر

یہ بندرگاہ خلیج گوادر کے دائیں کنارے واقع ہے دشت ندی یہاں سمندر میں گرتی ہے اس کے بیس میل شمال مغرب سے ایرانی بلوچستان کی سرحد شروع ہوتی ہے جیونی، بلوچستان کی موزوں ترین بندرگاہ ہے اس بندرگاہ پر چودھویں صدی عیسوی تک جدگالوں کا قبضہ رہا ہے اس کے شمال مغرب میں ایرانی بلوچستان کا علاقہ دشتواری ہے جہاں جدگال قبائل آباد ہیں۔ سردار جیون خان جدگال کا صدر مقام ہونے کی مناسبت سے ان کا نام جیونی پڑ گیا۔

کلمت بندر

پسنی اور اورماڑا کے درمیان یہ بندرگاہ یعنی خلیج کے سرے پر واقع ہے اور ماکولہ کی شمالی پہاڑیوں کے ذریعے طوفانی ہواؤں سے محفوظ ہے بڑے بڑے جہاز یہاں لنگر انداز نہیں ہو سکتے لیکن ماہی گیر کشتیوں کے لیے ساحل بلوچستان پر یہ محفوظ ترین ٹھکانہ ہے۔ شکار کے خاص موسم، آڑنگا میں کراچی اور خلیج فارس کی دوسری بندرگاہوں سے ماہی گیر یہاں آ کر کھر ماہی یعنی کاڈ کا شکار کرتے ہیں۔ کلمت بندر کے مغرب میں گزدان کی مشہور چراگاہ ہے جہاں ایک خاص قسم کی گھاس بکثرت اُگتی ہے اور مقامی آڑنگا کے دنوں میں خشکی سے آنے والی شمالی ہوائیں اس گھاس کا بیج سمندر میں پھیلا دیتی ہیں جو کچھ مچھلیوں کی من بھاتی خوراک ہے یہی وجہ ہے کہ یہ مچھلیاں غول در غول سمندر کے اس حصے میں آ پہنچتی ہیں اور انہیں شکار کرنے کے لیے ماہی گیروں کے جتھے ادھر اُمنڈ آتے ہیں۔ ان دنوں کلمت ہوا ایک عجیب نظارہ پیش کرتی ہے ساحل سے بیس میل تک شکاری کشتیوں کے بیڑے سفید بادبان اڑاتے، شکار کی تلاش میں گھومتے رہتے ہیں۔ کبھی ایسا دن بھی آتا ہے کہ دس دس اور بیس بیس مچھلیاں ہاتھ لگتی ہیں جن دنوں یہاں خان قلات کا سکہ چلتا تھا۔ آڑنگا میں لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی آمدنی ریاست کو ہوتی تھی۔ حالانکہ حکومت شکار کا دسواں

حصہ یعنی عشر وصول کرتی تھی۔ اور قیمت بمشکل ایک روپیہ فی مچھلی تھی۔ کلمت کی بندرگاہ تاریخی حیثیت بھی رکھتی ہے ہندوستان واپسی پر سکندر اعظم یہیں سے گذرا تھا۔ اس زمانے میں یہاں بلوچوں کا بہادر قبیلہ ہوت آباد تھا ہوت آج کل بھی یہاں بستے ہیں لیکن اب وہ کلمتی کہلاتے ہیں اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں جب خلیج فارس پرتگالی بحری قزاقوں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی میر حمل نے کلمت بندر کو مرکز بنا کر اس دلیری سے فرنگی بحری قزاقوں کا مقابلہ کیا کہ انہیں مجبور ہو کر اس سے معاہدہ صلح کرنا پڑا۔ کچھ عرصے بعد میر حمل کو سمندر میں اکیلے دیکھ کر پرتگالیوں نے اس کی کشتی گھیری اور دو بدو لڑائی کے بعد اسے گرفتار کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا یہ میر حمل جنید کی قربانیوں کا نتیجہ ہے کہ فرنگی قزاق بلوچستان کے ساحل پر اپنی کوئی نو آبادی قائم نہ کر سکے۔

پاکستان کی بندرگاہیں۔ معلومات پاکستان نمبر، سیارہ ڈائجسٹ

سُر بندر

بلوچستان کی جنوبی پٹی پر ساحل مکران، بحیرہ عرب کے ساتھ 754 کلومیٹر تک پھیلا ہوا ہے گو ساحلی آبادیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ منسلک کرنے کے لیے کوئی پختہ سڑک موجود نہیں لیکن روزانہ کی پروازوں کی بدولت ان دیہاتوں اور ڈیروں کا آپس میں رابطہ قائم رہتا ہے بحیرۂ عرب کا نیلگوں پانی جب گوادر، پسنی، اور اراماوا کے چمکتے ریتلے ساحلوں سے ٹکراتا ہے تو یہ منظر بے حد خوبصورت ہوتا ہے اس ساحلی پٹی پر الگ تھلگ ساحلی علاقے میلوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ علاقے اپنی خوبصورتی اور قدیم روایات کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ جب کوئی سیاح ان علاقوں میں آنکلتا ہے تو وہ ورطہ حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔ آوارہ پھرتے ہوئے اونٹ کھجور کے درختوں کے خوبصورت جھنڈ، چھوٹی چھوٹی ندیاں اور ٹھنڈی گدگداتی اور آلودگی سے پاک ہوائیوں محسوس ہوتا ہے کہ انسان صدیوں پہلے کی کسی الف لیلوی داستان کا حصہ ہے اس علاقے کو قدرت کے کئی قسم کے امتزاج کی سرزمین کہا جا سکتا ہے۔ اس علاقے میں صحرا اور بنجر پہاڑ بھی ہیں اور ندی نالے بھی، یہاں کے لوگ بے حد جفاکش اور محنتی ہیں۔ یہاں ان کی قدیم تہذیبی روایات بے حد مشہور ہیں گوادر کی پراسرار پہاڑیوں سے پرے کھجور کے درختوں کے جھرمٹ میں گھرا گرم چشموں کے قریب ایک غیر معمولی اور انوکھا قصبہ سر بندر ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ گوادر کی سڑک پندرہ میل دور رہ جاتی ہے اور قصبے تک پہنچنے کے لیے بلند و بالا پہاڑیوں کے پر پیچ اور خم کھانے والے

راستے سے آنا پڑتا ہے جو بے حد شکستہ اور خراب ہے جیپ بے حد آہستگی سے یہ خطرناک راستہ طے کرتی ہے۔ راستے میں جگہ جگہ بکریوں اور بھیڑوں کے ریوڑوں کو راستہ دینے کے لیے بار بار روکنا پڑتا ہے۔ اس راستے میں کھجور کے درختوں کے ساتھ ساتھ اونٹ بے حد خوبصورت منظر پیش کر رہے ہیں۔ انسان وہاں پہنچ کر حیرت کی تصویر بن جاتا ہے۔ راستے میں رہنمائی کے لیے کچھ زیادہ نشانات موجود نہیں۔ لیکن مقامی لوگ اس شکستہ راستے کے اسرار ورموز سے بڑی اچھی طرح واقف ہیں وہ بڑی تیزی کے ساتھ اس پر سفر طے کرتے ہیں قصبے تک پہنچتے پہنچتے انسان گردوغبار کے سمندر سے ہو کر گزرتا ہے سڑک کا اختتام اچانک قصبے کے وسط میں ہوتا ہے یہ قصبہ مچھلیوں کی تجارت کے حوالے سے اچھی خاصی شہرت کا حامل ہے یہاں سے اردگرد کے علاقوں اور کراچی تک مچھلیاں سپلائی کی جاتی ہیں۔

سر بندر کے وسط میں ایک بے حد خوبصورت مسجد ہے مچھلیوں کو پکڑنے کے بعد اس کو کولڈ سٹوریج میں رکھا جاتا ہے زیادہ تر مچھلیوں کو اگلے روز سر بندر سے منتقل کر دیا جاتا ہے لیکن جھینگا مچھلی کو فوری طور پر بذریعہ ہوائی جہاز کراچی پہنچایا جاتا ہے دن کے اختتام پر خواتین، مردوں کے ساتھ کشتیوں کی صفائی کے بعد جب واپس ہوتی ہیں تو یہ بھی بڑا دلچسپ منظر ہوتا ہے یہاں خواتین مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں۔ شام کے سائے گہرے ہوتے ہی قصبے کا اکلوتا جنریٹر جاگ اٹھتا ہے اور قصبہ روشن ہو جاتا ہے لیکن جلد ہی یہ جنریٹر دم توڑ دیتا ہے اور سارا قصبہ اندھیرے کی چادر اوڑھ کر خاموش اور پرسکون ہو جاتا ہے کبھی کبھار ہوا کے دوش پر کہیں دور سے آتی ہوئی کسی مچھیرے کے گیت کی مدھر آواز ساحلی ریت سے ٹکراتی شوریدہ سمندری لہروں کے شور کے ساتھ مل کر لمحہ بھر کے لیے فضاء میں ہلکا ارتعاش پیدا کر دیتی ہیں وگرنہ زیادہ تر خاموشی اور گہرا سکوت طاری رہتا ہے لیکن محوخواب ہیں کل ایک اور نیا دن طلوع ہوگا۔

ہفت روزہ ''ندائے ملت'' لاہور

○

سبی میلہ

یہ تاریخی میلہ ایک طویل عرصہ سے اس شہر میں منعقد ہو رہا ہے شہر بی درہ بولان کے دھانے پر واقع ایک قدیم شہر ہے زمانہ قدیم میں یہ شہر برصغیر پاک و ہند میں داخلے کے لیے افغانیوں اور ایرانیوں کی گذرگاہ کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔ انگریز دور حکومت میں یہ شہر افغانستان جانے کے لیے بھی استعمال ہوا۔ کچھ تاریخ دانوں کے مطابق اس خطہ میں اسلام سے پہلے یہ شہر قلات کے ساتھ ملحق تھا اور ہندو آبادی اسے ''سیواس'' کے نام سے پکارتی تھی۔ یہاں مشہور ہندو راجا سہرا رائے کی حکومت تھی اس کا دارالحکومت اسور شہر تھا یہ شہر موجود بھکر کے نزدیک تھا بعد ازاں مسلمانوں کے ساتھ مکران کے مقام پر جنگ میں یہ راجہ مارا گیا اور یہ حکومت مشہور راجہ داھر کے باپ کے ہاتھ میں چلی گئی محمد بن قاسم کے زمانے میں بی مسلمانوں کے دائرہ حکومت میں شامل تھا۔ اس کے بعد اس شہر نے کئی دور حکومت دیکھے اور پھر 1739ء میں یہ برصغیر کے مغربی صوبوں کے ساتھ منسلک ہو گیا۔ خان آف قلات میر محبت خان کے دور حکومت میں شہر قلات میں شامل ہوا ان کے والد میر عبداللہ خان سندھ حکمران نور محمد کلہوڑہ کے ساتھ ایک طویل لڑائی کے نتیجے میں مارے گئے تھے۔

کچھ تاریخ دانوں کی تحقیق کے مطابق بی شہر کا نام ایک ہندو شہزادی سیوا رانی کے نام پر رکھا گیا۔ لیکن تاریخ میں اس کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملتا اس شہر کے مقامی لوگ اب تک اس شہر کو سیوا کے نام سے ہی پکارتے ہیں۔ اس علاقے کے لیے خان آف قلات اور اس کی بہن شہزادی بہنجا نے سترہ حملوں کا مقابلہ کیا۔ شہزادی اس شہر کے محاصرے کے دوران ہی وفات پا گئی۔ 1834ء میں انگریزوں نے اس علاقے کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے پہلی افغان جنگ میں اسے مرکز کے طور پر استعمال کیا۔

یہ تو ہوا اس شہر کا ایک مختصر سا تعارف، اب ذرا اس شہر کے مشہور بی میلے کے تاریخی پس منظر

کو بیان کریں اس میلے کے بارے میں بھی تاریخ دان مختلف الرائے ہیں کہ یہ کب اور کیسے شروع ہوا۔ اشیاء کے بدلے اشیاء کے اصول پر اس میلے میں تجارت کی جاتی تھی۔ یہ شہر ایران، افغانستان، ترکی اور وسطی ایشیاء کے ممالک کے تاجر حضرات کے لیے ایک بہت بڑا مرکز تھا یہ تاجر اس شہر میں اپنا مال لے کر اکٹھے ہوتے اور اشیاء کا باہمی تبادلہ کر لیتے۔ کچھ کے خیال کے مطابق یہ میلہ بلوچستان کے عظیم ہیرو میر چاکر خان رند کے دور حکومت میں شروع ہوا۔ جو اکثر اس ماہ میں قبائل کو اکٹھا کرتے تھے تاکہ آپس کے تنازعات طے پا سکیں۔ ضلعی گزٹ کے مطابق 1885ء میں یہاں پہلا افغان گھوڑوں کی فروخت کا میلہ منعقد ہوا۔ میر چاکر خان رند نے سبی کو اپنا دارالحکومت بنایا اور یہاں ہر سال قبائلی سرداروں اور دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے ماہرین اور قابل تعریف افراد کو اکٹھا کیا جانے لگا۔ ان سربراہان کے ہمراہ بہت سے ملازمین اور کاروباری افراد آتے جو اپنی وقت گزاری کے لیے کچھ نہ کچھ شغل کرتے رہتے ان اوقات میں مقامی لوگوں کے علاوہ پنجاب اور سندھ کے تاجر حضرات بھی اپنے مویشیوں کے ہمراہ میلے میں شرکت کرنے لگے۔ آہستہ آہستہ یہ میلہ میلہ اسپاں و مویشیاں کی صورت اختیار کر گیا۔

انگریزوں کے دور میں سبی حکومت کا سرمائی دارالحکومت بن گیا۔ انہوں نے علاقے میں اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کے لیے اس میلے کو استعمال کیا اور اس میلے کے شرکاء اور معززین کو نقد رقوم اور اعزازت سے بھی نوازا جانے لگا۔ علاقے کے سرداروں کے لیے لازم کر دیا گیا کہ وہ اپنی بگھی کو میلے میں خود کھینچیں اکثر نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس فیصلے کو قبول کیا لیکن چند سرداروں نے اسے بے عزتی قرار دیا اور انکار کر دیا۔ گورنر جنرل کا علاقائی ایجنٹ ایک سالانہ شاہی جرگہ بلاتا اور ان قبائلی سرداروں کو اعزازی تلواریں، سرٹیفکیٹ اور انعامات دیئے جانے لگے جو برطانوی حکومت کے لیے خدمات سرانجام دیتے۔ پاکستان بننے کے بعد بھی یہ سلسلہ بدستور جاری رہا شاہی جرگے کا نام بدل کر سبی دربار رکھ دیا گیا۔ قائداعظم محمد علی جناح پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کے طور اس دربار میں شریک ہوئے اور اپنے ہاتھوں سے اعزازت اور انعامات تقسیم کیے۔

ون یونٹ کے دور میں سبی دربار ڈویژنل میلے کی صورت اختیار کر گیا اور مغربی پاکستان کے گورنر اس کے مہمان خصوصی ہوئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ میلہ نئی نئی جہتیں اختیار کرتا رہا اور زرعی صنعتی اشیاء بھی میلے میں شامل ہونے لگیں۔ پاکستان کے سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اس میلے میں ایک نئی زرعی سکیم جاری کی اور اس سکیم کے تحت ایک ٹریکٹر اور دیگر نقد انعامات ایسے

کسانوں میں تقسیم کیے جاتے کہ جنہوں نے زرعی پیداوار میں اضافے کے لیے کوئی کارنامہ سر انجام دیا ہو۔ علاوہ ازیں مرغوں کی لڑائی کتوں کی لڑائی، دوڑ، اونٹوں اور گھوڑوں کا ناچ اور نیزہ بازی جیسے مقابلے بھی عوام دلچسپی کے لیے اس میلے میں شامل کر دیئے گئے۔ بعد کی آنے والی حکومتوں نے اس میلے میں حکومتی اور نیم حکومتی اداروں کو بھی شامل کر لیا اور یہ ادارے اپنی سالانہ کارکردگی پیش کرتے۔ بلدیاتی اداروں کا کنونشن بھی منعقد کیا جانے لگا۔ اس کے علاوہ ثقافتی ناچ، ڈرامہ، موسیقی، محفل مشاعرہ، علاقائی کھیل اور دیگر ورائٹی پروگرام بھی اس میلے میں شامل کر دیئے گئے اور اب تو صوبوں کے محکمۂ ہائے اطلاعات بھی اس میلے میں اپنے اپنے صوبوں کی ترقیاتی سرگرمیاں فلمی شکل میں پیش کرنے لگے ہیں۔

اس شاندار موقع پر میلہ اسپاں و مویشیاں کا بھی انعقاد کیا جاتا ہے جس مین ہزاروں کی تعداد میں اعلیٰ نسل کے مویشیوں کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ میلے میں اعلیٰ نسل کی گاؤں، بیلوں، بھیڑوں اور گھوڑوں کی پریڈ کی جاتی ہے اور انہیں انعامات بھی دیئے جاتے ہیں۔ اس طرح بی میلہ مویشیوں کا خرید وفروخت کے لیے ایک بڑی مارکیٹ کی صورت اختیار کر گیا ہے اس شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد کی تجارت کے ساتھ ساتھ حوصلہ افزائی بھی ہو جاتی ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ اس طرح کے میلے اور نمائشیں ملک کے تمام بڑے بڑے شہروں میں حکومتی سرپرستی میں منعقد کی جائیں۔ یہ میلے نہ صرف صوبوں کے درمیان تجارت میں اضافے کے سبب بنیں گے بلکہ ملک کے تمام علاقوں کے افراد میں محبت و اخوت کے جذبات بیدار کرنے میں بھی مددگار ثابت ہوں گے۔

OOO